جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح حیات

یادوں کی برات کا قلمی نسخہ

اس کے گمشدہ و غیر مطبوعہ اوراق

ایک تحقیقی دریافت

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر ہلال نقوی

Josh Literary Society, Calgary Canada

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح حیات

یادوں کی برات کا قلمی نسخہ

اور

اُس کے گمشدہ وغیر مطبوعہ اوراق

ایک تحقیقی دریافت

تحقیق و تدوین

ڈاکٹر ہلال نقوی

Josh Literary Society, Calgary Canada

پہلا ایڈیشن

اپریل ۲۰۱۳ء

جملہ حقوق	بہ حق اقبال حیدر محفوظ ہیں
کمپوزنگ	ادارہ سخن ور، پاکستان
قیمت	ایک ہزار روپے / 20 امریکی ڈالر

رابطہ

اقبال حیدر

E-mail: iqbalhaiderra @ Yahoo.ca

Phone:001-403-2410834 / 001-403-2880342

رابطہ

ڈاکٹر ہلال نقوی

E-mail: alfazfoundation.dhn@ gmail.com

Phone:021-34430588 Cel: 0346-2731947

انتساب

جوش ملیح آبادی کی ـــــ مرحومہ بیگم
اشرف جہاں بیگم
کے نام

جن کے بارے میں
جوش صاحب نے یادوں کی برات کے
قلمی نسخے میں لکھا ہے:

'ـــــ میری یہ کتاب یادوں کی برات بھی اُنہی کی مساعیِ پیہم کا نتیجہ ہے اگر وہ مسلسل ٹھیلتی نہ رہتیں تو یہ کتاب قیامت تک نہ لکھی جاتی ـــــ'

(قلمی نسخہ، ص: ۱۳۵۷)

اظہارِ ذات ___ ڈاکٹر ہلال نقوی

ولادت: ۱۸ر فروری ۱۹۵۰ء، راولپنڈی، پنجاب

نام: سید ہلال رضا نقوی

آبائی تعلق: امروہہ، اتر پردیش

والدین: سید مزمل حسین نقوی رسیدہ مناظرہ خاتون

ابتدائی تعلیم: مسلم اسکول راولپنڈی

انٹرمیڈیٹ رگریجویشن سراج الدولہ کالج کراچی

ایم اے: اردو ادب، ۱۹۷۳ء کراچی یونیورسٹی

پی ایچ ڈی: اردو ادب، ۱۹۸۵ء کراچی یونیورسٹی

اساتذہ: جوش ملیح آبادی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، نسیم امروہوی

پیشہ: درس وتدریس

آخری سرکاری ملازمت صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج، گلستان جوہر کراچی

موجودہ وابستگی: وزیٹنگ فیکلٹی پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی

شادی: ۵ر مئی ۱۹۷۹ء

شریکِ حیات سیدہ نسرین رضوی (ایم اے، اردو ادب)

اولاد: بیٹا، علی دانیال (پی ایچ ڈی اسٹوڈنٹ، ڈیل ہاوزی یونیورسٹی، ہیلی فیکس، کینیڈا)
بیٹی، علیزہ ابتول (ٹیچر، وزیٹنگ فیکلٹی، انگلش ڈیپارٹمنٹ، کراچی یونیورسٹی)

تصنیفات وتالیفات: جوش ملیح آبادی کی نادر وغیر مطبوعہ تحریریں، اوراقِ جوش، جمیل مظہری کی مثنوی آب وسراب، جوش ملیح آبادی شخصیت وفن، جمیل مظہری کے مرثیے، جوش کے انقلابی مرثیے، بیسویں صدی اور جدید مرثیہ (مقالہ)، مرثیے کی نایاب آوازیں نسیم امروہوی کے مرثیے، جدید بیاضِ مرثیہ، دفترِ دبیر، عرفانیاتِ جوش اور دیگر

زیرِ ترتیب: کلیاتِ جوش، جوش کے تعزیت نامے، جوش کے انٹرویوز، مقالاتِ نسیم، پروفیسر احتشام حسین اور اردو مرثیہ، جوش ملیح آبادی کی تنقیدی تحریریں، پروفیسر مجتبیٰ حسین کی تحریریں، جوش ملیح آبادی ایک اجمالی مطالعہ، وہ غریب جوش تو مر گیا،

رثائی شاعری: ھَل من، ھَل، اذانِ ھَل، پسِ تاریخ

شعری مجموعہ: انگاروں کے ہاتھ (نظمیں)، زیرِ ترتیب

ایڈیٹر: ۱___ جوش شناسی ۲___ رثائی ادب

ادبی سفر: لندن، ٹورنٹو، اوسلو، کویت، جدہ، لکھنؤ، دہلی، امروہہ، دوہا

مقدمے سے پہلے

پوری انسانی تاریخ چھان لیجئے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ غیر معمولی شخصیات کی ایک شناخت یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ وہ عموماً متنازعہ فیہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں جوش ملیح آبادی بھی ایک ایسی ہی غیر معمولی شخصیت کے حامل رہے ہیں جن کے طرزِ حیات، افکار و نظریات اور ان کی صاف گوئی نے ان کے خلاف بے رحم محاذ کھول دیے۔ ہمارے ریاکار معاشرے نے جو مصنوعی قدریں تراش لی ہیں ان میں پروان چڑھے ہوئے لوگ کھری اور عریاں صداقت، سننے کے لیے قطعی تیار نہیں۔ ایک طبقۂ خیال اس بات پر شدید معترض ہے کہ یادوں کی برات میں کئی جگہوں پر خصوصاً معاشقوں کے بیان میں جوش صاحب نے اخلاقیات کی ساری حدیں پار کر لی ہیں، اسی نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج بھی کسی لائبریری سے آپ یادوں کی برات لے کر دیکھ لیجئے، ورق اُلٹنے والی انگلیوں کے سب سے زیادہ نشانات انھی صفحات پر ہیں جن پر جوش صاحب کی 'برہنہ گفتاری' نے یہ روداد بیان کی ہے!

یعنی ____ ہم ایک دوغلے، ریاکار اور پُر فریب معاشرے میں رہتے ہیں ____ باتیں ہماری بڑی ایمان افروز اور پاکبازی کا مظہر ہوتی ہیں لیکن اندر کی گڑبڑ کی کسی کو اطلاع نہیں ____ سامنے کچھ، پیچھے کچھ ____ میں ایسے کئی شاعروں کو جانتا ہوں جن کے قومی گیتوں کی تو بڑی شہرت ہے لیکن ان میں سے کئی ایسے لکھنے والے بھی ہیں جو اپنی آمدنی سے وطن کے لیے ایک پیسے کا ٹیکس ادا نہیں کرتے ____ ان کی زندگی کی روداد پڑھیے تو یہ بظاہر انتہائی صاف ستھرے لوگ نظر آتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے صحیح کہا کہ ہمارے خاکہ نگار جب کسی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں تو پہلے تو اسے لانڈری میں بھیج دیتے ہیں پھر اس دھلی دھلائی شخصیت پر استری کر کے اسے مزید سنوار دیتے ہیں ____ یہ سب کیا ہے؟ ____ اور کیوں ہے؟

ہمارے سامنے ایسی کئی خودنوشت سوانح عمریاں نہیں ہیں جن کے لکھنے والوں کے کردار کاغذ پر کچھ ہیں اور ہماری نظروں کے سامنے اُن کا حلیہ دوسرا ہے ____ جوش صاحب کو اس ظاہر پرست، خوشامد پسند اور کرپٹ معاشرے میں رہنے کا ہنر ہی نہیں آیا ____ اُن کے ہم عصر اور بعض ان کے جونیئر شاعروں اور ادیبوں میں ایسے کتنے ہی مصلحت پسند، لوگوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھیں حکومتوں نے ایوارڈوں سے اکثر نوازا

اور پھر انہی کے نام کی تختیاں بھی چمکتی رہیں۔ ہم اور آپ ایسے کتنے ہی تھرڈ کلاس ادیبوں اور شاعروں کو جانتے ہیں جن کے نام پر سڑکوں کے نام رکھے گئے ہیں۔ ابھی کوئی دو برس پہلے سندھ حکومت نے کراچی میں فیڈرل بی ایریا کی اس گمنام، بے نام اور انجانی سڑک کو جوش ملیح آبادی کے نام سے منسوب کر دیا جس پر وہ صبح کے وقت چہل قدمی کیا کرتے تھے ___ برطانوی دورِ اقتدار اور انگریزوں کی محکومی سے نجات دلانے کے سفر میں کھیتوں کھلیانوں، گلی کوچوں اور سڑکوں سڑکوں جس کی انقلابی نظموں کی گونج نے بھی اپنا حق ادا کیا، اس سے ایک چھوٹی سی سڑک منسوب کر کے جوش صاحب کی روح پر اتنے بڑے احسان کی کیا ضرورت تھی!

ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں نے جوش صاحب کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ علی سردار جعفری نے اعتراف کیا ہے کہ جوش صاحب کو دانستہ نظر انداز کیا گیا، ادھر مصطفےٰ زیدی نے بھی بالکل سچ کہا کہ 'میرے ملک کے معاشرے میں اپنے جامد نظریے کے علاوہ کسی اور نظریے کو قبول کرنا تو کیا برداشت کرنے تک کا ظرف نہیں ہے، جوش ملیح آبادی جیسے جید عالم اور کبیر شاعر، یہاں حکومت اور عوام دونوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہتے ہیں اور میرے تمام ہم عصر ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں '

میں سندھ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عرصۂ دراز سے پڑھا رہا ہوں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ آج کی نسل جوش صاحب کو پڑھنا چاہتی ہے۔ مگر کس طرح پڑھے؟۔ ان کے مجموعے بآسانی دستیاب نہیں ہوتے، ان کتابوں کے جملہ حقوق جن کے پاس ہیں یہ وہی بتا سکتے ہیں کہ جوش صاحب کی وفات کے تیس سال بعد بھی ایسا کیوں ہے!

ہماری ادبی دنیا میں جوش صاحب کو رسوا کرنے اور نئی نسل کے ذہنوں میں بگاڑ پیدا کرنے لیے بہت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کیا جا رہا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ صرف ایک مثال دے کر بات ختم کرنا چاہتا ہوں ___ آپ یہ دیکھئے کہ کسی بھی مصنف کی جب کوئی کتاب شائع کی جاتی ہے، اس کے تعارف میں فلیپ پر جو تحریریں ہوتی ہیں اس میں ایسے کلمات لکھے جاتے ہیں جس سے مصنف کی قدر افزائی ہو اور قاری اس کی عظمت، اس کے احترام اور اس سے رشتۂ اخلاص کی فضا میں کتاب کا مطالعہ کرے۔

یادوں کی برات کا وہ ایڈیشن جوشانِ ہند پبلی کیشنز، دہلی نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا اس پر جن دو ادیبوں کے فلیپ ہیں ان میں ایک مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں، دوسرے مولانا ماہر القادری۔ دونوں جوش کے مخالف اور یادوں کی برات کے خلاف برہم لہجوں کے ادیب ہیں ___ اب ہماری نسل جب جوش صاحب سے آگہی کے لیے ان کی یہ خودنوشت پڑھنا چاہے گی تو اسے پہلے ان شمشیر بکف آراء سے زخمی ہو کر آگے بڑھنا ہوگا۔ یہ ہے مطالعہ جوش کے ذیل میں جوش کے ناشروں اور ہمارے قافلہ سالار ادبی بزرگوں کا رویہ:

ڈاکٹر ہلال نقوی

فہرست

میرے خورد احباب

میرے پاکستانی دوست

......

پیش گفتار

اقبال حیدر

صدر، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، کینیڈا

جوش کی یادوں کی برات کو نکلے ہوئے تینتالیس برس ہونے کو آئے مگر صدائے بازگشت ہے کہ تھمنے کو نہیں آتی۔ کبھی اس کی انشاء پردازی کی بات ہوتی ہے تو کبھی خاکہ نگاری کی، کبھی معاشقوں کے حوالے سے رائے زنی ہوتی ہے تو کبھی 'جوش کی نام نہاد دانستہ' غلط بیانی کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے، کہیں برصغیر کی دس اہم ترین کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے تو کہیں فحش نگاری کا تمغہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے سوانحی ادب میں اس کتاب سے زیادہ ہنگامہ خیز، شورش انگیز، سرکش اور وقیع کتاب نہیں آئی۔ اگر سوانح حیات نام ہے اپنے اطراف و جہات کو آشکار کرنے کا اور اپنے آپ کو روشناس کرانے کا تو یہ کتاب اپنے مصنف کا انتہائی بے باک تعارف ہے۔ یادوں کی برات ہر لحاظ سے جوش کا بھرپور عکس ہے۔

جہاں اس کتاب کے بارے میں ڈھیروں روایتیں ہیں وہیں ایک یہ بھی ہے کہ اس کے بہت سے ابواب و اوراق تلف ہو گئے تھے یا کوئی لے اُڑا تھا۔ ظاہر ہے جوش کے دیرینہ 'کرم فرماؤں' اور نوزائیدہ و ناواقف 'داناؤں' نے اس سلسلے میں قیاس آرائیوں سے لے کر تہمت تک میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ مگر نہ جانے زمانے کی کیا کارسازی ہے کہ جس طرح جوش صاحب پر 'نواب رام پور اور جوش کے دادا' کے حوالے سے واقعے کو جھٹلانے والوں کو خفت اُٹھانی پڑی، جب ڈھونڈنے والوں نے اس قرضے کے مسودات حاصل کر لیے، جس سے جوش کا بیان من و عن صحیح ثابت ہوا، اسی طرح یادوں کی برات کے قلمی نسخے، اس کے غیر مطبوعہ، منتشر اور گم شدہ اوراق کو بھی ایک سچے اور کھرے ریسرچ اسکالر نے ڈھونڈ نکالا اور ایک مرتبہ پھر یہ ثابت ہوا کہ

بلا ثبوت کسی پر الزام لگانا بدترین بددیانتی ہے مگر کیا، کیا جائے کہ یہ مسئلہ ہمارا مزاج بن چکا ہے۔ شاید یہ کسی نفسیاتی خلش کی کارفرمائی ہو جو ہمیں اس تواتر سے سچ کو جھوٹ کہنے پر اُکساتی ہو۔

بہر طور ــــ جوش کی خودنوشت کا بھاری بھرکم قلمی نسخہ اور اس نسخے کی گمشدہ تحریریں مل چکی ہیں اور طباعت کے لیے تیار ہیں۔ یہ سب جس شخص کی وجہ سے ممکن ہوا اس فرشتہ صفت جناتی انسان کو اہل علم و دانش ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام سے جانتے اور مانتے ہیں۔

ڈاکٹر ہلال نقوی سے ہمارے بہت دیرینہ اور کالج کے زمانے سے تعلقات ہیں۔ ہم اس 'آسائش گزیدہ' پاکستانی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو عرصۂ دراز سے وطن سے دور زندگی گزار رہا ہے اور ہمارے دوست ڈاکٹر ہلال اس 'آزمائش کشیدہ' طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو تمام تر نامساعدگی کے باوجود ڈٹا ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ صرف ڈٹا ہوا نہیں بلکہ اڑا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کام صرف جوش صاحب کے حوالے سے ہی اہم نہیں بلکہ یہ زبان و ادب کی تمام اہم ترین ادبی کاوشوں، مہم جوئی اور جستجو کے لیے ایک مثبت اور امید افزا پیغام ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہلال نقوی کو جوش کی ان دستاویزات کو حاصل کرنے کے لیے کتنے دن، کتنے مہینے اور کتنے سال لگانے پڑے ہوں گے، کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے ہوں گے، کس کس کو رام کرنا پڑا ہوگا، کتنی رقم خرچ کرنی پڑی ہوگی وغیرہ۔ ہاں میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اُن کے پاس بے شمار 'ادبی نوادرات' جمع ہیں۔ یہ اُن کا شوق نہیں ہے جنون ہے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کے حوالے سے متعدد مضامین اور اپنے رسالے 'جوش شناسی' کے توسط سے درجنوں انکشافات کیے ہیں مگر ان کے پاس جو چیزیں موجود ہیں اس کی اشاعت کے لیے صاحبانِ ثروت کی جانب سے ایک باقاعدہ سرپرستی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے الفاظ فاؤنڈیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تو ہے مگر ہلال نقوی دستِ تعاون کے لیے کبھی کسی سے کہیں گے نہیں، اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ لوگوں اور مقامی اربابِ حل و عقد کو پیش رفت کرنی چاہیے۔ پاکستان کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے تو زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ نجی اداروں یا کسی بڑی کارپوریشن کی خصوصی دلچسپی سے ہی یہ کام ہوگا۔ اس ادبی سرمائے کو محفوظ کرنا اور لوگوں تک پہنچانا ہم سب کا فریضہ ہے اور ہمیں اس کا احساس اور اظہار کرنا چاہیے۔

مشہور فرانسیسی شاعر، ادیب اور سیاستداں الفانس ڈی مارٹین (Alphonse de Martine) کا قول ہے 'Sentiment is the poetry of the imagination' یعنی 'جذبہ تصور کی شاعری ہے' اس قول کو پڑھ کر جوش صاحب کا ایک بہت مشہور برجستہ فقرہ یاد آتا ہے جو انہوں نے 'ضیا محی الدین شو' میں رقص کے حوالے سے کہا تھا، 'رقص اعضاء کی شاعری ہے'۔ ان دونوں اقوال میں قدرِ مشترک 'شاعری' ہے۔ اور زمان و مکان کے بیّن تفاوت کے باوجود شاعری کے جس اختصاص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے گویا 'زبان و بیان' کے لطیف ترین تاثر کا نام شاعری ہے۔ شعر و ادب کے امکانات اور برکات سے دور ہو کر

ذہنوں اور معاشروں کی ترقی مشکل تر ہو جاتی ہے۔ شئے لطیف کی آبیاری 'Cultivation of Finer Senses' میں شعر اور موسیقی سے جو تخلیقی تحریک (Inspiration) ملتی ہے اس سے کٹ کر سوچ اور رویوں میں ایک مخصوص سخت گیری سرایت کر جاتی ہے بھلے ہوتے ہیں وہ لوگ جو جمود توڑتے اور منافقت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور غنیمت ہیں وہ دم جواُن کی اس کوشش کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم چیزوں کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور معروضی رویہ اپنائیں۔

زیرِ نظر کتاب میں جو اذکار اور جو اشخاص ہیں وہ بھی سارے کے سارے نہیں ہیں۔ مجھے ہلال صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ اس میں ابھی بھی کچھ نام اور صفحات غائب ہیں جن کا تذکرہ وقتاً فوقتاً جوش صاحب نے یادوں کی برات کے چھپنے سے پہلے اور چھپنے کے بعد کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر ہلال جلد یا بہ دیر ان کو بھی حاصل کر لیں گے۔ یادوں کی برات کے وہ گمشدہ اوراق جواب ہلال صاحب کی تحویل میں ہیں ہم نے یہ صفحات پڑھے نہیں ہیں مگر ہلال صاحب سے ٹیلیفون پر ناموں کی ایک طویل فہرست ضرور سنی ہے۔ یہ صفحات اور پھر ان اشخاص کے تذکرے کیوں ہٹا دیے گئے تھے؟ اس پر ہلال صاحب نے یقیناً مقدمے میں حقائق سے پردہ ہٹایا ہوگا اور تحقیقی صداقتوں کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہوگا لیکن یہ ضرور اندازہ ہے کہ اس شرارت سے جوش صاحب کو بھی اور ان احباب کو جو حضرت جوش سے اتنے قریب تھے اور یادوں کی برات میں ہونے کا جائز استحقاق رکھتے اُن کو بھی بڑی تکلیف پہنچی ہوگی۔

پروفیسر احتشام حسین کو جو ذہنی، روحانی اور علمی وابستگی جوش صاحب سے تھی وہ کسی تذکرے کی محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'جوش ملیح آبادی۔ انسان اور شاعر' کے دیباچے میں (جو ۱۹۵۸ء میں لکھا گیا تھا) لکھا ہے کہ ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ان کے دل میں جوش کی سوانح عمری لکھنے کا خیال آیا اور جب جوش سے اس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ کیا وہ اپنے تمام راز افشاء کر دیں گے تو جوش نے کہا کہ اگر مجھ پر لکھنا ہی ہے تو 'Andre Masis' نے جس طرح 'Ariel' پر لکھا ہے ویسی کتاب لکھو۔ میں کچھ تصویریں اور اپنے اٹھارہ عشق کے حالات بتاؤں گا میرے مرنے کے بعد لکھ دینا___ 'جوش پاکستان چلے آئے۔

احتشام صاحب نے کچھ لکھا کچھ نہیں اُن کا انتقال جوش سے نو دس برس پہلے ہو گیا۔ اُن کے بعد وہ کتاب (نامکمل) چھپی مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جوش ۱۸ عشقوں کی بات کر رہے ہیں اور وہ بھی احتشام صاحب جیسے ذہین، ذکی اور واقف کار محقق سے تو کیا یہ اس بات کی سند نہیں ہے کہ ان کے معاشقے کوئی من گھڑت قصہ یا زیبِ داستان نہیں تھے۔ یہ خیال اضطراری طور پر اسی لئے شاید آ گیا کیونکہ لوگوں نے جانتے بوجھتے ہوئے چیزوں کو ان کے مقام و محل سے ہٹانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اسی قبیل کی زندگی گزار رہے تھے یا گزار چکے تھے، مگر کہنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

جوش اپنی 'برہنہ گفتاری' اور 'ناگفتنی کو گفتنی' بنانے میں بہت راسخ، اور شعوری طور پر بہت واضح تھے وہ ہمیشہ

معاشرے کی منافقت کے خلاف نبرد آزما رہے۔ ان کی اس ہمت کی داد نہ دینا بہت بڑی ناانصافی ہے اور اب اس کو ختم ہونا چاہیے۔
جی چاہ رہا ہے کہ مذکورہ بالا شیلی Shelley کی سوانح Ariel کے بالکل آخری حصے سے ایک مختصر سا اقتباس نقل کر دیا جائے:

"Ah, will of iron! This, Then, is all that remains of yours splendid Covrage......Like prometheus you defied Jupiter, and behold....."

اس مختصر سی گفتگو کے آخر میں یہ بھی اظہار کرتا چلوں کہ کوئی چار یا پانچ برس پہلے میں جب آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی کے زیر اہتمام جوش سیمینار میں شرکت کے لیے کراچی آیا تھا تو ایک روز ہلال صاحب کے گھر پر میں نے اس نایاب اور گرانقدر قلمی نسخے کو دیکھا تھا۔ میری تمنا تھی کہ یہ جلد منظرِ عام پر آئے اور آج جوش لٹریری سوسائٹی کینیڈا انتہائی طمانیت اور مسرت کے ساتھ ڈاکٹر ہلال نقوی کی برسوں کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے یادوں کی برات کے قلمی نسخے کی یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔
ڈاکٹر ہلال ہمارے دیرینہ دوست، رفیق کار اور نایاب قدروں کے حامل نقاد ہیں۔ ہمیں پوری امید ہے کہ ان کی یہ کوشش اور ان کی یہ گرانقدر کتاب ادب کے طالبِ علموں اور پرستارانِ جوش کے لیے ایک گرانقدر دستاویز ثابت ہوگی۔

اقبال حیدر
(کیلگری، کینیڈا)

۲۷ر فروری ۲۰۱۳ء

فٹ نوٹ کے حوالے سے ایک وضاحت

جہاں جہاں فٹ نوٹ میں ایسے نشان (ا ، ۲) کے تحت کچھ لکھا گیا ہے
تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ جوش ملیح آبادی کی تحریر ہے۔
اور
جہاں جہاں اسٹار (☆) بنا کر فٹ نوٹ میں کچھ تحریر کیا گیا ہے
تو یہ واضح رہے کہ یہ رائے یا یہ وضاحت کتاب کے مرتب (ہلال نقوی) کی جانب سے ہے

جوش ملیح آبادی کے عکسِ تحریر میں ___ ۶۶ صفحات

کتاب کے مختلف صفحات پر ۶۶ صفحات ایسے ہیں جو جوش صاحب کے عکسِ تحریر میں ہیں۔
ان میں بیشتر صفحات قلم زد ہیں۔ تحقیقی شواہد و حقائق سے یہ بات ثابت ہے کہ جوش صاحب جن صفحات کو
یادوں کی برات میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے وہ صفحات ضائع کر دیے تھے۔
لیکن جو صفحات انہوں نے قلم زد کیے وہ یادوں کی برات کا حصہ ہیں
ان سے متعلق تفصیلی مباحث مقدمے میں ملاحظہ فرمائیے۔

جوش ملیح آبادی کے آخری زمانے کی ایک نایاب تصویر
جوش صاحب کے بائیں جانب ان کے سب سے قدیم دوست میرزا عالمگیر قدر تشریف فرما ہیں
جبکہ اُن کے دائیں جانب اس کتاب کے مرتب ہلال نقوی بیٹھے ہوئے ہیں

مقدمہ

ادبیات کے ذیل میں تحقیقی شہادتوں اور چشم دید حقیقتوں کے پیشِ نظر میں بڑے وثوق سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی گنتی کے اُن چند لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے جوش ملیح آبادی کو، یادوں کی برات (کے کچھ صفحات) لکھتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ دو چار مواقع بھی میری نظر میں ہیں جب وہ اپنی خودنوشت کی ورق گردانی کے دوران اس میں کچھ اضافے، کاٹ چھانٹ یا تصحیح کر رہے تھے ___
یہ ۶۸۔۱۹۶۷ء کی بات ہے جب میں راجہ صاحب محمود آباد کے نظریاتی بنیادوں پر، قائم کردہ کالج، سراج الدولہ کالج کراچی (فیڈرل بی ایریا) میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ معروف نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین، صدر شعبۂ اردو تھے۔ جوش صاحب کا گھر اس کالج سے چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر تھا☆ میں پہلے پہل مجتبیٰ صاحب کے ساتھ ہی جوش صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور پھر ان سے یہ تعلق رفتہ رفتہ گہرا ہوتا چلا گیا۔

☆ ___ سراج الدولہ کالج، فیڈرل بی ایریا میں شاہراہِ پاکستان پر واقع کریم آباد کے بالمقابل سڑک کے دوسری طرف ایک نجی عمارت میں قائم تھا۔ اس کالج کے عقب میں کچھ فرلانگ کے فاصلے پر جوش ملیح آبادی رہا کرتے تھے۔ ان کا مکان ۱۳۸۔ ڈی فیڈرل بی ایریا کے بلاک ۵ میں واقع تھا۔ جس زمانے میں سراج الدولہ کالج کا آغاز ہوا اس کے کچھ عرصے بعد ہی اس مکان کی تعمیر شروع ہوئی تھی کراچی کے مشہور آرکیٹیکٹ اور گجراتی زبان کے ایک مستند شاعر صابر تھاریانی کی نگرانی میں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جوش صاحب کے نواسے فرخ جمال کے بقول یہ مکان پورے فیڈرل بی ایریا میں گنبد والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوا (جوش میرے بابا، شخص اور شاعر، پورب اکادمی اسلام آباد، فروری ۲۰۱۰ء، ص: ۸۰) جوش صاحب کے ایک اور نواسے سراج انور خاں نے اپنے مضمون میں اس مکان کے بارے میں لکھا ہے کہ 'ایک ہزار گز پر مشتمل یہ دو منزلہ عمارت ۱۹۶۶ء کے اواخر میں تعمیر ہو چکی تھی' (میرے بابا، مشمولہ 'جوش شناسی' الفاظ فاؤنڈیشن کراچی پہلا شمارہ، جنوری ۲۰۰۸ء، ص: ۶۱)

جوش صاحب کا بکھرا ہوا، ادبی اثاثہ

یادوں کی برات کے شکستہ وخستہ قلمی نسخے کی دریافت اور اس کے غیر مطبوعہ، منتشر اور گمشدہ اوراق کے حصول کی تحقیقی جدوجہد پر مشتمل اس پیش نظر کتاب کی ترتیب و تدوین کے وقت مجھے جوش صاحب کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کے بکھر جانے کا بارہا خیال آیا۔ جوش صاحب کی شعری تخلیقات کو یکجا کرتے ہوئے ان کے تمام تر ادبی اثاثے کے ذیل میں ایک مقام پر میں یہ لکھ چکا ہوں کہ بیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں، اردو زبان کے صفِ اوّل کے شعراء میں ایک طرف تو جوش صاحب کے پیش رو اقبال ہیں اور دوسری طرف ان کے معاصرین میں فراق، فیض، راشد، جمیل مظہری، حفیظ جالندھری، اور پھر علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی تک بھی آپ آجائیں ان تمام ناموں کے درمیان جوش صاحب اس اعتبار سے بھی وسیع تر تحقیق کے لئے ایک سخت مرحلہ ہیں کہ غیر مطبوعہ تو ایک طرف ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں تک کے حصول کے لیے عام قاری تو کیا نقاد و محقق تک سرگرداں و پریشاں رہتے ہیں۔ ان مجموعوں سے ہٹ کر ان کی وہ شعری و نثری تخلیقات جو غیر مطبوعہ تو نہیں ہیں لیکن نایاب بوسیدہ اخبارات اور دیمک خوردہ قدیم رسائل کے شکستہ اوراق میں اتنی اوجھل ہیں کہ انہیں یکجا کرنا تو درکنار ان تک رسائی بھی ایک مسئلہ ہے۔ جوش جیسے کثیر التصانیف قلم کار کی بے اندازہ نثری تحریریں اور ان کا بے پناہ شعری اثاثہ جس بے دردی کے ساتھ بکھرا پڑا ہے اس پر ہماری ادبی تاریخ شاید ہمیں معاف نہ کرے۔ فیڈرل بی ایریا کے اُس گنبد والے دومنزلہ مکان میں، جس میں ان کی صاحبزادی اور نواسے نواسیاں بھی ان کے ساتھ تھے، وہ پہلی منزل پر رہا کرتے تھے، زینے سے اترتے ہوئے زینے کے نچلے حصے سے متصل جگہ پر میں نے وہ شکستہ اٹیچی بھی دیکھی تھی جس میں ان کی تحریروں کے مُڑے ہوئے اوراق بے ترتیب صورت میں نظر آتے تھے میں نے اپنی متعدد تحریروں، کئی دیباچوں اور مختلف مقدموں میں جوش صاحب کے اس گراں قدر تحقیقی اثاثے کے منتشر اور ضائع ہوجانے کے خدشات کا تذکرہ کیا ہے۔

ان مختلف دیباچوں اور مقدموں میں سے صرف ایک مقدمہ جس کا تعلق میری کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں (جلد اوّل) سے ہے، یادوں کی برات کے منتشر اور گمشدہ نسخے کے اوراق کی جمع آوری کے سلسلے سے ایک بار پھر اس کے کچھ اقتباسات کو پڑھنے اور پرکھنے سے تحقیق کے کچھ اور بھی دریچے وا ہونے لگتے ہیں اور جوش صاحب کے تحریری خزینے کے بارے میں ادب کا قاری کئی پہلوؤں سے باخبر ہونے لگتا ہے اور اندازہ ہونے لگتا ہے کہ یادوں کی برات کے بکھرے ہوئے صفحات کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر شعری و نثری تحریریں کس حال میں ہیں۔ اور ان کے متعلق ہم کس کس دروازے پر دستک دے سکتے ہیں۔ میں اپنی بیس سال پہلے کی تحریر سے دو اقتباس یہاں نقل کر رہا ہوں:

"____ یہ تحریریں کہاں کہاں ہیں اور کس کس کے پاس ہیں؟ ___ اس ذیل میں

ظاہر ہے اُن کے بیٹے سجاد حیدر خروش سب سے پہلا حوالہ قرار دیے جائیں گے۔ جوش صاحب کا بیشتر غیر مطبوعہ ادبی سرمایہ اُنہی کی تحویل میں ہے۔ یہ سرمایہ اُنہیں جوش صاحب کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء) کے بعد منتقل ہوا۔ اُس وقت وہ اسلام آباد میں اپنے والد کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ بعد میں وہ کراچی میں جوش صاحب کے گنبد والے مکان ۱۳۸۔ڈی بلاک ۵ فیڈرل بی ایریا میں مع اہل وعیال آ گئے۔ اسی مکان میں جوش صاحب کی اکلوتی بیٹی سعیدہ خاتون کا ۲۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال ہوا۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں یہ مکان بیچ دیا گیا اور اب سجاد حیدر صاحب بفرزون میں رہتے ہیں جوش کا تمام ادبی سرمایہ بھی انہی کے ساتھ ہے لیکن اب جبکہ جوش صاحب کی وفات کو دس برس گزر چکے ہیں اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ اس ادبی اثاثے کو شائع ہونا چاہیے۔ اس میں اردو ادب کا بہت گراں قدر خزانہ منظوم اور غیر منظوم دونوں صورتوں میں موجود ہے 'حرف آخر' جیسی طویل نظم جو کم وبیش ۳۰ ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے اسی ذخیرے کا حصہ ہے۔ لغات کے حوالے سے بھی بعض انتہائی اہم نوادرات اس میں شامل ہیں ــــــ'' ☆

ایک دوسرا اقتباس:

''ــــــ یہ غیر مطبوعہ ادبی تحریریں مختلف نجی کتب خانوں میں بھی ہو سکتی ہیں۔ بعض قریبی احباب کی نوٹ بک میں بھی۔ کسی اخبار کے مدیر کے پاس، ادبی یا غیر ادبی رسائل کے دفتر میں پرانے کاغذات کے درمیان، جوش صاحب کے چاہنے والوں کی ذاتی ڈائریوں میں یا کیسٹ میں، پھر اُن خطوط کا بھی ایک دفتر ہے جو اب تک شائع نہ ہو سکے اور جن کے متعلق یہ معلوم کرنا بھی ایک بڑا تحقیقی معرکہ ہے کہ یہ کس کس کے پاس ہیں۔ جوش صاحب کی جو تحریریں کھو گئیں یا اُن کے پاس سے کوئی ''اُٹھا'' کر لے گیا اُن کی بھی ایک الگ داستان ہے۔ کراچی کے ایک مشاعرے میں جس کا اہتمام ریڈ کراس نے کیا تھا، اُن کی ۲۰۰ غیر مطبوعہ رُباعیاں غائب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے اپنی رُباعیات کے مجموعے ''قطرہ و قلزم'' (مطبوعہ ۱۹۶۳ء، دہلی) میں رُباعیوں کے غائب ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور حیرت اس بات پر ہے کہ وہ اُس شخص کو جانتے بھی ہیں لیکن تحریراً اُس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتے شاید یہ اُن کی انسان دوستی ہی کی ایک

☆ ــــــ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں جلد اوّل، حیات اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۰

شاخ ہے۔ جس زمانے میں بیسویں صدی کی مرثیہ نگاری کی تاریخ پر ڈاکٹریٹ کے لئے میں تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا انہوں نے اسلام آباد سے ایک خط (مرقومہ ۸؍اگست ۱۹۷۷ء) میں اپنے مرثیے 'آگ' کے بارے میں خود مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ مسدس اب تک کسی سے مل سکا یا نہیں بعد میں کراچی میں جب میں ان سے ملا اور اس موضوع پر بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا مسدس 'آگ' عیش ٹونکی لے گئے ___

یادوں کی برات کے حوالے سے جوش صاحب نے ایک بار مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے بعض ابواب چھپنے سے پہلے کوئی لے اُڑا۔ انہوں نے ایک بار یہ بھی بتایا تھا کہ غالباً ۱۹۶۱ء میں جب وہ یوم قلی قطب میں شرکت کے لئے دکن گئے تھے تو ان کی کچھ نظمیں راستے میں کہیں گر گئی تھیں۔ اپنی سب سے طویل نظم 'حرفِ آخر' کا ایک جزوی حصہ بھی انہیں دوبارہ لکھنا پڑا تھا۔ بقول اُن کے یہ حصہ گھر میں ہی کہیں کھو گیا۔ جوش صاحب کے نواسے سراج انور خاں نے بھی ان کی تحریروں کے ضائع ہو جانے کا متعدد بار مجھ سے ذکر کیا ہے۔ صبوحی خاتون کے بیٹوں یعنی جوش صاحب کے پرنواسوں انجم ناصر اور کلیم ناصر نے جن سے اکثر و بیشتر میری ملاقات ہوتی ہے مجھے بتایا کہ ہم نے فیڈرل بی ایریا والے مکان میں نانا کے لکھے ہوئے کاغذات کو ڈرائنگ روم سے متصل کمرے کی چوکھٹ کے پاس پانی میں تیرتے دیکھا۔

ان دونوں بھائیوں نے یہ بھی بتایا کہ ''نانا نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب 'روحِ اقبال' کے ہر صفحے پر اپنی رائے لکھی تھی۔ وہ ہم نے خود دیکھی تھی ہمارے گھر کے غسل خانے کی کارنس پر وہ بہت دنوں پڑی رہی۔ اندازہ یہی ہے کہ وہ ہمارے کسی اہلِ خاندان کے پاس ہوگی۔'' جس زمانے میں جوش صاحب کے پاس میر اروز کا اُٹھنا بیٹھنا تھا، مجھے یہ بھی ان کی گفتگو سے پتہ چلا تھا کہ 'دیوانِ حافظ' اور شبلی کی کتاب 'موازنہ انیس و دبیر' پر بھی انہوں نے مختلف مقامات پر اپنی رائے لکھی تھی۔ سبطِ حسن مرحوم کی ایک تصنیف پر بھی ان کے حاشیے تھے ___'' ☆

جوش صاحب کے نثری سرمائے میں جو تحریریں بکھرنے سے بچ گئیں اُن میں تین تصانیف ایسی ہیں جو تقسیم سے پہلے خود جوش صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئی تھیں۔ مقالاتِ زریں (۱۹۲۱ء)، اوراقِ سحر (۱۹۲۱ء)، اور اشارات (۱۹۴۲ء) اسی سلسلے کی مطبوعات ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُن کا ضخیم نثری مجموعہ یادوں کی برات

☆ ___ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں (جلد اوّل)، حیات اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۱، ۱۲۔

(۱۹۷۰ء) جوش اکیڈمی کراچی نے شائع کیا۔ یادوں کی برات کے بعد بھی اُن کی بعض نثری تحریریں یکجا کی گئیں☆

یادوں کی برات کا منظرِ عام پر آنا

یادوں کی برات ۱۹۷۰ء میں ایک ایسے موقع پر منظر عام پر آئی جب ملک میں ہر سطح پر ایک تلاطم سا تھا اور پاکستان، الیکشن کے دوراہے سے گزر رہا تھا، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور پاکستان کے تمام ہی اہم اور غیر اہم سیاست دان سرگرم عمل تھے۔ دائیں اور بائیں بازو کی تقریباً تمام ہی پارٹیاں الیکشن جیتنے کے لیے تن من دھن کی بازیاں لگا رہی تھیں۔ اسی فضا میں اور اسی سال (۱۹۷۰) جوش صاحب کا مضمون 'الیکشن' بھی منظر عام پر آیا جسے 'لیل ونہار' نے شائع کیا۔☆۱

۱۹۷۰ء کے، سیاسی ہنگامہ خیزیوں کے ایسے ماحول میں 'یادوں کی برات' شائع ہوئی تو خیال یہی تھا کہ شاید ہی کوئی اس کی طرف متوجہ ہو سکے۔ لیکن ہوا کیا۔ زاہدہ حنا کے لفظوں میں پڑھ لیجیے:

> ''____ ''یادوں کی برات'' ۷۰ء میں شائع ہوئی، یہ وہ دن تھے جب ہر طرف سیاسی ہلچل تھی۔ شیخ مجیب، بھاشانی، بھٹو، ولی خان اور بہت سے دوسرے۔ جلسے جلوس، اخباروں کی چیختی چنگھاڑتی سرخیاں، یہ وہ دن تھے جب ملک میں انتخابات کی ہلچل تھی۔ ایک طرف شیخ مجیب کراچی میں جلسہ کر رہے تھے اور اعلان کر رہے تھے کہ مشرقی پاکستان، کبھی مغربی پاکستان سے علیحدہ نہیں ہوگا۔ دوسری طرف مشرقی پاکستان میں تاریخ کا ہولناک سیلاب ڈھائی لاکھ سے زیادہ گھروں کو بہالے گیا تھا اور مشرقی بنگال کے سوا کروڑ لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا لاوا پک رہا تھا

☆ ____ یادوں کی برات (۱۹۷۰ء) کے بعد اُن کی زندگی ہی میں ڈاکٹر سید صفدر حسین نے، میر عترت حسین کے نام اُن کے خطوط کا مجموعہ 'نقشِ اخلاص' ۱۹۷۶ء میں لاہور سے شائع کیا۔ جوش صاحب کی وفات کے بعد اُن کی کئی نثری تحریروں (اور نثری اظہار) کو یکجا کر کے مجموعے کی صورت دی گئی جن میں، مقالاتِ جوش (پروفیسر سحر انصاری، ۱۹۸۲ء)، مکالماتِ جوش و راغب، (راغب مرادآبادی، ۱۹۸۸ء)، جوش بنام ساغر (خلیق انجم، ۱۹۹۱ء)، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں (ہلال نقوی، ۱۹۹۲ء)، خطوطِ جوش ملیح آبادی (راغب مرادآبادی، ۱۹۹۳ء)، جوش ملیح آبادی کے خطوط (خلیق انجم، ۱۹۹۸ء)، اشاراتِ جوش، دوسرا ایڈیشن (ڈاکٹر علی احمد فاطمی ۲۰۰۱ء)، اور اوراقِ جوش (ہلال نقوی، ۲۰۱۰ء) جوش صاحب کے نثری خزینے کی مختلف صورتیں ہیں۔

☆۱ ____ ہفت روزہ لیل ونہار، کراچی، ۷ تا ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء

اور حکمرانوں کو اس بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ پیپلز پارٹی ایک پُر جوش عوامی پارٹی کے طور پر اپنا قامت نکال رہی تھی۔ جماعت اسلامی یومِ شوکتِ اسلام منا رہی تھی۔ قوم پرست تحریکیں اُبھر رہی تھیں۔ بائیں بازو کے انقلابی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ نئے اخبارات ظہور کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ ملک بھر میں صحافی ہڑتال کر رہے تھے، دائیں بازو اور بائیں بازو کے صحافیوں اور سیاستدانوں کے درمیان مہابھارت چھڑی ہوئی تھی۔ اس ہنگامہ خیز سیاسی ماحول میں رندِ خراباتی جوش ملیح آبادی کی خود نوشت ''یادوں کی برات'' شائع ہوئی اور ان تمام ہنگاموں کے باوجود ادبی حلقوں میں اس نے ایک ہلچل مچادی ــــــ'' ☆

اس ہلچل میں جوش صاحب کے مخالفین کی بھی ہلچل شامل تھی چنانچہ اس خودنوشت کی تردید میں شعلے اُگلتے اخبار، قلم، شمشیر بکف اداریے اور زہر آلود مضامین میدان میں اُتر آئے، اور خوب دھما چوکڑی مچی، اس کے باوجود مخالفین اس خودنوشت کی اہمیت اور جوش صاحب کی صاف و شفاف شخصیت سے خود بھی انحراف نہیں کر سکے۔ طولِ کلام سے گریز کرتے ہوئے میں صرف ایک دو ہی کا تذکرہ کروں گا۔ اپنے زمانے کے معروف شاعر اور رسالہ 'فاران' کے ایڈیٹر مولانا ماہر القادری جوش صاحب کے کبھی بھی ہم نوا نہیں رہے۔ وہ اپنے رسالے میں نئی کتابوں پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا کرتے اور شخصیات پر بھی لکھا کرتے تھے، جس میں توصیفی کلمات بھی ہوتے اور کبھی کبھی کتاب کے مصنف، مؤلف یا مرتب کے بخیے بھی ادھیڑے جاتے تھے۔ جوش صاحب مولانا ماہر القادری کے اس ڈھنگ اور اس رنگ سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جب اپنے دستخط سے ماہر القادری کو ''یادوں کی برات'' بھیجی تو ساتھ ہی یہ عبارت بھی لکھی:

'حضرتِ ماہر لیجئے بکرا حاضر ہے شوق سے ذبح فرمائیے' ☆۱

مولانا ماہر القادری نے فاران کے ایک شمارے میں کم و بیش ۳۰ صفحات پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا، اختلاف و تردید کے متعدد راستے انہوں نے اختیار کیے لیکن ایک موڑ پر وہ یہ بھی اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے کہ:

''ــــــ یہ ایک مشاق ادیب اور عظیم شاعر کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے جسے دلچسپ اور رنگا رنگ ہونا ہی چاہیے جہاں تک ہماری محدود معلومات کا تعلق ہے دنیا کے کسی بڑے شاعر نے اس قدر شرح و بسط کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات قلم بند نہیں کیے ــــــ'' ☆۲

☆ ــــــ ایک دور یاد آیا، (کالم، نرم گرم) زاہدہ حنا۔ مشمولہ روزنامہ ایکسپریس کراچی، ۱۵؍ جولائی ۲۰۱۲ء

☆۱ ــــــ ہماری نظر میں، (یادوں کی برات)۔ ماہر القادری، فاران کراچی، فروری ۱۹۷۲ء، ص: ۳۵

☆۲ ــــــ ایضاً

نامی انصاری بھی جو جوش صاحب سے بعض امور میں اتفاق نہیں کرتے وہ بھی اپنے مضمون 'یادوں کی برات پر ایک نظر' کی بالکل اختتامی سطروں میں جوش صاحب کی شخصیت اور اُن کے 'کردار' کے حوالے سے یہ اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ:

"____ یہ پُرخطر داستانِ حیات جوش ہی لکھ سکتے تھے کیونکہ اُن میں ہزار خرابیاں رہی ہوں گی، مگر وہ ریا کار ہرگز نہ تھے اور اُن کی یہی خوبی اُن کی تمام خرابیوں پر غالب آجاتی ہے____" ☆

خودنوشت سوانح حیات کا خاکہ

جوش صاحب نے راغب مرادآبادی کے ایک سوال کے جواب میں یہ بات کہی تو ہے کہ انہوں نے کوئی خاکہ بنا کر یادوں کی برات نہیں لکھی ☆۱، مگر ان کی اس رائے سے مکمل اتفاق ذرا مشکل ہے کوئی باضابطہ، مرتب اور مربوط ومبسوط تحریری خاکہ نہ سہی لیکن ایک ایسا اضطراب اور ایک ایسا تموج وتلاطم جس سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی، ان کے ذہن میں ضرور سر اُٹھاتا رہتا تھا جو سارے بندھن توڑ کر اپنی زندگی کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا۔ یہی وہ غیر تحریری خاکہ ہے جو اُن کے ذہن میں تھا۔

یادوں کی برات ۱۹۷۰ء میں ہمارے سامنے آئی لیکن جوش صاحب کا ذہن اسے اپنے قرطاسِ احساس پر نہ جانے کب سے لکھ رہا تھا۔ تجزیہ نگاروں کی یہ آراء درست نہیں ہیں کہ جوش صاحب نے ۱۹۷۰ء سے پانچ چھ برس پہلے اپنی سوانح حیات لکھنے کا ارادہ کیا اور بہت سی ذاتی اور ادبی مصروفیات سے وقت نکال نکال کر انہوں نے یہ خودنوشت مکمل کی۔ یہ خیال قطعی غلط ہے____ اردو کے نامور نقاد پروفیسر احتشام حسین نے ۱۹۴۰ء میں جوش صاحب سے یہ بات کہہ دی تھی کہ وہ ان کی سوانح حیات ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ جوش صاحب کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جس طرح فرانسیسی سوانح نگار، آندرے ماروا نے انگریزی شاعر شیلی کی سوانح 'اریل' لکھی ہے احتشام حسین اگر لکھیں تو پھر اسی طرز پر ان کی سوانح لکھ دیں۔ احتشام صاحب کہتے ہیں:

"____ جوش نے کہا اگر لکھنا ہی ہے تو مجھ پر اریل کی سی کتاب لکھئے میں نے کہا لکھ تو دوں کیا آپ اپنی زندگی کے وہ سارے دفینے میرے سامنے کھول کر رکھ دیں گے جن سے آپ نے اپنی زندگی رنگین بنائی ہے۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے ٹھیک کہتے

☆____ مضمون، مشمولہ، جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، مرتب خلیق انجم، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۶۳۔

☆۱____ مکالمات جوش و راغب۔ جوش لٹریری سوسائٹی کیلگری کینیڈا، جون ۱۹۸۸ء، ص: ۱۰۶۔

ہیں آپ۔ ہندوستان اور انگلستان میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے یہاں تو لڑائیاں چھڑ
چھڑ جائیں گی اور پھر آخر میں یہی کہا کہ میرے مرنے کے بعد ایسی ہی سوانح عمری لکھ
دیجئے گا ____ ''☆

احتشام صاحب، جوش صاحب کے مرنے کے بعد ان کی سوانح کیا لکھتے وہ تو خود جوش صاحب کی وفات سے کئی برس پہلے اس دنیا سے گزر گئے، لیکن پروفیسر احتشام حسین اور جوش صاحب کے درمیان سوانح حیات ترتیب دینے کے حوالے سے جو مکالمہ ہوا تھا وہ بتا رہا ہے کہ جوش صاحب اپنی سوانح ترتیب دینے کے بارے میں کچھ بنیادی ستون ضرور قائم کر چکے تھے۔ انہیں یہ خدشہ تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے حسب منشا یہ سوانح نہیں لکھ سکے گا ____ وہ ڈری، ڈری، ڈھکی چھپی اور مصلحتوں کے غلافوں میں لپٹی سوانح حیات قلم بند کر دینے کے حامی نہیں تھے۔ احتشام حسین سے گفتگو کے بعد ۱۹۴۰ء کی دہائی ہی میں وہ اپنی خود نوشت کے لیے قلم اُٹھا چکے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور سے ان کے پہلے شعری مجموعے 'روحِ ادب' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو 'بازگِ بانگِ پریشاں می زنم' کے عنوان کے تحت دیباچے میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار کا ایک جامع احاطہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک جگہ اپنے پہلے شعری مجموعے کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

'' ____ اس مجموعے کی اشاعت کے وقت میرے گرد و پیش کی دنیا اور میرے تاثرات و حالات کیا تھے، اس مختصر سے دیباچے میں اس کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی یہ داستان میں اپنے خود نوشت سوانح میں بیان کروں گا جو ہنوز ضبطِ تحریر کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہا ہے ____ ''☆۱

یہ دیباچہ لکھنے کے کم و بیش ۱۷ سال بعد ۳۱ رجنوری ۱۹۵۹ء کو ڈاکٹر عبادت بریلوی کو لکھتے ہیں:

'' ____ آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ میں نے اپنی زندگی کے حالات یادوں کی برات کے نام سے لکھنا شروع کر دیے ہیں ____ اور بہت کچھ لکھ چکا ہوں جب لاہور آؤں گا یا آپ کراچی آئیں گے تو اس کی سرخیاں دکھاؤں گا اور مشورہ لوں گا ____ ''☆۲

ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی نے جوش صاحب کی وفات کے بعد شائع ہونے والے افکار بیادِ جوش نمبر (۱۹۸۲ء) میں ۱۹۶۱ء کے کچھ عرصے بعد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جوش صاحب اُن دنوں یادوں کی

☆ ____ جوش ملیح آبادی انسان اور شاعر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۲،۱۱۔

☆۱ ____ روحِ ادب، دوسرا ایڈیشن، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص: ۱۱

☆۲ ____ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام خط، مشمولہ افکار جوش نمبر ۱۹۶۱ء، ص: ۷۵۔

برات کے مسودے پر تیسری مرتبہ نظر ڈال رہے تھے☆___ ۱۹۷۰ء میں یادوں کی برات کا پہلا ایڈیشن جوش اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا تو اس میں فہرست کے فوراً بعد کے صفحے پر یہ رُباعی لکھی ہوئی تھی:

اطراف و جہات کو مرتب کر لے
روداد حیات کو مرتب کر لے
اس سے پہلے کہ بھول جائے سب کچھ
یادوں کی برات کو مرتب کر لے

یہ رُباعی جوش صاحب کی کوئی تازہ ترتخلیق نہیں تھی بلکہ یہ ان کی رُباعیات کے مجموعے 'نجوم و جواہر' میں شائع ہو چکی تھی ☆۱، جس میں دوسرا مصرعہ یہ نہیں تھا، اپنی خودنوشت میں جوش صاحب نے جب یہ رُباعی درج کی تو اس کے دوسرے مصرعے میں صرف ایک لفظ تبدیل کر دیا اور 'اوقات' کی جگہ 'روداد' لکھ دیا:

اوقاتِ حیات کو مرتب کر لے (۱۹۶۷ء)

......

رودادِ حیات کو مرتب کر لے (۱۹۷۰ء)

پہلے ہی ایڈیشن میں ردّ و بدل کی ضرورت

جوش صاحب بڑی شد و مد سے خود سے یہ کہتے تو ہیں کہ اطراف و جہات اور اپنی رودادِ حیات کو 'مرتب' کر لے۔ لغت میں مرتب کرنے کا جو مطلب باقاعدہ ترتیب دینا اور قاعدے سے چننا لکھا ہوا ہے تو اس نہج سے تو یہ کام جوش صاحب نے نہیں کیا___ یہ ارادہ ان کے صرف ذہن ہی کے نہاں خانوں میں رہا اسے ایک 'مرتب' صورت دینے کے لیے انہوں نے کاغذ پر نہ تو اسے کوئی ترتیبی شکل دی نہ کہیں نکات قائم کیے۔ یادوں کی برات سے متعلق اپنے تحقیقی سفر میں مجھے جوش صاحب کے منتشر کاغذات کی چھان بین کے دوران ان کا لکھا ہوا کوئی ایسا صفحہ کہیں نہیں مل سکا جس پر انہوں نے خودنوشت کے منصوبے کے کچھ سنگ میل بنائے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ترتیب میں ایک بے ترتیبی بھی پیچھے پیچھے چلتی رہی حافظے کی اُبھرتی اور ڈوبتی موجیں کناروں کو چھوتی بھی رہیں اور کہیں کہیں تہہ نشینی کے غلافوں میں اپنا سر بھی چھپاتی رہیں۔ رودادِ حیات کے کتنے منتشر احوال تھے جو سمیٹے نہیں جا سکے یادوں کی برات شائع ہو کر ابھی کتابوں کی دکانوں پر پہنچی بھی نہیں تھی کہ پہلے ہی ایڈیشن میں رد و بدل کی ضرورت پیش آ گئی۔

☆___ افکار بیاد جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص: ۸۵۔

☆۱___ نجوم و جواہر، جوش ملیح آبادی، جوش اکیڈمی کراچی ۱۹۶۷ء، ص: ۲۹۳۔

خودنوشت کا کا تیسرا باب 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' جس میں جوش صاحب نے ۳۵ ر احباب کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس کے آخری تین نام شمس زبیری، سید سبطِ حسن اور منور عباس ایک 'طباعتی مجبوری' کے تحت نکال دیے گئے☆ ___ ایسا کیوں ہوا؟ جوش صاحب کے قریبی دوست منور عباس صاحب کی زبانی اس کی کچھ روداد سن لیجیے:

"___ سنہ ۱۹۷۰ء میں جوش صاحب نے یادوں کی برات طبع کرائی، اس کتاب میں ایک باب ہے "میرے چند قابلِ ذکر احباب" یوں تو جوش صاحب کے احباب کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن اس کتاب میں صرف چند احباب کا ذکر ہے۔ اس باب میں دو صفحات پر جوش صاحب نے میرا ذکر کیا تھا۔ اور مقفیٰ و مسجّع عبارت میں پورے دو صفحات (۵۷۷، ۵۷۸) پر میرا تذکرہ تھا اور ایسی تعریفوں کے پل باندھے تھے جن کا میں کسی طرح اہل نہیں ہوں۔ جوش صاحب نے ایک کاپی مجھے بھی عنایت فرمائی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے۔ جب جوش صاحب ہفتہ وار نشست میں میرے دفتر تشریف لائے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اس کتاب میں آپ سے ایک فروگذاشت ہوگئی ہے۔ اس میں ابوطالب نقوی مرحوم (سابق کمشنر کراچی) کا تذکرہ نہیں ہے ان کے آپ پر احسانات ہیں اور اُنہی کی بہ اصرار دعوت پر آپ پاکستان آئے۔ جوش صاحب نے کہا واقعی یہ بھول ہوگئی مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ اب تو کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ میں نے کہا ابھی آپ نے صرف چند نسخے اپنے قریبی احباب کو دیے ہیں کتاب بازار میں نہیں آئی ہے۔ یوں کیجئے کہ میرے متعلق جو ورق ہے اُسے نکال کر اس کی جگہ اے۔ ٹی۔ نقوی مرحوم کا ذکر شامل کردیجئے اس سے کتاب اور اس کی صفحات کی ترتیب بھی باقی رہے گی اور آپ کے محسن کا ذکر بھی ہوجائے گا۔ جوش صاحب کتاب سے میرا ذکر نکالنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے مگر میں نے اصرار کیا اور زیبا مرحوم نے انہیں سمجھایا تب وہ اس پر راضی ہوئے چنانچہ یادوں کی برات سے میرا ذکر نکال کر نقوی صاحب مرحوم کا ذکر شامل کیا ___" ☆۱

منور عباس صاحب کی یہ رائے اور ان کا یہ مضمون جس رسالے میں شائع ہوا وہ میں اپنے ساتھ لے کر، اُن سے ملنے، اُن کے گھر گیا اور اُن ہی کے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے اُن سے پوچھا کہ:

☆ ___ ۱۹۷۰ء ہی میں جو ترمیم شدہ ایڈیشن شائع ہوا اس میں یہ تینوں نام نہیں ہیں۔

☆۱ ___ محبت کا قرض، مشمولہ مجلّہ 'حیاتِ جاوداں بیادِ جوش' مرتب نعیم میرٹھی، اپریل ۱۹۸۳ء، کل پاکستان حلقۂ ادب کراچی، ص: ۶۵

____ آپ کی رائے کے بموجب جب جوش صاحب نے شمس زبیری، سبطِ حسن، اور آپ کا تذکرہ نکال دیا اور بقول آپ ہی کے سابق چیف کمشنر کراچی اے ٹی نقوی صاحب کا تذکرہ شامل کر دیا ____ تو یہ فرمایئے کہ یادوں کی برات میں یہ اضافی تذکرہ کہاں ہے، فوری ردوبدل کے بعد جو ایڈیشن سامنے آیا تھا اس میں آپ تینوں حضرات کے تذکرے تو یقیناً نکال دیے گئے مگر اس میں اے ٹی نقوی کا تذکرہ تو کہیں نہیں ہے ____ ان تبدیل شدہ صفحات پر تو مجاز کا تذکرہ شامل کیا گیا ہے ____

میری یہ بات سن کر وہ حیران ہوئے شاید انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا، اور پھر کچھ دیر تک وہ چپ رہے اور یوں لگا جیسے وہ اپنے حافظے کی بھول بھلیوں میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ وہ اُٹھے اور یادوں کی برات کا وہ ایڈیشن اپنی کتابوں کی الماری سے لے کر آئے جس میں ردوبدل کیا گیا تھا۔ ان صفحات کو دیکھ کر وہ متذبذب سے نظر آئے، انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا بس اتنا کہا کہ کچھ وقت دیجئے، اور بات ختم ہوگئی، میں کچھ روز بعد پھر اُن کے گھر گیا۔ اس بار انہوں نے تذبذب کے عالم میں یہ کہا کہ:

"____ میں نے تو اے ٹی نقوی ہی کے لیے کہا تھا اور انہوں نے اے ٹی نقوی پر ہی لکھا تھا، یہ مجاز کا ذکر کس طرح آ گیا۔ اب کچھ صحیح صحیح یاد نہیں رہا ____"

یہ بات مجھے راغب صاحب سے پتہ چلی تھی کہ جوش صاحب کو اس بات کا بھی بہت رنج تھا کہ اس میں مجاز کا تذکرہ کیوں شامل نہیں ہو سکا۔ جب اے ٹی نقوی کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور جب کچھ صفحات دوبارہ شائع ہو ہی رہے ہیں تو پھر، مجاز کو تو لازماً ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اے ٹی نقوی اور مجاز دونوں کا بہت جامع ذکر کیا۔ منور عباس صاحب بہت دنوں تک اس بات میں اُلجھے رہے کہ یہاں جو اضافہ کرنا مقصود تھا وہ کس کا تھا، اے ٹی نقوی یا مجاز کا، ایک بار انہوں نے مجھ سے مجاز کا نام بھی لیا تھا۔ ☆

یادوں کی برات کے شائع ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہی مجھے یہ بات سب سے پہلے استادِ مکرم پروفیسر مجتبیٰ حسین کی زبانی معلوم ہوئی تھی کہ جوش صاحب نے اپنی خود نوشت میں اپنے بہت سے احباب کا تذکرہ کیا تھا لیکن جب کتاب آئی تو اس میں یہ سب تذکرے غائب تھے مجتبیٰ صاحب کا حوالہ دے کر راغب صاحب سے جب میں نے دریافت کیا تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی ____ جوش صاحب ۱۹۷۲ء میں کراچی سے اسلام آباد جا چکے تھے، میں اپنے تحقیقی معاملات کے سلسلے سے اُنہیں خطوط لکھتا رہا انہوں نے کچھ خطوط کے جواب بھی دیے ۲۴ ستمبر ۱۹۸۰ء کے ایک جواب میں ان کے اس انکشاف نے یادوں کی برات سے متعلق ہونے والی تحقیق کا رُخ یکسر موڑ دیا۔

☆ ____ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں جلد اوّل، حیات اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۰۵۔

"______ تم نے جمیل مظہری کا شکایتی قطعہ بھیجا تھا یادوں کی برات میں نہ صرف جمیل مظہری کا بلکہ دوسرے دوستوں کا بھی ذکر تھا مگر نہ جانے کیا گڑ بڑ ہوئی کتاب چھپنے گئی تو اس کے اصل مسودات سے بعض تذکرے کوئی لے اُڑا______" ☆

قلمی نسخے کی تلاش

جوش صاحب کا یہ کہنا کہ یادوں کی برات کے اصل مسودات میں سے بعض تذکرے کوئی لے اُڑا، یادوں کی برات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے کئی سوال کھڑے کر گیا۔ ان سوالات کے جواب کی سب سے بہتر صورت ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ یادوں کی برات کے اصل مسودات کو دیکھا اور پرکھا جائے، مگر کیا کیا جائے ___ جوش صاحب تو اب کراچی میں رہتے نہیں تھے، اُن کی تحریروں تک رسائی اب اتنی آسان بھی نہیں

☆ ___ نقوشِ جوش اور دوسری کئی کتابوں کے مصنف معروف نقاد ڈاکٹر محمد رضا کاظمی، جو نامور شاعر اور جوش صاحب کے ہم عصر دوست علامہ جمیل مظہری کے عزیز قریب بھی ہیں انہوں نے مجھے مظہری صاحب کا، جوش صاحب کے نام ایک قطعہ دیا تھا کہ میں یہ جوش صاحب کو بھیج دوں۔ جوش صاحب نے اپنے خط میں جسے شکایتی قطعہ کہا ہے وہ یہ ہے:

سلام اے جوش! یار ہم زباں کی اتنی نا قدری
سلام اے جوش! اپنے مدح خواں کی اتنی نا قدری
بھلایا نام اس کا، اپنی یادوں کی براتوں میں
جمیل مظہری سے قدرداں کی اتنی ناقدری

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے بتایا کہ اس قطعے کا چوتھا مصرعہ بھی اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے اور وہ یہ کہ ماہنامہ آجکل دہلی کے ایک شمارے میں جوش صاحب کی نظم فیضان شائع ہوئی تھی جس کے مقطعے میں جوش صاحب نے جمیل مظہری کی نسبت سے یہ بات کہی تھی:

بحمد اللہ جوش اس بد مذاقی کے زمانے میں
جمیلِ مظہری سا قدر داں بخشا گیا مجھ کو

جمیل مظہری نے جوش صاحب کے اسی مصرعے کو اساس بنا کر یہ قطعہ کہا جوش صاحب کا خط جس میں انہوں نے یادوں کی برات سے جمیل مظہری کا تذکرہ غائب ہو جانے کا ذکر کیا ہے وہ مرثیہ عظیم (۱۹۸۰ء)، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں (۱۹۹۲ء، ہلال نقوی) اور جوش ملیح آبادی کے خطوط (۱۹۹۸ء، خلیق انجم) میں شائع ہو چکا ہے۔ علامہ جمیل مظہری کا وہ خط (۵ ستمبر ۱۹۷۹ء، بہار) جس میں انہوں نے جوش صاحب کے لیے یہ قطعہ لکھا تھا وہ ماہنامہ آگہی کراچی کے سالنامے، مارچ ۱۹۹۳ء (مکاتیب جمیل مظہری بنام محمد رضا کاظمی، ص: ۶۷) میں شائع ہوا ہے۔ خط کی عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ خط مظہری صاحب نے، علامہ طالب جوہری صاحب کے ہاتھ روانہ کیا تھا جب وہ (اپنے دورۂ بھارت کے بعد) بہار سے کراچی واپس آرہے تھے۔

تھی۔ جوش صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع رہا ہے لیکن یادوں کی برات کے تعلق سے معلومات جن سے حاصل کی جاسکتی تھیں ان میں تین افراد اہم تھے۔ایک میرزا عالمگیر قدر، دوسرے منور عباس، تیسرے راغب مرادآبادی۔ پرنس میرزا عالمگیر قدر، جن کے بارے میں جوش صاحب نے یادوں کی برات میں لکھا ہے کہ:

"____ میری محراب زندگی میں یہ میرزا ہی ایک دیا باقی رہ گیا ہے اگر یہ بھی بُجھ گیا
تو میں اندھیرے میں دفن ہو کر رہ جاؤں گا____" ☆

یہ قربت ومحبت اپنی جگہ لیکن میرزا صاحب کیونکہ تصنیف وتالیف سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے، تو اُن کی کسی تحریر سے تو حوالہ نہیں دیا جا سکتا لیکن زبانی معلومات کے اعتبار سے وہ جوش صاحب کی نسبت سے خود ایک چلتی پھرتی یادوں کی برات تھے، اُن سے بہت سی باتوں کا پتہ چلا۔

جناب منور عباس (ایڈووکیٹ) کئی امور سے باخبر تھے اُن کے گھر (بی۔۲۴، بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا) پر انجمن آرزؤ کی منعقدہ نشستوں میں جوش صاحب پابندی سے آیا کرتے تھے اور پھر اُن کے دفتر (سٹی کورٹ) کی ہفتہ وار بیٹھکوں میں جوش صاحب کی باقاعدہ شرکت بھی ہوا کرتی تھی، اُن سے بھی معلومات میں اضافہ ہوا لیکن یادوں کی برات کے بارے میں اِن دونوں حضرات کی معلومات کا دامن وسیع ہونے پر بھی اتنا وسیع نہیں تھا جس میں راغب مرادآبادی کو ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

جوش صاحب کے حلقۂ احباب میں خورشید علی خاں صاحب کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے اُن کے بارے میں اگرچہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی رائے یہ ہے کہ وہ بجا طور پر جوش ملیح آبادی کے پاکستانی دور کے نفسِ ناطقہ ہیں ☆۱ لیکن خورشید علی خاں بقول خود انہی کے ۱۹۶۹ء کے آخری مہینوں میں جوش صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل ہوئے تھے ☆۲، اور یہ وہ وقت ہے جب یادوں کی برات کتابت کے آخری مراحل میں تھی اس لئے وہ جوش صاحب کی خودنوشت کے حوالے سے باخبر راوی نہیں کہے جاسکتے۔ یہ امتیاز صرف راغب صاحب کو حاصل رہا کہ وہ جوش صاحب کی خلوت وجلوت دونوں صحبتوں کے تعلق سے یادوں کی برات کے نہاں وعیاں معاملات کے بڑے گواہ و راز داں تھے____ جوش صاحب کے تعلق سے اگرچہ ایسی ان گنت باتیں اور زندگی کے ایسے بہت سے پہلو ہیں جن کے بارے میں راغب صاحب سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے لیکن ان سب کے باوجود اس سے بھی انکار نہیں کہ یادوں کی برات پر تحقیق کے مسافر کو ان سے رجوع کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ صحیح سمت کے تعین کا انحصار محقق کی نگاہ پر ہوگا۔ میں اکثر وبیشتر جوش صاحب کے سلسلے میں ان

☆____ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۳۶۳

☆۱____ مقدمہ، ہمارے جوش صاحب، خورشید علی خاں، ذیشان کتاب گھر کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۵

☆۲____ ایضاً، ص: ۷۸

سے رجوع کرتا رہا ہوں۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اصل مسودات کیسے دیکھے جائیں، اور، یادوں کی برات کے قلمی نسخے تک دسترس کیسے ہو، کراچی میں اُن کی صاحبزادی سعیدہ خاتون سے ایک بار یہ بات میں نے سنی تھی کہ اُن کی خودنوشت کا اصل مسودہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا راغب صاحب نے مختلف وقتوں میں جو مختلف باتیں بتائیں وہ کچھ یوں تھیں:

"___ جوش صاحب ۱۹۷۲ء میں اسلام آباد چلے گئے تھے تو وہ ایک صندوق میں اپنی کتابیں اور مسودات وغیرہ بھی لے گئے تھے ___ خدشہ یہی ہے کہ کچھ بیاضیں کراچی میں رہ گئی تھیں ___
یہ بھی ممکن ہے کہ یادوں کی برات کا مسودہ اُن کے گھر ہی کے کسی فرد کے پاس ہو، کوئی دوسرا تو گھر سے اُٹھا کر نہیں لے جائے گا ___ اس مسودے کے بارے میں وہ فکر مند ضرور تھے، میں نے شمس زبیری اور خورشید علی خاں سے بھی پوچھا لیکن کوئی اطلاع نہیں ملی ___ وہ اسلام آباد میں بیٹھ کر جو کام کر رہے تھے اُن میں ایک یادوں کی برات کے آئندہ کے ایڈیشن میں اضافے کرنا بھی تھا اور قلمی مسودہ انہیں نہیں مل رہا تھا ___ منور عباس اور میرزا عالمگیر قدر بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے ___"

جوش صاحب کے نواسے خسرو شہاب نے میرے استفسار پر ایک بار یہ کہا تھا کہ:

"___ یادوں کی برات چھپنے کے کچھ عرصے بعد میں نے بابا کو یہ کہتے سنا تھا کہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا خودنوشت کا مسودہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا ___"

میں خود جوش صاحب کی وفات سے تقریباً ۸ ماہ قبل ۲۷ جون ۱۹۸۱ء کو اسلام آباد میں ان سے ملا☆ وہ بیمار تھے، اُن کی قوتِ سماعت بھی کمزور ہو چکی تھی پھر بھی ان سے جو چند باتیں ہوئیں ان سے یہی پتہ چلا کہ یادوں کی برات کا مسودہ ان کے پاس نہیں ہے۔ جوش صاحب کے قلمی نوادرات کی دستیابی کے لیے میرے سامنے تین ایسے ذرائع تھے، جن تک میری رسائی بھی تھی۔

ا ___ ایک ذریعہ تو وہ لوگ تھے جنہیں جوش صاحب اپنے قابلِ ذکر احباب میں شمار کرتے تھے اور جو اُن کے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ راغب مرادآبادی، خورشید علی خاں، میرزا عالمگیر قدر، پروفیسر مجتبیٰ حسین، صابر تھاریانی، منور عباس، راز مرادآبادی اور اسی تعلق خاطر کے بعض دوسرے احباب! یہاں بدراللہ آبادی، رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

☆ افکار بیادِ جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء۔ ص: ۶۹

۲___ دوسرے وہ اشخاص جنہیں جوش صاحب کے خصوصی حلقۂ احباب میں تو شامل نہیں کیا جائے گا لیکن انہیں جوش صاحب سے کوئی نہ کوئی نسبت ضرور رہی۔ ترقی اردو بورڈ کے تعلق سے نسیم امروہوی، شان الحق حقی اور کراچی میں نو تصنیف مرثیوں کی مجالس کے اہتمام کے رشتے سے ڈاکٹر یاور عباس، اختر نقوی، محمود علی نانبجیانی اور اسی طرح کے افراد کہے جائیں گے۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے بعض ایسے سینئر پروڈیوسر جن کے پاس جوش صاحب کبھی کبھی ریکارڈنگ کے لیے جایا کرتے تھے وہ بھی اسی حلقے میں شامل ہیں۔

۳___ تیسرا ذریعہ خاندانِ جوش ہے، جس میں سب سے پہلا نام اُن کی اہلیہ اشرف جہاں بیگم کا لینا چاہیے۔ تذکرہ نگار تو اُن کا نام تک نہیں لیتے لیکن خود جوش صاحب یہ کہتے ہیں:

'___ ایک روز، انہوں نے مجھے کمرے میں بلا کر ایک بکس دکھایا اور کہا بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے کیا معلوم، انہوں نے پوچھا تم کب سے شعر کہہ رہے ہو، میں نے کہا لڑکپن سے، انہوں نے کہا وہ پرچے اور کاپیاں کیا کیں جس پر تم نے شعر کہے تھے، میں نے کہا سب کی سب تلف ہو گئیں میری یہ بات سن کر انہوں نے وہ بکس کھول کر کہا دیکھو میں نے تمہاری ایک ایک کاپی اور تمہارا ایک ایک پرچہ اس بکس میں محفوظ کر لیا ہے اب تم یہ کاپیاں ممتاز حسن صاحب کے قومی عجائب گھر کے ہات فروخت کر دو اور میں نے وہ کاپیاں ۱۵ ہزار روپے میں فروخت کر دیں___'

"___ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے، ٹھیل ٹھیل کر، مجھے مجبور کیا میری سب سے پہلی تصنیف 'روحِ ادب' کے مرتب اور شائع کرانے پر، اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر مسلط ہو ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کرائیں اور چھپوائیں۔ اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرضِ وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ روحِ ادب، جذباتِ فطرت، خیالاتِ زرّیں☆، اوراقِ سحر، آوازۂ حق، شاعر کی راتیں، شعلہ و شبنم، حرف و حکایت، جنون و حکمت، آیات و نغمات، سیف و سبو، فکر و نشاط، سرود و خروش، حسین اور انقلاب، اشارات، سنبل و سلاسل، رامش و رنگ، عرش و فرش، سموم و صبا، قطرہ و قلزم، طلوعِ فکر، نجوم و جواہر اور الہام و افکار۔ اور میری یہ زیرِ نظر کتاب 'یادوں کی برات' بھی انہی کی مرہونِ منت ہے اگر وہ میرے سر پر سوار نہ ہو جاتیں تو میں اسے بھی مرتب نہ کر سکتا☆۱___"

☆___ جوش صاحب سے یہاں سہو ہوا ہے کتاب کا نام خیالاتِ زرّیں نہیں مقالاتِ زرّیں ہے۔

☆۱___ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی، کراچی ۱۹۷۰ء ص:۳۸۶

جوش صاحب کی اہلیہ کے بعد اُن کی آل واولاد کے افراد بھی اس ضمن میں اہم ترین ذریعہ ہیں۔ خصوصاً جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد حیدر خروش، ان کی صاحبزادیاں ساجدہ خاتون، تبسم اخلاق، جوش صاحب کی صاحبزادی سعیدہ خاتون ان کے بیٹوں میں پرویز شہاب، خسرو شہاب، سراج انور، فرخ جمال، بیٹی صبوحی اوران کے صاحبزادے انجم ناصر، کلیم ناصر اور خاندانِ جوش کے سلسلے سے کچھ اور نام بھی قابلِ ذکر ہیں مختصر یہ کہ ان کے افرادِ خاندان سے لے کر اُن کے حلقۂ احباب تک سب ہی تحقیقی معاونت کا کوئی نہ کوئی دریچہ ضرور کشادہ رکھتے ہیں☆

جوش صاحب کے قلمی نوادرات اور نایاب تحریروں کے متعلق میری معلومات میں اس وقت اضافے کی کئی صورتیں پیدا ہو گئیں جب جوش صاحب کی نواسی صبوحی خاتون جنہیں جوش صاحب، پیار و محبت سے 'بوئی چوئی' کہا کرتے تھے۔ میرے گھر کے قریب، میرے ہی محلے میں فیڈرل بی ایریا کے بلاک ۹ میں آ کر آباد ہو گئیں۔ ان کے صاحبزادوں میں انجم اور کلیم جو جوش صاحب کے پرنواسے ہوئے ان سے میری روز کی ملاقات ہونے لگی۔ ان دونوں بھائیوں خصوصاً کلیم ناصر سے جوش صاحب کے نوادرات و قلمی تحریروں کے متعلق مجھے کئی باتوں کا علم ہوا۔ صبوحی خاتون کے گھر ان کے بھائیوں کی بھی آمد و رفت رہا کرتی تھی ایک روز ان کے بھائی (جوش صاحب کے تیسرے نواسے) پرویز شہاب اپنے بھانجے کلیم کے ساتھ مجھ سے ملنے میرے گھر تشریف لائے اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ اُن کے پاس یادوں کی برات کا قلمی نسخہ ہے جو انہیں کسی سے دستیاب ہوا۔ میں نے پوچھا کہ یہ 'کسی' کون ہے؟ انہوں نے اس راز سے پردہ ہٹانا نہیں چاہا میں نے بھی زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھا! ان کی خواہش تھی کہ اگر حکومت یا کوئی ادبی ادارہ تعاون کرے تو وہ قلمی نسخہ اس کے سپرد کرنے کو آمادہ ہیں۔ میری آرزو تو یہی تھی کہ وہ یہ نسخہ مجھے دے دیں لیکن وہ کسی صاحب ثروت ناشر ہی کو دینا چاہتے تھے__

☆ ___ خورشید علی خاں صاحب نے اپنی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' میں جوش صاحب کے جس حلقۂ احباب کا تذکرہ کیا ہے اُس میں بھی بعض احباب ایسے تھے، اور ہیں جن سے جوش صاحب کے شعری ونثری نوادرات کی معلومات بآسانی میسر آتی رہیں۔ خورشید علی خاں صاحب نے لکھا ہے کہ:

''میرے سامنے جو اصحاب زیادہ تر جوش صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور جن کے نام اس وقت مجھے یاد ہیں اُن میں راغب مرادآبادی، سردار بارہ بنکوی، فراست رضوی، سرور اقبال، راز مرادآبادی، سلامت علی خاں، ڈاکٹر عالیہ امام، مرزا عالمگیر قدر، منور عباس ایڈووکیٹ، ڈاکٹر یاور عباس، پروفیسر منظور حسین شور علیگ، ریاض مصطفےٰ اور اُن کے بھائی فیاض مصطفےٰ تھے۔ ہماری محفلوں میں اکثر ایک نوجوان شاعر اور محقق ہلال نقوی بھی شریک ہوتے تھے جو جوش صاحب کے مراثی پر تحقیق کر رہے تھے اور جوش صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے'' (ہمارے جوش صاحب، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص: ۸۲/۸۳)

جوش صاحب کے نواسوں میں پرویز اور خسرو اُن کے ساتھ اسلام آباد میں رہے لیکن بیشتر وقت پرویز شہاب ہی نے اُن کے ساتھ گزارا۔ جوش صاحب کی سرکار سے انہیں مسٹر پرپر، مسٹر باٹا، پری اور وحشت کا چٹوغا خطابات عطا ہوئے تھے☆، انہوں نے جوش صاحب کا خیال بھی رکھا، خدمت بھی کی۔ اسلام آباد میں جوش صاحب کی غیر مطبوعہ تحریروں کے اثاثے کے متعلق اُن کی معلومات شاید سب سے زیادہ تھیں ____! اس ملاقات کے بعد وہ کراچی سے پھر اسلام آباد چلے گئے۔ کلیم کے ذریعے اُن سے رابطہ بھی ہوا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ اور میرا اضطراب اپنی جگہ باقی رہا۔ اسی اثنا میں کلیم نے مجھے ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب 'روحِ اقبال' کا وہ نسخہ لاکر دیا جس پر جوش صاحب کے متعدد حواشی تھے اور جس کا تذکرہ جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک مضمون ☆۱، میں کیا ہے۔

یادوں کی برات کے قلمی نسخے کی تلاش وحصول کی تگ ودو کے اسی زمانے میں مجھے علی معظم اور سراج انور سے یہ اطلاع ملی کہ ان کے بھائی پرویز شہاب (مئی ۱۹۹۶ء میں) کراچی میں انتقال کر گئے ____، اُن کے یوں اچانک گزر جانے کا سن کر بہت اذیت ہوئی، دوسرے یہ دکھ میرے لیے اس وجہ سے بھی تکلیف دہ تھا کہ پرویز شہاب جوش صاحب کی زندگی کے آخری برسوں کے، درجنوں واقعات کے عینی شاہد اور راوی تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جب وہ میرے گھر تشریف لائے تھے تو میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ آپ اپنے بابا (نانا) کی زندگی کے روز وشب پر کچھ لکھ دیجئے اُن کا کہنا یہ تھا کہ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے ایک تفصیلی انٹرویو کر لیجئے ____ اس

☆ ____ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی۔ ۱۹۷۰ء، ص: ۳۹۱

☆۱ ____ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب 'روحِ اقبال' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی ایک جلد جگن ناتھ آزاد کو تبصرے کے لیے دی گئی۔ جگن ناتھ نے اس کا ذکر جوش صاحب سے کیا جو اس وقت دلّی میں رہ رہے تھے، جوش صاحب نے ان سے یہ کتاب پڑھنے کے لیے مانگ لی۔ جگن ناتھ آزاد کا کہنا ہے کہ جوش صاحب نے اس کو پوری توجہ سے نہ صرف یہ کہ پڑھا بلکہ جا بجا حواشی سے اسے پُر کردیا ____ ماہنامہ آجکل، دلّی کے جوش نمبر (اپریل ۱۹۹۵ء) میں اُن کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ:

> "____ اب اتنی مدت کے بعد مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ 'روحِ اقبال' پر انہوں نے جو حواشی لکھے تھے ان کی تفصیل کیا تھی، لیکن اتنا یاد ہے کہ کتاب کا کوئی صفحہ حواشی سے خالی نہیں تھا یہ حواشی والی کتاب مجھ سے میرے دوست محمد طفیل 'مدیر نقوش، نے لے لی تھی، معلوم نہیں اس وقت اُن کے پاس محفوظ ہے یا کہیں گم ہوگئی ____" (مضمون، جوش صاحب، ص: ۱۹)

تلاشِ بسیار کے بعد یہ نادر و نایاب نسخہ جوش صاحب کے پرنواسے کلیم ناصر سے مجھے ۱۹۹۳ء میں مل گیا تھا جسے عنقریب اشاعت کے لیے پیش کردیا جائے گا۔

سانحے کی اطلاع پر میں نے ان کی بہن صبوحی خاتون سے تعزیت بھی کی اور یہ گزارش بھی کہ مرحوم پرویز شہاب کے پاس یادوں کی برات کا جو قلمی نسخہ تھا اس ذیل میں وہ میری کیا مدد کرسکتی ہیں ____ کچھ دنوں بعد انہوں نے اپنے ایک صاحبزادے کے توسط سے مجھے بلوایا اور یہ ان کی ادب پروری اور جوش شناسی ہی کی ایک روشن کڑی تھی کہ انہوں نے کسی 'حجت' کے بغیر انتہائی خلوص سے یہ گمشدہ قلمی نسخہ مجھے عطا کردیا۔☆

قلمی نسخے کا تعارف

۶ رانچ چوڑائی اور تقریباً پونے آٹھ انچ لمبائی پر مشتمل صفحات کی ایسی کاپیوں پر یہ خودنوشت لکھی ہوئی ہے جو عموماً اسکول کے طالب علموں کے استعمال میں رہتی ہیں۔☆۱ ان کاپیوں پر جوش صاحب نے شاید اپنی سہولت، اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ اتنی کثیر تعداد میں جو صفحات ہیں وہ خلط ملط نہ ہوجائیں، کچھ نمبر قائم کیے ہیں، جن کی ترتیب کچھ اس طرح ہے:

کاپی نمبر ۱ ____ صفحات، ۱ __ ۱۵۸، (ابتدائی باتیں سے گاؤں کا پہلا نظارہ تک)
کاپی نمبر ۲ ____ صفحات، ۱۵۹ __ ۲۹۶، (طلوع سحر کا دوسرا دیدار سے سچا خواب تک)
کاپی نمبر ۲، الف ____ صفحات، ۲۹۷ __ ۳۷۰، (میرے نکاح کی تنسیخ کا مقدمہ سے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پہلی بار میری شرکت تک)
کاپی نمبر ۳ ____ صفحات، ۳۷۱ __ ۴۵۶، (مہاتما گاندھی سے پہلی ملاقات سے دھول پور کی روانگی تک)
کاپی نمبر ۳، الف ____ صفحات، ۵۲۶ __ ۶۲۳، (پاکستانی شہریت سے ستم بالائے ستم تک)
کاپی نمبر ۴، الف ____ صفحات، ۶۲۴ __ ۸۹۱، ____ (میرے قابلِ ذکر احباب،

☆ ____ شاید انہیں مجھ سے یہ امید تھی کہ میں جوش صاحب پر کچھ بہتر کام کرنے کی استطاعت رکھتا ہوں۔

☆۱ ____ اسکول کے بچوں والی کاپی کا ذکر روزنامہ حریت کراچی کے سابق ایڈیٹر انور خلیل نے بھی جوش صاحب سے لیے جانے والے ایک انٹرویو کے تمہیدی پیراگراف میں کیا ہے۔ صہبا لکھنوی نے افکار کے بیادِ جوش نمبر (جولائی ۱۹۸۲ء) میں اس انٹرویو کو شائع کرتے ہوئے ایک نوٹ میں لکھا ہے کہ یہ انٹرویو انور خلیل نے افکار کے جوش نمبر (۱۹۶۱ء) کی اشاعت کے کچھ عرصے بعد اُن سے لیا تھا انور خلیل کی تحریر سے اقتباس یہ ہے ____ 'جب میں پہلی مرتبہ اُن کے دولت خانے پر گیا تو وہ اپنی خواب گاہ میں یادوں کی برات سجائے بیٹھے تھے۔ ایک بہت چھوٹی میز کے پیچھے بہت بڑے جوش صاحب کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوا، وہ آستین والی بنیان اور بہت اُجلا پاجامہ پہنے کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور اُن کے سامنے اسکول کے بچوں والی کاپی کھلی ہوئی تھی ____' (ص:۸۵)

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی سے کنور مہندر سنگھ بیدی تک)

کاپی نمبر ۵ ـــ ۸۹۲ ـــ ۱۱۰۳، (پنڈت جواہر لال نہرو سے دیانرائن نگم تک)

کاپی نمبر ۵، الف ـــ (اس کاپی میں صفحات موجود نہیں ہیں اور اس کاپی کا گتے والا حصہ کاپی نمبر ۵ میں رکھا ہوا ملا)

کاپی نمبر ۶ ـــ صفحات، ۱۲۲۱ ـــ ۱۳۲۰، (میرے دور کی چند عجیب ہستیاں)

کاپی نمبر ۷ ـــ صفحات، ۱۳۲۱ ـــ ۱۴۳۰، (میرا خاندان)

کاپی نمبر ۸ ـــ (صفحات پر نمبر لکھے ہوئے نہیں ہیں اس کاپی میں جو صفحات ہیں وہ بغیر کسی ترتیب کے رکھے ہوئے ہیں اور جو تذکرے ہیں وہ ان عنوانات کے تحت ہیں۔ میرے دادا، میری ماں، میرے باپ، ـــ رابندر ناتھ ٹیگور، حکیم مخمور، ان کے ساتھ کچھ صفحات میں اُس دور کے سیاسی حالات اور مہاتما گاندھی کا بھی کچھ تذکرہ ہے)

ان کاپیوں کی جلد کے پہلے گتے پر جو نمبر لکھے ہیں وہ جوش صاحب ہی کے لکھے ہوئے ہیں لیکن دو تین کاپیوں پر نمبروں میں اُن کا خط نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ جوش صاحب نے کسی اور سے (شاید اپنے نواسے، نواسی، پوتے پوتی یا راغب مراد آبادی سے) یہ نمبر ڈلوائے ہیں۔ پہلی، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کاپی کے علاوہ دیگر نمبروں کی کاپیوں پر حصہ الف بھی قائم کیا ہے۔

جوش صاحب نے جن صفحات پر اپنی روداد لکھی ہے وہ کم گرام کے 'نیوز پرنٹ' کاغذات ہیں روشنائی بھی نیلے رنگ کی ہے، (چند صفحات کی روشنائی کالی بھی ہے) ان پر لکھے ہوئے لفظوں کی عمر بھی تقریباً نصف صدی کے قریب ہو رہی ہے، چنانچہ اس کی خستگی اور شکستگی اور الفاظ کے مدہم خدوخال محقق کے لیے مشکلات کا باعث بھی ہیں ـــ یہ مسودہ تقریباً ۱۸ سال سے میرے پاس ہے۔ مطبوعہ یادوں کی برات سے، اس نسخے کے تقابلی مطالعے نے یکسر ایک نئی فضا تعمیر کی لیکن ان حقائق، کو کتابی شکل دینا میرے نزدیک ابھی قبل از وقت تھا۔ اور وہ صرف اس وجہ سے کہ اس قلمی نسخے میں چار مقامات ایسے ہیں جہاں سے صفحات غائب ہیں وہ مل جائیں تو بات آگے بڑھے۔ جوش صاحب کے لکھے ہوئے جو صفحات میری تحویل میں ہیں وہ صفحہ نمبر ۱، سے شروع ہوتے ہیں، آخری صفحہ جو میرے پاس ہے اس کا نمبر ۱۴۳۰ ہے۔ جو صفحات اس نسخے میں نہیں ہیں ان کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

۱ ـــ صفحہ نمبر ۲۷ سے ۶۴ تک، ۳۸ صفحات کی کوئی اطلاع نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ اس میں جوش صاحب نے انسان دوستی، اپنی ولادت و وطن، ملیح آباد کی حویلی کے ماحول اور اپنی شخصیت کے ان پہلوؤں کو لکھا ہے جس سے وہ اپنے لئے مجموعۂ اضداد، کے لفظ لکھتے ہیں۔

۲____ صفحہ نمبر ۲۵۶ سے ۲۸۲ تک جو ۲۷ صفحات ہیں اُن کی بھی کچھ خبر نہیں کہ اب یہ کس کے پاس ہیں۔ ان صفحات پر ایم اے او کالج (علی گڑھ) میں جوش صاحب نے اپنا داخلہ اور لکھنؤ میں دوسری آمد سے پہلے کی باتیں اور واقعات قلم بند کیے تھے۔

۳____ بہت زیادہ صفحات جس حصے کے غائب تھے وہ 'میرے چند قابل ذکر احباب' کا حصہ ہے قلمی نسخے کے صفحہ نمبر ۶۲۲ سے ۱۳۲۰ تک یعنی تقریباً ۵۷۹ صفحات پر لکھے ہوئے اس باب کے ۲۴۳ صفحات اس قلمی نسخے میں شامل نہیں ہیں۔

۴____ یادوں کی برات کا آخری باب ''میرے معاشقے'' بھی سرے سے اس مسودے میں موجود ہی نہیں ہے۔ جوش صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا صفحہ، یادوں کی برات کے کتابت شدہ صفحے پر کتنی جگہ لے لیتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرے معاشقے والا گمشدہ باب تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا جس کی تا حال کوئی اطلاع نہیں کہ یہ کس کی تحویل میں ہے۔

یادوں کی برات کے درج بالا وہ چار حصے جن سے صفحات غائب تھے اُن میں پہلا، دوسرا اور چوتھا حصہ تحقیقی اعتبار سے اتنا کٹھن اور پریشان کن نہیں ہے اس لیے کہ اس میں جوش صاحب کی لکھی ہوئی جو بھی تحریریں ہوں گی وہ تمام یادوں کی برات میں کتابت ہو کر شامل ہو چکی ہیں۔ اصل تحقیقی میدان وہ تیسرا حصہ ہے جو 'میرے چند قابل ذکر احباب' سے متعلق ہے انہی اوراق ہی کے گم ہو جانے کا تذکرہ جوش صاحب نے بھی کیا ہے۔ قلمی نسخے کی چھان بین کے بعد ان صفحات کے نمبر اور ترتیب کچھ اس طرح ہے:

۸۶۳__۸۷۱، ۹۱۳__۹۳۹، ۹۷۳__۹۹۱، ۱۰۰۰__۱۰۰۹،

۱۰۲۰__۱۰۳۶، ۱۰۵۰ __۱۰۶۹، ۱۰۷۳__۱۰۷۹، ۱۰۸۳__۱۰۹۹،

۱۱۰۳__۱۱۶۸، ۱۱۷۳__۱۳۱۶۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے مجھے بتایا تھا کہ یادوں کی برات سے کچھ تذکرے نکال دیے گئے تھے۔ انہیں یہ بات کس طرح پتہ چلی تھی، کہا نہیں جا سکتا۔ جب مجھے یہ نسخہ جوش صاحب کی نواسی صبوحی خاتون سے ملا تو ان صفحات کے غائب ہو جانے کے ثبوت اس لئے بھی فراہم ہو گئے کہ ان میں کچھ اوراق ایسے ہیں کہ کسی شخصیت کے تذکرے کا ایک صفحہ تو اس قلمی نسخے میں رہ گیا، باقی صفحات لاپتہ ہو گئے۔ اوپر جن صفحات کے نمبر دیئے گئے ہیں ان کے سلسلے سے یہ پیچیدگیاں زیادہ نظر آئیں۔ مولوی سمیع اللہ (ص:۹۱۱)، ابوالکلام آزاد (ص:۹۹۹)، مے کش اکبرآبادی (ص:۱۰۱۹) اور احسان بن دانش (ص:۱۰۷۳) اسی سلسلے کے نام ہیں جن کا تذکرہ درج کیے گئے ان متعلقہ صفحات نمبر کے بعد منقطع ہو گیا۔

حکیم مخمور (ص: ۷۵۱-۷۵۲)، مرزا جعفر حسین (ص: ۷۵۳-۷۵۴)، دیا نرائن نگم (ص: ۱۱۰۳)،

بنان الدین خاں (ص: ۱۲۶۹-۱۲۷۰)، عبدالرؤف خاں (ص: ۱۲۹۲___۱۲۹۸)، اور ظہور احمد خاں (ص: ۱۳۰۹___۱۳۱۱)، کے مکمل تذکرے لکھے ہوئے ہیں، ان کے صفحات بھی موجود ہیں لیکن یادوں کی برات میں یہ شامل نہیں ہیں۔ پھر خاندان کے بھی کچھ ایسے افراد ہیں جن کے تذکرے قلمی نسخے میں تو ہیں مگر انہیں شامل نہیں کیا گیا۔ میرے بڑے بھائی (ص: ۱۳۳۶-۱۳۳۷)، میرا چھوٹا بھائی (ص: ۱۳۳۸___۱۳۴۱)، اور میری بہنیں (ص: ۱۳۵۲) اسی طرح کے صفحات ہیں۔ ان صفحات کو جوش صاحب نے قلم زد کر دیا تھا۔ آثار بتاتے ہیں کہ وہ اس میں اضافے کرنا چاہتے تھے، یا تو مہلت نہیں ملی یا ممکن ہے وہ اپنے بھائی، بہنوں کے تذکروں میں کسی 'احتیاط' سے کام لے رہے تھے۔

خاندانِ جوش سے گمشدہ اوراق کے بارے میں، میں پوچھتا رہا ہوں۔ راغب صاحب سے بھی ان صفحات کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ انہوں نے 'مکالماتِ جوش و راغب' کے آخری ۳۱ صفحات (۱۲۲ تا ۱۵۲) میں جوش صاحب کی کچھ نایاب تحریریں بھی ان کے عکسِ تحریر میں شائع کر دی تھیں۔ ان آخری ۳۱ صفحات میں ۲ صفحے خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہیں:

۱___ ایک ہے صفحہ نمبر ۱۳۹، اس صفحے کی سرخی ہے "یادوں کی برات کے گم کردہ احباب معاصر و احباب کے نام" لیکن یہ سرخی جوش صاحب کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہے۔ ان کے قلم سے البتہ ۲۶ / افراد کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ جن کے بارے میں وہ لکھ رہے تھے یا لکھنا چاہتے تھے۔

۲___ دوسرا صفحہ، صفحہ نمبر ۱۴۳ ہے 'یادوں کی برات کا ایک ورق' اسی صفحے پر جوش صاحب کی زبانی راغب صاحب کا تذکرہ ہے تحریر البتہ راغب صاحب کی ہے دستخط جوش صاحب کے ہیں اور تاریخ بھی (۱-۱۰-۶۹) جوش صاحب ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

جوش صاحب سے مخصوص ادبی، علمی و تحقیقی جریدے 'جوش شناسی' کا اجراء الفاظ فاؤنڈیشن نے جنوری ۲۰۰۸ء میں کراچی سے کیا۔ دسمبر ۲۰۰۹ء تک اس کے چھ شمارے منظرِ عام پر آ چکے تھے، پھر میری شدید علالت نے سارا کام خراب کر دیا۔ ۲۰۱۱ء میں طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے جوش شناسی کے ساتویں شمارے 'یادوں کی برات نمبر' کا اعلان کر دیا۔ اس سے متعلق مضامین کی جمع آوری کے دوران یہ خیال آیا کہ یادوں کی برات کے قلمی نسخے کے حوالے سے اپنا بھی ایک مقالہ اس یادوں کی برات نمبر میں شامل کر دوں۔ اس قلمی نسخے کے جو صفحات نہیں مل رہے، اُن کا اس قدر انتظار نہیں کیا جا سکتا، زندگی کا کیا اعتبار! علالت و صحت کے مسائل لکھنے پڑھنے کی تمام امنگوں اور تمام خوابوں پر کہیں پانی ہی نہ پھیر دیں۔ چنانچہ یادوں کی برات کے قلمی نسخے سے متعلق جتنا کام اب تک کر چکا تھا اس منتشر کام کو از سرِ نو سمیٹا۔

یادوں کی برات کے کاتب سے گفتگو

مباحث کو حتمی صورت دینے کے دوران ایک ایسا مرحلہ آ گیا جہاں یادوں کی برات کے کاتب سے ملنا بہت ضروری ہو گیا۔ میں نے اشاعت وطباعت کے حلقوں میں ٹیلی فونی رابطے سے یہ معلوم کیا کہ یادوں کی برات کے کاتب اظہر عباس جعفری کا کیا اتا پتا ہے؟ وہ اب کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ اور کس اشاعتی ادارے سے وابستہ ہیں؟ عقیل عباس جعفری اور شکیل عادل زادہ صاحب نے میری مدد کی اور اظہر عباس جعفری صاحب سے میرا رابطہ ہو گیا ــــ اُن سے تفصیلی ملاقات ☆ نے یادوں کی برات کے تعلق سے، میری تحقیق کو ایک نئی سمت سے روشناس کیا۔

یادوں کی برات کا قلمی نسخہ دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ یہی وہ اصل صفحات ہیں جن سے ۴۲ سال پہلے میں نے کتابت کی تھی۔ ان کی پینسل کے کھینچے ہوئے نشانات ان صفحات پر اب بھی واضح تھے۔ انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱ــــ ''شمس زبیری کے ادبی رسالے نقش کا دفتر صدر میں اکبر روڈ پر تھا میں یہیں کتابت کیا کرتا تھا، یہاں جوش صاحب بھی آیا کرتے تھے۔ شمس زبیری صاحب مجھے میر صاحب کہا کرتے تھے جوش صاحب نے بھی میر صاحب کہنا شروع کر دیا۔ یادوں کی برات کی کتابت کا معاملہ، ای، ایف، یو (روشن علی بھیم جی کی انشورنس کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین) سے ۵ یا شاید ۶ روپے صفحہ طے ہوا ــــ''

۲ــــ ''سبطِ حسن صاحب اس کام کے مہتمم اور نگراں تھے۔ میں جوش صاحب سے

☆ ــــ ۲۱ جنوری ۲۰۱۲ء کو اظہر عباس جعفری سے ایک خصوصی ملاقات، سید قمر عباس کے گھر (رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد) پر ہوئی جو کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر، جس کی وزیٹنگ فیکلٹی سے میں وابستہ ہوں، کے تحت 'پاکستانی ادبیات کی ترویج واشاعت میں روزنامہ جنگ کراچی کا کردار' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں ــــ اظہر عباس جعفری کے آباء واجداد پہرسر کے رہنے والے تھے لیکن ان کی ولادت ۱۹۳۹ء میں، گلاب خانہ، آگرہ میں ہوئی، ۲۴ سال کی عمر میں (۱۹۶۳ء) امروہہ کے معروف خوش نویس عین الحسن جری کی شاگردی اختیار کی۔ کراچی کے نامور خوش نویس سید تہذیب حسین اور سید تصویب حسین، جری صاحب ہی کی اولاد ہیں۔ جعفری صاحب نے تہذیب حسین سے بھی فن کتابت سیکھا۔ ابتدائی ملازمت کا سفر اخبار المنتظر سے شروع ہوا۔ امروہہ کے سید وقیع الحسن کے ایما پر اخبار 'انجام' میں آ گئے، اس کے بعد حریت اور پھر شمس زبیری کے ادبی ڈائجسٹ 'نقش' میں ملازمت اختیار کر لی۔ شکیل عادل زادہ انہیں 'سب رنگ' ڈائجسٹ میں لے آئے۔ قیامِ پاکستان کے دو سال بعد (۱۹۴۹ء) سے اب تک ان کا قیام گولیمار نمبر ۲، کراچی (مکان نمبر ۱۹۰۲، محمد آباد) میں ہے۔

کتابت کے لیے نئے صفحات لینے ان کے گھر جایا کرتا تھا کبھی وہ خود بھی نقش کے دفتر آجایا کرتے تھے۔ کتابت کی اُجرت ای ایف یو سے ملا کرتی تھی۔ ۷ یا ۸ ماہ میں اس کی کتابت مکمل ہوئی ___ ''

۳___ ''جوش صاحب اعراب پر، بہت زور دیا کرتے تھے۔ شمس زبیری نے کہا کہ جوش صاحب اسے اردو ہی رہنے دیں عربی نہ بنائیں۔ میں نے بھی اُن سے یہی کہا کہ اس سے اردو عبارت خراب لگنے لگتی ہے، جوش صاحب خاموش ہو گئے ___ ''

۴___ ''کچھ صفحات کی کتابت میں نے امروہہ کے کوثر علی صاحب سے بھی کرائی تھی، پیسٹنگ میں بھی کوثر صاحب نے میرا ہاتھ بٹایا تھا ___ ''

۵___ ''عموماً راغب مراد آبادی اس کے پروف پڑھا کرتے تھے،، میں ان کی بعض باتوں سے مطمئن نہیں ہوا کرتا تھا مگر جوش صاحب کی وجہ سے کچھ نہیں کہتا تھا ___ ''

۶___ ''ایک بار سبط حسن صاحب سے، نہ چاہنے پر بھی، تلخی سی ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ایک موقع پر انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یادوں کی برات میں جوش صاحب نے میرے بارے میں جو ایک دو باتیں لکھی ہیں ان کو آپ نکال دیں ☆ ظاہر ہے مجھے تو یہ اختیار نہیں تھا کہ میں ایسا کروں، بددیانتی ہوتی اگر میں جوش صاحب سے پوچھے بغیر ایسا کرتا، جوش صاحب معصوم آدمی تھے میں انہیں دھوکہ نہیں دے سکتا تھا چنانچہ میں نے اُن سے یہ بات کہہ دی کہ سبطے صاحب ایسا کہہ رہے ہیں، جوش صاحب نے کہا کہ کتاب میری ہے یا اُن کی، میں چپ ہو گیا، سبطے صاحب مجھ سے اتنا خفا تھے کہ جب یادوں کی برات چھپ گئی تو انہوں نے مجھے نہیں دی، جوش صاحب ہی نے مجھے کتاب دی ___ مجھ سے تو وہ اس حد تک ناراض ہو گئے تھے کہ مجھے اپنی کتابت کے بلوں کی ادائیگی میں بہت دقت پیش آنے لگی۔ پروفیسر کرار حسین کے صاحبزادے جوہر حسین نے جو وہاں پی آر او تھے بآسانی میرے بل ادا کروا دیے تھے ___ ''

☆___ سبط حسن صاحب اپنے بارے میں لکھے ہوئے جن فقروں پر جوش صاحب سے ناخوش تھے وہ یہ ہیں:

''___ وہ بڑے حسین تھے اور فراق نے انہیں غور سے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ سبطے بڑا خراب آدمی ہے۔ اور جب میں نے کہا کہ تم اتنے پیارے انسان کو خراب آدمی کہہ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا تھا، تم اس کی پیشانی کو نہیں دیکھ رہے ہو جس پر یہ خط جلی درج ہے کہ میں ہم آغوشی کا موقع کبھی نہیں دوں گا ___ ''

(یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۵۷۶)

اظہر عباس جعفری سے میں نے جب اے ڈی نقوی اور مجاز کا ذکر کیا اور یہ پوچھا کہ اُن کا تذکرہ تو جوش صاحب نے بعد میں لکھا تھا اس بارے میں آپ کی اطلاع کیا ہے۔ انہوں نے بتایا:

___ ''اے ڈی نقوی کے تذکرے کے صفحات مجھے نہیں ملے تھے اور نہ ہی میں نے مجاز کے صفحات کی کتابت کی، یہ کتابت شاید کسی اور سے کرائی گئی تھی ___''

یہاں میری اس اطلاع کی تصدیق ہو جاتی ہے جو مجھے بزرگ خوشنویس سید تہذیب حسین نے دی تھی کہ اے ڈی نقوی اور مجاز کے تذکرے پر مشتمل صفحات کی کتابت انہوں نے کی تھی، مجھے راغب صاحب کی بتائی ہوئی اس بات میں بھی بہت وزن لگتا ہے کہ کتابت ہوئی تو اسرار الحق مجاز کا تذکرہ چار صفحوں اور اے ڈی نقوی کا دو صفحات پر آیا۔
گنجائش صرف چار صفحوں کی تھی، چھ کی نہیں تھی۔ سبطے صاحب نے مجاز کا تذکرہ شامل کرنے پر زور دیا مجاز کے تذکرے کی کتابت کیونکہ چار صفحوں پر ہوئی تھی اور اس کے شامل ہونے سے شمس زبیری (ایک صفحہ)، منور عباس (دو صفحے) اور خود سبطِ حسن (ایک صفحہ) کے تذکرے کے صفحات لازماً وہاں سے ہٹانا پڑتے، اور پھر ایسا ہی ہوا سبطے صاحب چاہتے بھی یہی تھے☆۔

یادوں کی برات کے کاتب کہتے ہیں
غیر مطبوعہ اور قلم زد صفحات کی کاپی جوش صاحب نے مجھے دے دی تھی

اس تحقیقی سفر میں جو سوال اہم تھا وہ یہ تھا کہ اس نسخے کے وہ صفحات کہاں غائب ہو گئے جن میں جوش صاحب نے اپنے متعدد احباب کا تذکرہ کیا تھا اور وہ شائع کیوں نہیں ہو سکے۔ راغب صاحب اس ذیل میں یہ تو بتاتے تھے کہ جوش صاحب کے قابلِ ذکر احباب کے تذکرے پر مشتمل صفحات کتابت کے لئے گئے تو تھے۔ کاتب نے بھی یہ بتایا کہ میں نے جگر مراد آبادی اور کچھ دوسرے احباب کے تذکرے کتابت کیے تھے۔ مگر یہ تذکرے یادوں کی برات میں نہیں ہیں۔

☆ ___ سبطِ حسن صاحب کو میں نے کراچی میں کئی بار دیکھا اور ایک دو سیمینار میں انہیں سنا بھی لیکن اُن سے ملاقات کی صورت کبھی پیدا نہیں ہو سکی۔
پروفیسر مجتبیٰ حسین کے تنقیدی مجموعے 'نیم رخ' کی رسم اجراء کی تقریب (غالباً ۱۹۸۵ء میں) آرٹس کونسل کراچی میں سبطے صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔ میں ان سے یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن میں ردّ و بدل کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر اُن سے براہ راست بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

[illegible]

۸۳۸ سے ۸۶۸ تک

۸۷۲ سے ۹۱۰ تک

۹۵۱ سے ۹۶۳ تک

۹۹۲ سے ۹۹۸ تک

۱۰۱۰ سے ۱۰۱۸ تک

[illegible] ۱۰۳۳ سے ۱۰۳۶ تک

۱۰۴۷ سے ۱۰۵۴ تک

۱۰۶۹ سے ۱۰۷۲ تک

۱۱۰۱ سے ۱۱۰۲ تک

۱۲۷۱ سے ۱۲۸۲ تک

۸۶۲

یادوں کی برات کی کتابت کے دوران جوش صاحب نے بعض صفحات کی کتابت رکوادی تھی۔ یہ وہ صفحہ ہے، جس پر انہوں نے کاتب اطہر عباس جعفری کو یہ ہدایت کی ہے کہ صرف ان صفحات کی کتابت کی جائے جن کی انہوں نے نشان دہی کی ہے

بقول راغب صاحب، سبطے صاحب اخراجات کو اور بڑھانے کے حق میں نہیں تھے یہ اطلاع جوش صاحب تک پہنچ گئی تھی جس سے ان کی طبیعت بہت مکدر ہوئی۔ یادوں کی برات کے کاتب نے مجھے بتایا:

"____ تذکرۂ احباب کی کتابت میں کر رہا تھا کہ جوش صاحب نے کی ایک پرچہ مجھے بھیجا کہ فلاں صفحات کی کتابت کیجئے فلاں کی نہ کیجئے۔ میرا کام تو یہی تھا کہ جس کتابت کے لیے وہ کہیں میں وہ کروں، مجھے یہ اختیار تو نہیں تھا کہ میں اُن سے پوچھوں کہ وہ ان صفحات کی کتابت کیوں رکوار ہے ہیں، لیکن اُن سے ایک تعلق قائم ہو گیا تھا کہ میں بے تکلفی سے یہ بات پوچھ بھی سکتا تھا چنانچہ ایک روز میں اُن کے گھر چلا گیا اور میں نے ان سے یہ پوچھ ہی لیا____ ان سے بات ہوئی تو مجھے یہ تاثر ملا کہ کتاب کی ضخامت کے خدشے کے پیش نظر (اور شاید سبطِ حسن صاحب کے کہنے سے) وہ احباب والے باب کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے تھے____ اس لیے انہوں نے وہ تمام صفحات قلم زد کردیے تھے____"

میں نے پوچھا کہ آپ کو تو وہ ایک پرچے پر یہ لکھ کر دے چکے تھے کہ کن صفحات کی کتابت کرنا ہے، تو پھر آپ کا مشاہدہ کیا تھا کہ جو صفحات انہوں نے اتنی محنت و ریاضت سے لکھے تھے تو، اچانک انہیں قلم زد کیوں کر دیا۔

"____ میرے خیال میں شاید اس احتیاط کے پیش نظر کہ کتابت کے وقت یہ مغالطہ نہ ہو کہ کس تذکرے کو لینا ہے اور کس کو نہیں لینا۔ اور اب مجھے جب یہ یقین ہو چلا کہ جوش صاحب ان قلم زد صفحات کو شامل ہی نہیں کر رہے ہے تو یہ بھی خدشہ ہوا کہ کہیں یہ اِدھر اُدھر ہو کر ضائع نہ ہو جائیں (جوش صاحب اپنی تحریروں کو کبھی احتیاط سے نہیں رکھتے تھے) تو میں نے مودبانہ گزارش کی کہ جوش صاحب اگر نامناسب نہ ہو تو یہ کاپی مجھے عنایت فرما دیجئے۔ میں آپ کی تحریر سے آراستہ ان صفحات کو یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔ انہوں نے بلا کسی تکلف کے وہ کاپی مجھے دے دی۔ جس میں کم از کم ۲۰۰ سے زیادہ صفحات تو تھے ہی۔ میں جوش صاحب کی دریا دلی و فیاضی پر حیران بھی ہوا لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ شاید کتاب کی ضخامت پر قدغن کی وجہ سے بددل ہو چکے تھے____"

مگر وہ صفحات اور وہ کاپی ہے کہاں!____ میں نے بہت بے چینی سے اُن سے دریافت کیا انہوں نے بہت بجھے ہوئے لہجے میں مجھے بتایا کہ:

"____ سب رنگ ڈائجسٹ کے دفتر میں، جہاں میں کتابت کیا کرتا تھا، وہاں میں نے اپنے کاغذات کے ساتھ ہی اسے رکھ لیا تھا، دو چار بار اسے دیکھا بھی پھر جب ایک موقع پر میں اپنے کاغذات درست کر رہا تھا تو یہ کاپی مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ دفتر کا ایک

ایک گوشہ دیکھ لیا احتیاطاً گھر بھی چھان مارا، نا امیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا ___ '

اظہر عباس جعفری صاحب سے میں نے کہا کہ آپ ۱۹۷۰ء کی بات کر رہے ہیں جب بقول آپ کے جوش صاحب نے اپنی مرضی سے یہ اوراق آپ کو دے دیے تھے لیکن اس کے دس سال بعد ۱۹۸۰ء میں جوش صاحب مجھے لکھتے ہیں کہ کتاب چھپنے گئی تو اس کے بعض تذکرے کوئی لے اُڑا۔ تو میں آپ سے اگر دوٹوک یہ کہوں کہ کل اگر کوئی محقق یہ کہے کہ جوش صاحب نے یہ اوراق دیے نہیں تھے کاتب صاحب خود ہی لے گئے ہوں گے تو آپ کے پاس اپنی صفائی میں کیا دلیل ہوگی۔ انہوں نے کہا ایک تو یہ کہ کراچی کے کتابت کے حلقوں میں لوگ میرے کردار سے واقف ہیں دوسرا یہ کہ اگر یہ میں خود لے جاتا اور پھر یہ غائب بھی ہو گئے تو میں یہ تذکرہ آپ سے کرتا ہی کیوں۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کے ذہن سے بہت سی باتیں نکل گئی ہیں۔

کیا واقعی معاملہ اُلجھا ہوا ہے؟

جوش صاحب کے ذہن میں یقیناً بہت سی باتیں نہیں رہیں یہ تو انہوں نے ۱۹۸۰ء میں کہا کہ یادوں کی برات کے تذکرے کوئی لے اُڑا۔ ۴ر اپریل ۱۹۷۱ء کو راغب صاحب اُن سے جو بات کر رہے تھے اُسے دیکھیے:

> " ___ یادوں کی برات میں آپ نے ایک باب اپنے دورِ ثالث کے احباب کے لیے مختص کیا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی لیکن آپ نے ایک بار خاکسار سے کہا تھا ، شمس زبیری نے احباب کا حصہ کا پیاں جوڑتے وقت شاملِ کتاب نہیں کیا البتہ اپنا اور سید سبطِ حسن کا تذکرہ رہنے دیا۔ جب کتاب کا پہلا نسخہ مجھے آپ نے دکھایا تو اس میں شمس زبیری، سید سبطِ حسن اور جناب منور عباس، شہاب کا ذکر موجود تھا۔ جب کتاب مارکٹ میں فروخت ہونے کے لیے آئی تو سید سبطِ حسن، شمس زبیری اور منور عباس شہاب کا تذکرہ بھی غائب تھا اور اس کی جگہ مصطفےٰ زیدی ☆ (مرحوم ہو گئے) اور مجاز کا ذکر تھا۔ یہ ردوبدل کیا آپ کے حسبِ منشا کیا گیا یا شمس زبیری صاحب نے کیا جن کے دفتر میں ان کے کاتب صاحب اس کتاب کی کتابت کرتے رہے ہیں ___ "

جوش صاحب نے جواب دیا: ___ معاملہ اُلجھا ہوا ہے میں پوری تفصیل سے کیا کہوں ___ ☆۱

☆ ___ مصطفےٰ زیدی کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے راغب صاحب سے کہا تھا کہ مصطفےٰ زیدی تو، پہلے ایڈیشن میں موجود تھے۔ راغب صاحب نے اعتراف کیا کہ ہاں مجھے اس کا خیال نہیں رہا اور میرے سوال میں مجھ سے یہ غلطی ہو گئی۔

☆۱ ___ مکالمات جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی کیلگری، کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص: ۶۱

باڈی النظر میں یقیناً یہ معاملہ اُلجھا ہوا ہے لیکن ذرا تھم کر، تحقیق کی چشمِ کشادہ سے اس الجھاؤ کی تہہ تک دیکھیں تو یہ معاملہ اتنا اُلجھا ہوا بھی نہیں ہے ـــــ خود راغب صاحب بھی اس معاملے کی تہہ تک دیکھ رہے تھے۔ یہ تو استفہامیہ طرز میں جوش صاحب سے سوال کرنے کا اُن کا ڈھنگ تھا کہ جوش صاحب کوئی پردہ تو ہٹائیں مگر جوش صاحب نے شاید اس معاملے میں اب ٹانگ پھنسانا نہیں چاہا ـــــ جو ہو گیا، سو ہو گیا ـــــ مگر راغب صاحب تو معاملے کو سمجھ رہے تھے۔ اگر نہ سمجھ رہے ہوتے تو اپنی کتاب 'مکالماتِ جوش و راغب' میں بہت واضح لفظوں میں وہ یہ بات نہ کہتے

> "ـــــ یادوں کی برات جب بعدِ اشاعت مارکٹ میں آئی تو ایک باب، معاصر و احباب غائب تھا چونکہ طباعت و اشاعت کے ذمہ دار سید سبطِ حسن (مرحوم) تھے تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حصہ انہوں نے قصداً شامل کتاب نہیں کیا، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یہ سبطے صاحب کے ایک شریکِ کار کی کارستانی ہے ـــــ" ☆

میں نے راغب صاحب سے پوچھا کہ یہ شریکِ کار کون صاحب تھے۔ انہوں نے کہا، کہ شریکِ کار جو بھی ہوں لیکن تھے وہ سبطے صاحب ہی کے ماتحت، تو سبطے صاحب ہی ذمہ دار ہوئے۔ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے (۲۳/اگست ۲۰۱۰ء کو) ٹیلی فون پر مجھ سے ڈاکٹر عالیہ امام نے بھی یہی کہا کہ یہ سب صفحات اور یہ تذکرے سبطِ حسن صاحب نے نکلوائے تھے۔

۲۴۳ گمشدہ صفحات کا مل جانا

کم و بیش ۷۵۰ صفحات پر مشتمل یادوں کی برات کے قلمی نسخے کے تقریباً ۶۰۰ گمشدہ صفحات کی تلاش، تحقیق کے ایک ایسے جادے کا سفر رہا ہے، جس میں کئی بار، انجانے موڑ، ناہموار راستوں کے اَن دیکھے نشیب و فراز اور دھندلائے ہوئے سنگِ میل جا بجا آتے رہے۔ ایسے میں کسی منزل کا نشان روشنی کے اچانک ظہور سے کم درجے کا نہیں ہوتا۔ ایک ایسی ہی تجلّی سے میں اُس وقت ہمکنار ہوا جب علمی و ادبی کتابی سلسلے 'تحریر' کے مدیر رفیق احمد نقش نے مارچ ۲۰۱۲ء میں ایک ملاقات کے موقع پر، مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ یادوں کی برات کے وہ گمشدہ اوراق جن میں جوش ملیح آبادی نے اپنے احباب کے تذکرے لکھے ہیں اُس کے کم و بیش ڈھائی سو صفحات ایک کاپی کی صورت میں اُن کے پاس موجود ہیں۔ میں اُن دنوں اپنی علالت کے ایک تکلیف دہ حصار میں تھا، اس کے باوجود یہ اطلاع میرے لیے صحتِ فکر و تحقیق کا سبب بن گئی۔ اس موقع پر بے ساختہ اُن سے میرا پہلا سوال یہی تھا کہ انہیں یہ صفحات کہاں سے دستیاب ہوئے انہوں نے جواب دیا کہ مجھے یہ صفحات ایک ایسے مہربان دوست نے

☆ ـــــ مکالماتِ جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۰

دیے ہیں جو چاہتے ہیں کہ اُن کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ رفیق احمد نقش نے کسی سے کیے گئے وعدے کی پاسداری کو اہمیت دی، اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔ چاہتا تو یہی تھا کہ وہ یہ صفحات مجھے دے دیں لیکن مجھے اُن سے یہ بات کہنے میں ایک ہچکچاہٹ تھی۔ یہی وہ مہینے تھے جب میں 'جوش شناسی' کے ساتویں شمارے 'یادوں کی برات نمبر' کے لیے رفتہ رفتہ کچھ کام کر رہا تھا چنانچہ میں نے اُن سے یہی کہا کہ وہ گمشدہ اوراق کے حوالے سے رسالے کے لیے مضمون لکھ دیں۔

رفیق نقش نے نہ صرف یہ کہ مضمون لکھا، بلکہ کچھ دنوں بعد اِن صفحات کو 'سی ڈی' پر منتقل کر کے، اس 'سی ڈی' کے ساتھ جوش صاحب کے لکھے ہوئے اور بجنسہٖ صفحات بھی یہ کہہ کر میرے سپرد کر دیے کہ 'آپ کے پاس کیونکہ یادوں کی برات کا قلمی نسخہ ہے تو اب آپ ہی اس کے اصل حقدار ہیں' رفیق نقش جو کہ خود بھی تحقیق کے آدمی ہیں، اسی میدان کے شہسوار ہیں، اور اسی قسم کے نوادارت اُن کے لیے بھی بہت کام کے نوادرات ہیں، انہوں نے جس خلوصِ نیت سے یہ صفحات مجھے دے دیے اُسے تحقیق کی دنیا میں یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے ☆

رفیق نقش نے جوش صاحب کی جو کاپی میرے سپرد کر دی اُس کے صفحات کی تعداد ۲۴۳ ہے جس پر اُن ۱۰۱، افراد و اشخاص کے تذکرے ہیں جو یادوں کی برات میں شامل نہ ہو سکے اُن کے نام یہ ہیں۔

جگر مرادآبادی، شنکر پرشاد، سید محمد عسکری، ابوالخیر مودودی، ودیا شنکر، کشن لال، اعجاز الحق قدوسی، محمد ذکریا مائل، امجد حیدرآبادی، عارف وقریشی، ڈاکٹر عبداللطیف، حبیب اللہ رشدی، بسمل ٹونکی، لطیف الدین احمد، مخمور اکبرآبادی، اسرائیل احمد خاں، آغا حشر کاشمیری، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، جمیل مظہری، مولوی غیاث الدین، خواجہ شمس الدین، اختر علی تلہری، علی عباس حسینی، احتشام حسین، یونس سلیم، رضا فرنگی محلی، اجمل خاں، پنڈت کیلاش نرائن، اشعر دہلوی، شیوراج بہادر، اسلم خاں، گوپی ناتھ امن، منور لکھنوی، آنند نرائن ملا، سراج وقدیر، ہوش بلگرامی، ساحل بلگرامی، آل رضا، نواب سید محمد مہدی، خورشید فریدآبادی، پنڈت بدری ناتھ شنگلو،

☆ ـــــ رفیق احمد نقش اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے علم و ادب سے ایک لگاؤ رکھتے ہیں انہوں نے ۱۹۸۰ء میں جامعہ سندھ سے اردو ادب، اور ۱۹۹۱ء میں کراچی یونیورسٹی سے لسانیات میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کے ساتھ ایم کی تعلیم مکمل کی۔ اُن کے ذاتی کتب خانے (بفرزون، کراچی) میں کم از کم دس ہزار سے زیادہ کتب و رسائل کا ذخیرہ ہے جس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ شکیل عادل زادہ کے ساتھ 'سب رنگ ڈائجسٹ' میں وہ نائب مدیر بھی رہے۔ ہندی اور سندھی زبان میں وہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما بھی رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے نامور مصور ایف ایم حسین کی آپ بیتی کو انہوں نے ہندی سے اردو میں منتقل کیا یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں 'ایف ایم حسین کی کہانی اپنی زبانی' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ ادارۂ یادگارِ غالب کے لیے بھی انہوں نے بعض وقیع کام کیے ہیں جن میں کتابوں کی فنی تدوین کا ایک حصہ ہے۔ آج کل وہ گورنمنٹ سٹی کالج کراچی میں بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ـــــ رفیق احمد نقش کی پیدائش میرپورخاص کی ہے جہاں وہ ۱۵؍ مارچ ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے۔

امید امیٹھوی، کرشن چندر، مالک رام، صفدر آہ سیتاپوری، آغا جانی کاشمیری، پنڈت ہری چند اختر، سید علی اختر، رزمی جے پوری، اختر شیرانی، جاں نثار اختر، جگن ناتھ آزاد، جذبی، رعنا جگی، سید سبط حسن، سجاد ظہیر، سردار جعفری، نریش کمار شاد، شکیل بدایونی، عرش ملسیانی، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، گل زار، مجروح سلطان پوری، مجاز، مجتبیٰ حسین، مصطفےٰ زیدی، احمد ندیم قاسمی، ابوالحسن بلگرامی، بدراللہ آبادی، پیر حسام الدین راشدی، سید محمد تقی، جمیل نشتر، مولانا محمد مصطفےٰ جوہر، حکیم نصیرالدین، راغب مرادآبادی، رعنا اکبرآبادی، روشن علی بھیم جی، رئیس امروہوی، زیبا ردولوی، سراج الدین ظفر، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں، سلیم اللہ فہمی، حمایت علی شاعر، شمس زبیری، صبا اکبرآبادی، آغا حسن عابدی، صابر تھاریانی، فضلی، نظیر حسین قیصر، مبین الحق صدیقی، محمد طفیل، میرزا ابوجعفر کشفی، میر عترت حسین، علی احمد تالپور، منور عباس، ذہین شاہ تاجی۔

'جوش شناسی' کے زیر ترتیب یادوں کی برات نمبر کے لئے رفیق نقش نے جو مضمون لکھ کر مجھے دیا وہ اسی عنوان کے تحت لکھا گیا یعنی 'یادوں کی برات کے گم شدہ اوراق'۔ پہلے تو دس ساڑھے دس صفحات پر انہوں نے یادوں کی برات اور اس کے ان گمشدہ اوراق کے بارے میں تحقیقی بنیادوں پر کچھ باتیں لکھی ہیں جس میں یادوں کی برات کے کاتب سے بھی اپنی گفتگو کا انہوں نے حوالہ دیا ہے اور تقریباً ۳۰ صفحات پر جوش صاحب کے لکھے ہوئے تذکروں میں سے گیارہ افراد کا تذکرہ بھی اپنے مضمون میں شامل کر دیا ہے۔ رفیق نقش کے مضمون کے دو اقتباس دینا اس وقت ضروری ہیں جس سے جوش صاحب کی اس گمشدہ کاپی کے بارے میں خاصی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ اقتباس یہ ہیں:

> "____ خوش قسمتی سے ہمیں 'یادوں کی برات' کے مذکورہ 'گم شدہ' اوراق ایک مہربان دوست کے ہاتھوں دست یاب ہو گئے ہیں، جن کا اِس سلسلے میں اپنی گم نامی پر اصرار ہے۔ ۶/انچ × ۷۵ء۷/انچ سائز کے یہ اوراق ایک خستہ حال کاپی کے ہیں، جس کی جلد کے گتے پر کسی نے سرخ بال پوائنٹ سے ایک دائرے میں 4 لکھا ہے، جس سے گمان ہوتا ہے کہ "یادوں کی برات" کے سلسلے کی یہ چوتھی کاپی ہے۔ اِسی گتے کے اندرونی صفحے پر جوش صاحب کی تحریر میں تین کالموں میں صفحات نمبر کے ساتھ ناموں کی ایک فہرست موجود ہے____"

> "____ بدقسمتی سے اِس مسودے سے کچھ اوراق غائب ہیں۔ مختلف افراد کے قلم سے موجودہ اوراق پر مختلف صفحات نمبر لکھے گئے ہیں۔ بعض صفحات پر نمبروں کی یہ تعداد چار تک پہنچ گئی ہے۔ بیشتر صفحات پر دو دو نمبر ہیں۔ پہلے نمبر، یا نمبروں کو قلم زد کر کے نیا نمبر لکھا گیا ہے۔ نئے نمبروں کے مطابق اِس مسودے کا آغاز صفحہ ۸۶۲/ سے اور اختتام صفحہ ۱۲۱۶/ پر ہوتا ہے____"

ان دونوں اقتباس میں جو باتیں کہی گئی ہیں اُس کے درج ذیل یہ چند نکات ضرور پیش نظر رہنا چاہئیں جن پر غور کرنے سے قلمی نسخے کے سلسلۂ مباحث سے، ان اقتباس میں بیان کی گئی باتوں کے سرے آپس میں مل جاتے ہیں جس سے وضاحتوں کے خدوخال اور واضح ہو جاتے ہیں۔

۱___ رفیق نقش نے پہلے اقتباس میں اس خستہ حال کاپی کے بارے میں یہ جو بات لکھی ہے کہ اس کی جلد کے گتے پر کسی نے سرخ بال پوائنٹ سے ایک دائرے میں 4 لکھا ہے___ اس کے بارے میں، میں اب یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی چند صفحات پہلے گیارہ کاپیوں کا جو ذکر کیا گیا یہ اسی سلسلے کی وہ چوتھی کاپی ہے جس کا تذکرہ حاصل شدہ قلمی نسخے کے تعارف میں، میرے یہاں نہیں ہے۔

۲___ میں نے گزشتہ صفحات میں کہیں یہ وضاحت کی ہے کہ یادوں کی برات کا، میرے نزدیک سب سے اہم باب 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' والا باب ہے اور یہ باب یقیناً اسی چوتھی کاپی سے شروع ہوا ہے اسی لئے اس کاپی کی جلد کے اندرونی صفحے پر جوش صاحب نے تین کالموں میں ایک فہرست بھی بنائی ہے۔

۳___ دوسرے اقتباس میں رفیق نقش کا یہ کہنا کہ "___ مختلف افراد کے قلم سے موجودہ اوراق پر مختلف صفحات نمبر لکھے گئے ہیں' بعض صفحات پر نمبروں کی تعداد چار تک پہنچ گئی ہے___" یہ جو مختلف صفحات پر لکھے گئے صفحات نمبر کی تعداد چار تک پہنچ گئی ہے یہ کسی اور نے نہیں لکھے (شاید چند مقامات پر راغب صاحب کی مدد لی گئی ہو) یہ صفحات نمبر جوش صاحب ہی کے قائم کیے ہوئے ہیں۔ وہ جو یہ کہتے تھے کہ یہ فلاں مسودہ ہے، تو وہ درست کہتے تھے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی مرتبہ کاٹ چھانٹ اور ترتیب کے عمل سے گزرتے ہوئے یہ صفحات نمبر بار بار تبدیل کئے گئے تھے۔

۴___ رفیق نقش نے اس کاپی کے حوالے سے یہ صحیح کہا کہ اس مسودے سے کچھ اوراق غائب ہیں، یہ تمام غائب شدہ صفحات اسی قلمی نسخے میں موجود ہیں جو میری تحویل میں ہے۔

جب ہم ان صفحات کی ترتیب کو دیکھتے ہیں جو اس 'گمشدہ کاپی' میں موجود ہیں تو یہ ہو بہو وہی صفحات ہیں جو قلمی نسخے سے غائب ہیں۔ ابھی آٹھ دس صفحات پہلے غائب صفحات کے نمبر اور ان کی جو ترتیب لکھی گئی ہے۔ اسے رفیق نقش کے (مضمون میں) درج کیے گئے صفحات کی ترتیب اور ان کے نمبروں سے ملا کر دیکھ لیجئے۔ سرِ مو فرق نہیں۔ رفیق نقش نے لکھا ہے:

"____ موجودہ صورت میں صفحات کی ترتیب کچھ یوں ہے:
صفحہ ۸۶۲/۳ تا صفحہ ۸۷۱، صفحہ ۹۱۲/۳ تا صفحہ ۹۳۹، صفحہ ۹۷۴/۳ تا صفحہ ۹۹۱، صفحہ ۱۰۰۰/۳ تا
صفحہ ۱۰۰۹، صفحہ ۱۰۲۰/۳ تا صفحہ ۱۰۳۶، صفحہ ۱۰۵۰ تا صفحہ ۱۰۶۹، صفحہ ۱۰۷۴/۳ تا صفحہ ۱۰۷۹
(نمبر ۱۰۷۶ اور نمبر ۱۰۷۷ دہرائے گئے ہیں)، صفحہ ۱۰۸۴/۳ تا صفحہ ۱۰۹۹؛ صفحہ ۱۱۰۴/۳ تا
صفحہ ۱۱۶۸، صفحہ ۱۱۷۳/۳ تا صفحہ ۱۲۱۶ ____"

صاف صاف یوں لگتا ہے جیسے یادوں کی برات کے ضخیم قلمی نسخے سے ترتیب کے ساتھ گن گن کر یہ صفحات وہاں سے ہٹا کر اس چوتھی کاپی میں رکھ دیے گئے۔ اور یہی وہ صفحات ہیں جو مطبوعہ خودنوشت کا حصہ نہیں بن سکے۔ قلمی نسخہ جوش صاحب کی وفات کے تقریباً ۱۴ سال بعد مجھے ملا تھا اس لیے اُن سے تو اس بارے میں گفتگو ہی نہیں ہوئی۔ راغب صاحب کو جب میں نے یہ پورا نسخہ دکھایا اور گمشدہ اوراق کا پوچھا تو انہوں نے کہا تھا کہ جوش صاحب اسلام آباد چلے گئے تھے، قلمی نسخے ہی کی مجھے خبر نہیں تھی تو گمشدہ اوراق کا کیا تذکرہ ہوتا ____ اور اب جب یہ کاپی میری دسترس میں آئی ہے تو راغب صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں جوش صاحب بھی اپنی زندگی میں یہ بات شاید بھول گئے تھے کہ انہوں نے یہ صفحات یادوں کی برات کے کاتب اظہر عباس جعفری کو دے دیے تھے اور یہ بات یقیناً راغب صاحب کو بھی پتہ نہیں تھی اسی لیے انہوں نے مجھ سے اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔

قلمی نسخے اور مطبوعہ خودنوشت کی تقابلی فہرست

قلمی نسخے کے ۱۱۹۶ صفحات جو مجھے جوش صاحب کی نواسی صبوحی خاتون سے ملے تھے ان میں غیر مطبوعہ صفحات بھی شامل ہیں اب ان گمشدہ ۲۳۴ صفحات کے مل جانے کے بعد اس قلمی نسخے کے صفحات کی تعداد ۱۴۳۰ ہو جاتی ہے جبکہ اب بھی اس کے تقریباً ۳۶۵ صفحات کی تا حال کوئی اطلاع نہیں جس میں تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل "میرے معاشقے" والا آخری باب اور پہلے باب کے ۶۵ صفحات شامل ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے گزشتہ صفحات میں کہیں لکھا ہے کہ 'قابلِ ذکر احباب' والا باب اس خودنوشت کا انتہائی اہم باب ہے اور اب اس کے ۲۳۴ صفحات کے مل جانے کے بعد کوئی مضائقہ نہیں، اگر ہم قلمی نسخے کی ایک مکمل فہرست ترتیب دے لیں۔

قلمی نسخے کی فہرست اس طرح بنائی گئی ہے کہ دو کالم قائم کر کے ایک طرف یادوں کی برات کے قلمی نسخے کی فہرست اور اس کے مقابل دوسرے کالم میں مطبوعہ یادوں کی برات کی فہرست بھی ترتیب دی گئی ہے۔ آئندہ صفحات پر ہم جن مباحث میں داخل ہو رہے ہیں اس کے لئے پہلے اس فہرست کو بہ نظرِ غائر دیکھنا اشد ضروری ہے۔

قلمی نسخے کی جو فہرست اب آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو یہ چند باتیں ضرور ذہن میں رکھیے:

۱__ ایک تو یہ بات یاد رہے کہ وہ ذیلی سرخیاں جو جوش صاحب نے پہلے تو قائم کیں پھر انہیں قلمزد کر دیا ایسی ذیلی سرخیوں کے ساتھ ہم نے کراس (x) کا نشان بنا دیا ہے۔

۲__ دوسرے وہ ذیلی سرخیاں یا مرکزی سرخیاں، جن پر 'کراس' کا نشان نہیں ہے مگر اس کے باوجود وہ مطبوعہ میں شامل نہیں ہیں تو اس سے یہی مراد لی جائے کہ کاتب نے انہیں کتابت کے وقت یا تو لکھا نہیں یا پروف پڑھتے وقت جوش صاحب نے انہیں کاٹ دیا یا بدل دیا۔ شواہد تو یہی بتاتے ہیں کہ ایسا کم ہی ہوا ہوگا کہ کاتب نے اس کی کتابت نہ کی ہو، بیشتر یہی ہوا ہوگا کہ پروف پڑھنے کے دوران جوش صاحب نے خود بہت سی تبدیلیاں کی ہوں گی۔ اس موقع پر اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اگر چہ اس خودنوشت کے سب سے زیادہ پروف راغب صاحب نے پڑھے تھے لیکن ردوبدل کا اختیار انہیں نہیں، صرف جوش صاحب کو تھا (وہ مشورے میں ضرور شامل ہوتے تھے) راغب صاحب کے پروف پڑھنے کے بعد جوش صاحب جب حتمی رائے قائم کرتے تھے تو جستہ جستہ پروف بھی پڑھتے تھے خصوصاً اضافے اور قطع و برید کے لئے قلم ان کے ہاتھ میں رہتا تھا۔

۳__ قلمی نسخے کی فہرست کے کالم کے مقابل شائع شدہ یادوں کی برات کی فہرست بھی کالم ہی میں بنائی گئی ہے۔ قلمی نسخے کے جو عنوانات اور جو ذیلی سرخیاں کتابت ہو کر یادوں کی برات کا حصہ بن گئیں انہیں بیشتر قلمی نسخے کے متعلقہ عنوانات کے بالکل سامنے کمپوز کیا گیا ہے۔ نتیجے میں شائع شدہ یادوں کی برات کی سرخیوں میں کئی مقامات پر فاصلہ نظر آئے گا۔

۴__ یادوں کی برات کے جن دو ایڈیشنوں سے فہرست تیار کی گئی ہے یہ وہی ایڈیشن ہیں جنہیں جوش اکیڈمی، کراچی نے جوش صاحب کے ایماء سے شائع کیا، پہلا ایڈیشن تو اب قطعی نایاب ہو چکا ہے☆ ترمیم شدہ ایڈیشن ہی اب ہر جگہ پر عام ہے یہی دونوں ایڈیشن یادوں کی برات کے مستند ایڈیشن ہیں۔

☆__ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن کا میرا ذاتی نسخہ خورشید علی خاں مجھ سے لے گئے تھے اب جو نسخہ میری دسترس میں ہے یہ ہمارے دوست (علامہ) سید علی کرار نقوی کا نسخہ ہے، جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔

قلمی نسخہ اور مطبوعہ یادوں کی برات میں سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کی فہرست

یادوں کی برات (مطبوعہ)		قلمی نسخہ	
مطبوعہ یادوں کی برات میں سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کی ترتیب درج ذیل ہے۔ متعدد مقامات و عنوانات قلمی نسخے سے مختلف ہیں۔		قلمی نسخے میں جوش صاحب کی لکھی ہوئی سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کی ترتیب اور ان کے قائم کردہ صفحات نمبر۔	
چند ابتدائی باتیں	۲۳	**چند ابتدائی باتیں**	۱۱
ا............	۲۳	ا_ (مسودوں کی تنسیخ)	۱۱
۲_ حافظے کا ضعف	۲۳	۲_ (حافظے کا ضعف)	۱۳
۳_ حالات قلم بند کرنے کی جگہ کا دیاں	۲۵	۳_ (حالات قلم بند کرنے کی جگہ کا دیاں)	۱۴
۴_ خود کشائی	۲۷	۴_ (خود کشائی)	۱۷
ا_ شعر گوئی	۲۷	ا_ شعر گوئی	۱۷
۲_ عشق بازی	۲۸	۲_ عشق بازی	۲۱
۳_ علم طلبی	۳۰	۳_ علم طلبی	۲۴
۴_ انسان دوستی	۳۲		
بنام قوت و حیات	۴۱		
میرا حادثۂ ولادت	۴۱	☆	
میرا وطن	۴۱		
میری حویلی کی اندرونی فضا	۴۳		
بیرونی فضا	۴۴		
میرا مجموعۂ اضداد	۴۴		
میرے کھیل	۵۵	میرے کھیل	۸۲

☆___ صفحہ ۲۷ سے ۶۴ تک کے ۳۸ صفحات قلمی نسخے میں موجود نہیں ہیں۔

☆ صفحہ ۲۵۶ سے ۲۸۲ تک ۲۷ صفحات قلمی نسخے سے غائب ہیں

☆ ـــ جوش صاحب نے متعدد ذیلی سرخیوں کو کتابت کے وقت یادوں کی برات میں شامل نہیں کیا ایسی ذیلی سرخیوں کو انہوں نے کاٹ دیا ہے نشان (x) اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

☆ صفحہ ۴۴۴ اور ۴۴۵ کے بعد ۴۴۶ آنا چاہیے تھا لیکن جوش صاحب نے ۴۳۶ لکھ دیا اور پھر ۴۳۶ کے بعد ہی ترتیب آگے بڑھتی رہی۔

☆___ یہاں جو لفظ لکھا ہوا ہے وہ کاغذ کی شکستگی کے سبب پڑھنے میں نہیں آ رہا۔

☆۱___ صفحہ ۵۸۰ کو جوش صاحب نے ۵۹۰ لکھ دیا اور یوں صفحات نمبر تبدیل ہو گئے۔

نورالحسن خاں (چھوٹے دادا) ☆ ۶۵۶	
مختار احمد خاں ۶۷۸	مختار احمد خاں ۴۲۴
قاضی خورشید احمد ۶۹۵	قاضی خورشید احمد ۴۳۳
حکیم صاحب عالم ۷۲۸	حکیم صاحب عالم ۴۳۹
رفیع احمد خاں ۷۳۶	رفیع احمد خاں ۴۵۴
پرنس میرزا عالم گیر قدر ۷۴۷	پرنس میرزا عالم گیر قدر ۴۶۰
حکیم مخمور ۷۵۱	
میرزا جعفر حسین ۷۵۳	
مولانا سہا بھوپالی ۷۵۵	مولانا سہا بھوپالی ۴۶۳
ڈاکٹر ایس کے سکینہ ۷۶۲	ڈاکٹر ایس کے سکینہ ۴۶۷
مانی جائسی ۷۷۵	مانی جائسی ۴۷۴
منے میرزا اشر لکھنوی ۷۸۲	منے میرزا اشر لکھنوی ۴۷۸
شاہ دل گیر اکبرآبادی ۷۹۴	شاہ دل گیر اکبرآبادی ۴۸۵
نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۷۹۸	نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۴۸۸
حکیم آزاد انصاری ۸۱۵	حکیم آزاد انصاری ۴۹۰
فانی بدایونی ۸۲۶	فانی بدایونی ۵۰۳
آغا شاعر قزلباش ۸۳۸	آغا شاعر قزلباش ۵۰۹
سردار روپ سنگھ ۸۴۵	سردار روپ سنگھ ۵۱۳
وصل بلگرامی ۸۵۲	وصل بلگرامی ۵۱۷
جگر مرادآبادی ۸۶۲	
ڈاکٹر کرنل اشرف الحق ۸۷۲	ڈاکٹر کرنل اشرف الحق ۵۲۲
کنور مہندر سنگھ بیدی ۸۷۸	کنور مہندر سنگھ بیدی ۵۲۶

☆ یادوں کی برات میں ـــــ میرے چند قابلِ ذکر احباب ـــــ کے تحت فہرست میں ۳۵ نام ہیں جبکہ کتاب میں ۳۶ افراد و شخصیات کا تذکرہ ہے۔ ان ۳۶ ناموں میں پہلا نام ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی کا ہے جن کا تذکرہ ۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۵ویں صفحے سے بغیر کسی سرخی یا تمہید کے نورالحسن خاں کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے جبکہ قلمی نسخے میں ان کا تذکرہ علیحدہ صفحے سے شروع ہوا ہے۔ یادوں کی برات کے تمام مطبوعہ ایڈیشنوں میں یہی غلطی باقی ہے اسی سبب سے فہرست میں نورالحسن خاں کا نام نہیں ہے۔

☆

پنڈت جواہر لال نہرو ۸۹۲	پنڈت جواہر لال نہرو ۵۲۹
مولوی سمیع اللہ ۹۱۱	
شنکر پرشاد، آئی سی ایس ۹۱۳	
سید محمد عسکری ۹۲۷	
سید ابوالخیر مودودی ۹۲۹	
وِدیا شنکر آئی، سی، ایس ۹۳۳	
کشن لال ۹۳۶	
اعجاز الحق قدوسی ۹۳۷	
محمد ذکریا مائل ۹۳۹	
سروجنی نائیڈو ۹۵۱	سروجنی نائیڈو ۵۳۹
میاں محمد صادق ۹۵۵	میاں محمد صادق ۵۴۲
علامہ حیرت بدایونی ۹۶۰	علامہ حیرت بدایونی ۵۴۵
سردار دیوان سنگھ مفتون ۹۶۵	سردار دیوان سنگھ مفتون ۵۴۸
امجد حیدرآبادی ۹۷۳	
عارف وقریشی ۹۷۶	
ڈاکٹر عبداللطیف ۹۸۲	
حبیب اللہ رشدی ۹۸۶	
بسمل ٹونکی ۹۸۹	
مولانا عبدالسلام ۹۹۲	مولانا عبدالسلام ۵۵۳
مولانا ابوالکلام آزاد ۹۹۹	
لطیف الدین احمد ۱۰۰۳	
مولانا عبداللہ عمادی ۱۰۱۰	مولانا عبداللہ عمادی ۵۵۷
مے کش اکبرآبادی ۱۰۱۹	
مخمور اکبرآبادی ۱۰۲۲	
اسرائیل احمد خاں ۱۰۲۳	

☆ ___ صفحہ نمبر ۸۷۹ کے بعد ۸۸۰ کے بجائے جوش صاحب نے ۸۹۰ لکھ دیا اور پھر اسی طرح نمبر آگے بڑھتے گئے۔

☆ ـــ صفحات نمبر کے اندراج میں جوش صاحب سے یہاں پھر غلطی ہو گئی انہوں نے صفحہ نمبر ۱۰۷۵ اور ۱۰۷۶ کو دوبار لکھ دیا ہے

☆ ___ پنڈت ہری چند اختر پر جوش صاحب نے صفحہ ۱۱۱۰ پر بھی لکھا ہے اور صفحہ ۱۱۱۴ پر بھی۔

☆☆ ___ 'میرے خورد احباب' کے حوالے سے جوش صاحب کا لکھا ہوا نوٹ اس کے بعد کے صفحے پر ملاحظہ کیجیے

سبط حسن ۱۱۲۳	سبط حسن ۵۷۶
سجاد ظہیر ۱۱۲۴	
سردار (علی سردار) ۱۱۲۵	
شاد (نریش کمار) ۱۱۲۶	
شکیل بدایونی ۱۱۲۶	
عرش ملسیانی ۱۱۲۷	
فیض ۱۱۲۸	
کیفی اعظمی ۱۱۲۹	
گل زار ۱۱۲۹	
مجروح سلطانپوری ۱۱۳۰	
مجاز ۱۱۳۱	مجاز (ترمیم شدہ ایڈیشن) ۵۷۵
مجتبےٰ حسین ۱۱۳۲	
مصطفےٰ زیدی ۱۱۳۳	مصطفےٰ زیدی (پہلا ایڈیشن) ۵۷۴
ندیم قاسمی ۱۱۳۵	

☆☆ــــ (گزشتہ صفحے سے پیوستہ) صفحہ نمبر ۱۱۱۵ پر جوش صاحب نے باب سوئم لکھا ہے ۱۱۱۶ سادہ ہے جبکہ ۱۱۱۷ پر ان کی یہ مختصر تحریر ہے جو کسی باب کے آغاز سے پیشتر تمہیدی صفحے کی حیثیت رکھتی ہے:

''......میرے خورد احباب جن سے میں اپنے چھوٹے بھائیوں اور بچوں کی طرح محبت کرتا ہوں اور جن میں اختر شیرانی اور مجاز کے علاوہ سب ماشاءاللہ بقید حیات ہیں اللہ ان سب کو شاد و بامراد اور تادیر سلامت رکھے کہ اب انہیں کے دم سے اردو ادب آگے بڑھے گا ......'' اسی صفحے پر فٹ نوٹ میں جوش صاحب نے لکھا ہے کہ ''......تمام نام حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔'' ان ناموں کی تعداد ۱۹ ہے جو صفحہ ۱۱۱۸ پر لکھے ہوئے ہیں جوش صاحب کے لفظوں میں ان کی ترتیب یہ ہے......

''......اختر شیرانی، اختر (جاں نثار)، آزاد جگن ناتھ، جذبی، جمال (حکیم محمد نبی خاں)، رعنا جگی، سبط حسن، سردار علی سردار، شاد (نریش کمار)، شکیل (بدایونی)، عرش (بال مکند)، فیض (فیض احمد)، کیفی اعظمی، گل زار دہلوی، مجروح (سلطانپوری)، مجاز، مصطفےٰ (زیدی)، ندیم قاسمی......''

حروف تہجی کی ترتیب کا خیال رکھنے کے باوجود جوش صاحب سے دو مقامات پر چوک ہوگئی ایک تو یہ کہ اختر (جاں نثار) کا نام پہلے ہونا چاہیے تھا اور اختر شیرانی کا بعد میں دوسرے یہ کہ مجروح سلطانپوری کا نام مجاز اور مجتبےٰ حسین کے بعد آنا چاہیے تھا جب کہ جوش صاحب نے اپنی ترتیب میں پہلے مجروح کا نام لکھا ہے پھر مجاز اور پھر مجتبےٰ حسین کا۔

باب چہارم ۱۱۴۶
میرے پاکستانی دوست ☆ ۱۱۴۷
افراد و شخصیات کے نام ☆۱ ۱۱۴۸

☆ ___ اس سرخی کے تحت جوش صاحب نے اس صفحے پر یہ نوٹ لکھا ہے:
"میں احبابِ زندہ کی مفارقت سے فگار، یارانِ رفتہ کا سوگ وار، اور درازیِ عمر کا گناہ گار، عمر کی اس آخری منزل میں پاکستان آیا ہوں جب کہ رفیق گری اور دوست سازی کا ولولہ دم توڑ چکا ہوتا ہے۔ پھر بھی پاکستان آ کر یہاں کے کروروں باشندوں میں سے اپنے گنے چند احباب میں نے پیدا کر لیے ہیں وہ بھی اوچھی پونجی کے مانند آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے چار پاکستانی دوست ساحل بلگرامی، نواب ابوالحسن بلگرامی قیصر شاہ جہاں پوری اور زیار ردولوی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور سوچتا ہوں کہ سخت جانی کے ہاتھوں، اگر نصیب دشمناں اور بھی جیتا رہا تو پھر ہو گا کیا؟ ___ اے موت و حیات، مجھ کو ان بدبختوں میں نہ شامل کر دینا جو قیامت کے بورے بوریں گے مجھ کو نئے احباب کی جدائی سے بچانا، اور اس عبرت ناک سناٹے سے دور رکھنا، جب ساری دنیا کراہتی اور بھائیں بھائیں کرنے لگتی ہے، اور گھبرا دینے والی تنہائی کے اتھاہ سمندر میں، دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ اور آدمی، آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخ اُٹھتا ہے:

نہ مونسے ، نہ رفیقے نہ ہم دمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم؟ عجب غمے دارم!

☆۱ ___ یادوں کی برات کے اس باب چہارم میں جسے جوش صاحب نے 'میرے پاکستانی دوست' کا نام دیا ہے ۱۳۳ افراد و شخصیات کے نام صفحہ نمبر ۱۱۴۸ پر لکھے ہیں جو بہ ترتیب حروف تہجی یہ ہیں: ___ ابوالحسن بلگرامی (نواب)، بدر، پیر حسام الدین، تقی (مدیر جنگ) جمیل نشتر، جوہر (علامہ محمد مصطفےٰ)، حکیم نصیر الدین، راغب مراد آبادی، رعنا اکبر آبادی، روشن علی بھیم جی، رئیس امروہوی، زیار ردولوی، ذہین شاہ تاجی، سراج اعظمی (پولیس)، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں، سلیم اللہ فہمی، شاعر (حمایت علی)، شائق (ڈاکٹر)، شمس زبیری، صبا اکبر آبادی، عابدی، آغا حسن (یونائیٹڈ بینک)، ظفر، سراج الدین، عبدالحسین تھاریانی، فضلی، قیصر، مبین الحق صدیقی، محمد طفیل، منور عباس، میرزا ابو جعفر کشفی، میر عترت حسین، میر علی احمد خاں تال پور، ہاشم رضا ___"
سات نام ایسے ہیں جنہیں جوش صاحب نے پہلے لکھا، پھر قلمزد کر دیا۔ ان میں سے تین نام، خلیل، سبطین اور یوسف کے ہیں جن کے آگے بریکٹ میں نرائن گنج لکھا ہوا ہے تین نام ڈاکٹر احسن، عندلیب شادانی اور قربی کے ہیں۔ ساتواں نام رزمی جے پوری کا ہے جن پر وہ پہلے لکھ چکے تھے اس لئے ان کا نام کاٹ دیا۔ تین اور نام مدنی، ممتاز حسن، اور ممتاز حسین کے بھی ہیں جنہیں انہوں نے قلمزد تو نہیں کیا لیکن کراس (x) کے نشان ان ناموں سے پہلے لگا دیئے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ذہن میں کیا بات تھی اندازہ یہی ہے کہ ان پر وہ شاید بعد میں لکھتے۔

ابوالحسن بلگرامی (نواب)	۱۱۴۹		
بدر اللہ آبادی	۱۱۵۱		
پیر حسام الدین	۱۱۵۲		
تقی (سید محمد)	۱۱۵۳		
جمیل نشتر	۱۱۵۴		
جوہر (محمد مصطفےٰ)	۱۱۵۵		
حکیم نصیر الدین	۱۱۵۶		
راغب مراد آبادی	۱۱۵۸		
رعنا اکبر آبادی	۱۱۶۱		
روشن علی بھیم جی	۱۱۶۲	روشن علی بھیم جی ☆	۵۷۲
رئیس امروہوی	۱۱۶۴		
زیبا (ردولوی)	۱۱۶۵		
ذہین شاہ تاجی ☆۱	۱۱۶۷		
ظفر، سراج الدین ☆۲	۱۱۷۵		
سرور بارہ بنکوی	۱۱۷۶		
سلامت علی خاں	۱۱۷۷		
سلیم اللہ فہمی	۱۱۷۸		
شاعر (حمایت علی)	۱۱۸۰		
شمس زبیری ☆۳	۱۱۸۱	شمس زبیری (پہلا ایڈیشن)	۵۷۵

☆ ___ یادوں کی برات میں روشن علی بھیم جی پر جوش صاحب کی تحریر موجود ہے گمشدہ اوراق میں جہاں بھیم جی کا تذکرہ ہے وہ اس مطبوعہ تحریر سے مختلف ہے۔

☆ ۱ ___ صفحہ ۱۱۶۷ پر ذہین شاہ تاجی کا صرف نام لکھا ہے اس پر کوئی تحریر نہیں ہے اسی طرح صفحہ ۱۱۷۴ تک صفحات سادے ہیں

☆ ۲ ___ سراج الدین ظفر کا تذکرہ جوش صاحب نے صفحہ ۱۱۷۵ کے علاوہ صفحہ ۱۱۸۲ پر بھی کیا ہے اسی صفحے کی فہرست میں ذہین شاہ تاجی اور ظفر سراج الدین کے نام حروف تہجی کی ترتیب کے قواعد کے ساتھ نہیں ہیں۔

☆ ۳ ___ گمشدہ اوراق میں شمس زبیری پر جوش صاحب کی جو تحریر ہے وہ ایک مختصر اضافے کے ساتھ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہو چکی ہے۔

☆___ جوش صاحب نے صفحہ ۱۱۷۸ پر اپنے جن پاکستانی دوستوں کے ناموں کی فہرست ترتیب دی ہے وہاں شمس زبیری کے بعد انہوں نے صبا اکبرآبادی کا نام لکھا ہے اور پھر جہاں ان کا تذکرہ کیا ہے اس پر صفحہ ۱۱۰۵ درج ہے جبکہ پاکستانی دوستوں پر محیط یہ حصہ ۱۱۷۳ سے شروع ہو کر ۱۲۲۰ پر ختم ہو رہا ہے اور یہ صفحہ اس میں نہیں آتا۔ جوش صاحب اس صفحے پر اصل نمبر درج کرنا بھول گئے انہوں نے کسی اور ترتیب کے وقت اس کا نمبر وہاں قائم کیا تھا اور پھر یہ اسی طرح باقی رہا۔

☆۱___ قلمی نسخے کے صفحہ نمبر ۱۲۱۴ پر ہاشم رضا صاحب کا صرف نام لکھا ہے یہ صفحات ۱۲۱۴ سے ۱۲۲۰ تک خالی اور سادے ہیں۔ اس سے متعلق وضاحت ہاشم رضا کے تذکرے میں فٹ نوٹ پر ملاحظہ کیجئے۔

☆ آلویرو کے بعد مولوی احمد حسین کا صفحہ نمبر بھی جوش صاحب نے وہی لکھ دیا ہے۔

☆۱ میر بارق لکھنوی اور ابر قدوائی پر جوش صاحب کی کچھ تحریریں پہلے بھی ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

☆۲ قلمی نسخے میں نواب رستم علی خاں کے نام کے ساتھ ان کا تخلص جوش صاحب نے سپہر لکھا ہے جبکہ یادوں کی برات میں مہر شائع ہوا ہے۔

قلمی نسخے کی فہرست بتاتی ہے کہ
جوش صاحب نے اپنے احباب کو فراموش نہیں کیا

یادوں کی برات کی اشاعت کو اب ۴۳ برس (۱۹۷۰ء___۲۰۱۳ء) ہونے کو آرہے ہیں، اس مدت میں، اِس خودنوشت سوانح حیات کے حوالے سے جو مضامین و مقالے تنقیدی کتب کا حصہ بنے، جو تبصرے اور تجزیے اخبارات وادبی رسائل میں شائع ہوئے، جامعات میں طلباء وطالبات نے جو تحقیقی کام کیے اور ٹیلی ویژن پر مذاکرات میں جو کچھ بھی کہا گیا، ان میں متعدد عنوانات کے تحت مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی۔ کچھ لکھنے والے نالاں رہے کہ جوش صاحب نے مبالغہ آمیز واقعاتی روش اور اپنی برہنہ گفتاری سے غیر ضروری موضوعات کو ہوا دے کر معاشرے میں رائج حدود وقیود کو بہ یک جنبش قلم مسترد کر دیا لیکن جس بات کا ناقدین نے سب سے زیادہ گلہ کیا وہ یہ ہے کہ زندگی بھر زندگی کے میلوں ٹھیلوں کی لطافتوں کا تذکرہ کرنے والے اور یادوں کی برات سجانے والے نے اپنی یادوں کے نہاں خانوں سے اپنے کتنے قریبی احباب کو خارج کر دیا۔ لیکن اب قلمی نسخے کے گمشدہ اوراق کی دریافت نے ساری فضا ہی بدل کر رکھ دی وہ نشست و برخاست اور وہ بیٹھکیں جن میں جوش صاحب کی زندگی کا ایک کثیر حصہ اپنے احباب کے ساتھ گزرا، وہ مختلف زاویوں، اور

☆___ جوش صاحب نے قلمی نسخے میں اپنی بیوی اشرف جہاں کے متعلق دو مختلف مسودوں میں اظہار خیال کیا ہے صفحہ ۱۳۴۴ پر میری بیوی کے مزاج کا پس منظر کے عنوان کے تحت اور صفحہ ۱۴۱۰ پر "میری بیوی" کی سرخی قائم کر کے۔

متضاد زمانوں کے ساتھ اس خودنوشت میں نظر آتی ہیں۔

احباب کونظر انداز کر دینے کا گلہ کرنے والے بھی شاید ان معنوں میں اپنی جگہ درست تھے کہ انہیں جوش صاحب کی خودنوشت کے غائب صفحات کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ نقادوں اور تجزیہ نگاروں کو جو شکایات تھیں وہ ان چند اقتباسات میں ملاحظہ کیجیے:

علی عباس جلال پوری کو گلہ یہ تھا کہ:

"____ اس میں غیر معروف احباب اور اعزاء کا ذکر نہایت شرح و بسط سے کیا گیا ہے لیکن سیاسی، فکری اور ادبی اکابر کا ذکر جن سے جوش صاحب کی صحبت رہی اوّل تو آیا ہی نہیں اور اگر آیا ہے تو سرسری طریقے سے آیا ہے____" ☆

پروفیسر سحر انصاری بھی شاکی رہے کہ:

"____ مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، سید احتشام حسین، فیض احمد فیض، ممتاز حسین اور ترقی پسند تحریک کے دوسرے ایسے مقتدر علمبرداروں کا تذکرہ نہیں ملتا جن سے جوش صاحب بہت اچھی طرح واقف ہیں____" ☆۱

حسن عابدی نے بھی ایک جگہ یہ بات کہی:

"____ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں وہ جلیل القدر معاصر نظر نہیں آتے جن کے بغیر جوش صاحب کے دور کا ہر تذکرہ نامکمل رہتا ہے____" ☆۲

سید حامد کی رائے بھی دیکھ لیجیے:

"____ جن لوگوں کی نظر جوش صاحب کی زندگی میں رہی اور جو بالخصوص ان کی زندگی کے اس دور سے واقف ہیں جو انہوں نے دلّی میں گزارا، ان لوگوں کو یادوں کی برات میں جوش کے کئی مقتدر احباب کی کمی کھٹکتی ہے____" ☆۳

صابر کمال کی کتاب کے ایک صفحے سے یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے:

"____ ان کے قریبی دوست، احباب اور رشتے داروں کا خیال ہے کہ جوش صاحب نے اُن اصحاب کا بھی ذکر نہیں کیا جو ان کے خاص ملنے والوں میں تھے ایک حد تک یہ

☆ ____ جوش ملیح آبادی' یادوں کی برات کے آئینے میں' مشمولہ فنون، لاہور شمارہ، اپریل مئی ۲، ۱۹۷۲ء، ص:۱۹

☆۱ ____ یادوں کی برات محض دلچسپ واقعات، مشمولہ، ماہنامہ افکار کراچی، شمارہ مارچ ۱۹۷۱ء، ص:۳۸

☆۲ ____ ہفت روزہ لیل و نہار کراچی، ۸ تا ۱۴ مارچ، ۱۹۷۱ء

☆۳ ____ نگار خانہ رقصاں، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۹۳ء

اعتراض درست بھی ہے۔ مثلاً 'آج کل' کی ایڈیٹری کے زمانے میں ان کے دست راست اور ان کے روز و شب کے ساتھی جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، بلونت سنگھ، کشن لال، ودیا شنکر صاحب، آئی سی ایس، نریش کمار شاد، یا بمبی کے احباب مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، اختر الایمان، پرتھوی راج، کمال امروہوی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، حیدرآباد کے احباب میں مشکور بیگ، مخدوم محی الدین، ابوالمحمود، شاہد صدیقی، یونس سلیم، ڈاکٹر زور، نجم آفندی، نظر حیدرآبادی، امجد حیدرآبادی، اقبال چند کھنہ صاحب، مہدی نواز جنگ یا ان کے قریبی رشتے دار پدما شری غوث محمد خاں، یہ سب ان کے پرستار اور سچے ہمدرد ہیں لیکن ان کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے ـــــ" ☆

اس اقتباس میں ۲۹ / اشخاص کا ذکر ہے، جن میں سے بیشتر کا تذکرہ یادوں کی برات کے ان صفحات میں ہے جو اب ہاتھ آئے۔ میرا مقصد جوش صاحب کی وکالت یا اس ذیل میں ان کی تائید نہیں ہے لیکن اس کا اعتراف ضرور کرنا چاہیے کہ انہوں نے عمداً ایسا نہیں کیا کہ فلاں دوست کیوں کے ان کا ہم نوا و ہم خیال نہیں تھا تو اس کا نام تک ان کی خودنوشت میں نہ آئے۔ شمس زبیری کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"ـــــ لوگ کہتے ہیں آپ ان سے محبت نہ کریں کہ یہ ایک زمانے میں آپ کے خلاف تھے اور انہوں نے 'ساقی' کے جوش نمبر کی ترتیب میں شاہد احمد دہلوی کا ساتھ دیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہی تو ایک ایسی خوبی ہے، جس سے اُن کے کردار کی استواری ثابت ہوتی ہے اور اُن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دوست شاہد احمد دہلوی کا ساتھ دیا تھا ـــــ" ☆۱

بارہا ایسا ہوتا رہا ہے کہ کسی شخص اور اس کے سلسلے سے کسی روداد کو وہ بھول گئے چنانچہ ان کی یادداشت سے وہ چہرہ یا وہ واقعہ محو ہو گیا۔ انہوں نے یادوں کی برات کے بالکل آغاز میں اپنے حافظے کے ضعف کا جو ذکر کیا ہے وہ کوئی عبارت آرائی نہیں ہے۔ نہ اظہار میں کوئی مبالغہ آمیزی بلکہ سراسر ایک حقیقت ہے:

"ـــــ اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی، صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا۔ کئی مہینے کی بات ہے کہ، تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لیے نکلا تھا، واپسی میں اپنے گھر کا راستہ بھول گیا، وہ تو کہیے ایک میرے ہم عمر ٹہلتے ہوئے مل گئے، میں نے

☆ ـــ یادوں کی برات، خصوصی مطالعہ۔ حیدرآباد دکن، ص: ۹۶/۹۷

☆۱ ـــ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۵۷۵

اُن سے پوچھا کہ یہیں کہیں، برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے، کیا آپ اُس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں، میں نے کہا جی ہاں، اور اُن نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا، میرا نام نصیر احمد؟ ہے، جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ اور، میں نے فرطِ شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔

اور تو اور، آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد دست خط کی نوبت آئی، تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، اور؛ گر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آ جاتا، تو یقین فرمائیے میرا دم نکل جاتا ___ ''☆

جوش صاحب نے اس عمر میں اپنے حافظے کی کمزوری کا جو یہ ذکر کیا ہے اس کی توثیق اُن کے بہت قدیم دوست میرزا عالمگیر قدر، ان کی صاحبزادی سعیدہ خاتون، ان کے نواسے سراج انور خاں اور فرخ جمال نے بھی مجھ سے کی ہے۔ جوش صاحب کی پوتیوں ساجدہ آفریدی، ترنم آفریدی اور تبسم اخلاق نے بھی گھریلو زندگی کے ایسے کئی واقعات مجھے بتائے ہیں جنھیں جوش صاحب یکسر بھول گئے۔

یہ بات تو طے ہے کہ جوش صاحب، اپنے تمام ہی احباب کو جن پر انہوں نے لکھا تھا، یادوں کی برات میں شامل رکھنا چاہتے تھے۔ گمشدہ کاپی کے پہلے گتے کے اندرونی حصے پر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک فہرست ہے جس میں صفحات نمبر بھی درج ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب تذکرے اسی خودنوشت کا حصہ تھے۔ (متصل صفحہ پر جوش صاحب کے عکسِ تحریر میں آپ یہ فہرست ملاحظہ کر سکتے ہیں)

حسن عابدی صاحب نے جوش صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ:

'' ___ ''یہ فرمائیے کہ آپ نے ''یادوں کی برات'' میں جو واقعات درج کیے ہیں وہ آپ نے حافظے کی مدد سے تحریر کیے ہیں یا تحریری یادداشتوں کی مدد سے۔''

جوش صاحب نے جواب دیا

'' ___ میں نے اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی روزنامچہ نہیں رکھا روزنامچہ تو روزنامچہ میں نے اپنی نظموں کے وہ ترجمے تک احتیاط سے نہیں رکھے جو آنجہانی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نائیڈو نے کیے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تلف ہو گئے ___ ''

☆ ___ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۴/۲۵

حسن عابدی کہتے ہیں:

میں نے دبی زبان سے عرض کیا۔"جوش صاحب اس میں غلطی کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔انہوں نے کہا"

"____ اس حد تک تو غلطی ممکن ہے کہ واقعات کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو یعنی جو واقعہ پہلے رونما ہوا تھا اس کا تذکرہ بعد میں کیا گیا ہو یا جو بعد میں رونما ہوا تھا اُس کا تذکرہ پہلے آ گیا ہو۔یہ بات میں نے "یادوں کی برات" کے شروع میں لکھ بھی دی ہے یا کوئی نام غلط دیا ہو مثلاً جہاں میں نے اپنے عزیز دوست حکیم صاحب عالم مرحوم کا تذکرہ کیا ہے۔وہیں اُن کے دو چھوٹے بھائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اُن میں سے ایک بھائی کا نام محمد نواب تو صحیح لکھ دیا لیکن دوسرے بھائی کا نام غلطی سے لڈن صاحب لکھ دیا۔حالانکہ اُن کا اصلی نام اعظم قدر عرف بڈھن تھا اور وہ بھی مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز تھے کتاب چھپ کر آئی تو اپنی یادداشت پر لعنت ملامت کرنے لگا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اہم واقعات حافظہ سے اوجھل ہو گئے ہوں اور وقت پر یاد نہ آئے ہوں لیکن جو واقعات درج کئے ہیں وہ من و عن صحیح ہیں۔آدمی بھول تو سکتا ہے لیکن بھول کر جھوٹا واقعہ نہیں لکھ سکتا ____" ☆

ہفت روزہ چٹان کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے یہی کہا تھا کہ:

"____ حافظے کی دنیا آپ جانتے ہیں عجیب ہوتی ہے،کوئی شے تسلسل سے یاد ہی نہیں آتی البتہ ایک احتیاط ضرور کی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر اور حافظے کی تہہ در تہہ گہرائیوں کو کھنگال کر لکھا ہے ____" ☆۱

ڈاکٹر وحید اختر کو یہ شکایت تھی کہ جوش صاحب نے اپنے مخالفین نیاز اور جگر کو یادوں کی برات میں نظر انداز کر دیا ☆۲،جگر کا تذکرہ تو نو دریافت (گمشدہ) صفحات میں موجود ہے تو وحید اختر کی اس رائے سے کیسے اتفاق کر لیا جائے دوسرے یہ کہ نیاز صاحب کے لیے بھی اُن کا دل بہت کشادہ تھا ماہنامہ نگار کے نیاز فتح پوری نمبر میں جوش صاحب نے بہت خلوص و محبت سے اُن کی یادیں سمیٹی ہیں۔راغب مراد آبادی نے جوش صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ:

☆ ____ کچھ دیر جوش صاحب کے ساتھ۔مشمولہ ہفت روزہ لیل و نہار،۲۵ تا ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء،ص:۱۰

☆۱ ____ حضرت جوش ملیح آبادی سے پندرہ سوال،اظہر سہیل،مشمولہ ہفت روزہ چٹان لاہور،۱۳ ستمبر ۱۹۷۱ء،ص:۱۱

☆۲ ____ ہماری زبان،علی گڑھ،۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء

''___ علامہ نیاز فتح پوری نے سالہا سال نگار میں آپ کے کلام پر تنقید کی اور اکثر خلاف بھی لکھا۔ اس کا بنیادی سبب کیا تھا___''

جوش صاحب نے جواب دیا:

''___ ایک بدگمانی، میں نے اس کا ذکر یادوں کی برات میں کر دیا ہے___'' ☆

اس بدگمانی کا ذکر یادوں کی برات میں نہیں آیا۔ یہ تذکرہ نگار کے 'نیاز فتح پوری نمبر' میں ہے البتہ گمشدہ اوراق جو دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سید علی اختر کے تذکرے میں نیاز صاحب کے روّیے کا ذکر ہے راغب صاحب کے اس سوال پر کہ یادوں کی برات میں آپ سٹی کورٹ کی صحبتیں بھول گئے ☆۱، انہوں نے جواب دیا کہ میں نے منور عباس کے ذکر میں اس کا ذکر کیا تھا لیکن منور ہی کا ذکر نکل گیا___ جوش صاحب کو یہاں بھی کچھ باتوں کا خیال نہیں رہا، یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن سے منور عباس کا جوذکر نکال دیا گیا تھا، اُس میں، اور قلمی نسخے میں موجود اُن کے تذکرے میں سٹی کورٹ کی صحبتوں اور بیٹھکوں کا کہیں بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ 'مکالمات جوش و راغب' کے مختلف سوالوں اور جوابوں میں ان صحبتوں کا کچھ تذکرہ ہوا ہے۔ وہ باتیں جوش صاحب کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں ان کی خودنوشت میں اس کا کہیں بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ ان کے ذہن نے کچھ مقامات پر باتوں کو خلط ملط کر دیا ہے، یہ سب کچھ انہوں نے عمداً نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت کے متعدد مسودے لکھے، قطع و برید میں کچھ باتیں یاد رہیں، کچھ نہیں رہیں۔

جوش صاحب نے یادوں کی برات سے کسی کے تذکرے کو اس وجہ سے خارج نہیں کیا کہ اُس شخص سے انہیں کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں تھی اور نہ کسی کا ذکر اس لیے شامل کیا کہ اس سے انہیں کسی مالی منفعت کا امکان ہے۔ مشفق خواجہ صاحب جو تحقیقی تگ ودو میں یقیناً اپنی ایک ساکھ رکھتے ہیں، ادب کے غیر جانبدار قارئین کی نگاہ میں اُن کی ساکھ اس وقت ضرور متاثر ہوتی ہے۔ جب وہ بغیر کسی تحقیق کے جوش صاحب کے بارے میں اس طرح کی رائے دینے لگتے ہیں۔

''___ جوش صاحب نے صرف انہی لوگوں کی تعریف کی ہے جن سے اُنہیں کوئی نہ کوئی مالی فائدہ پہنچا ہے۔ اسی معیار پر وہ ہر ملنے والے کو پرکھتے ہیں اور پھر اُس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں___'' ☆۲

☆___ مکالمات جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص:۹۶

☆۱___ جوش صاحب کے ساتھی منور عباس ایڈووکیٹ کے دفتر سٹی کورٹ میں ہفتہ وار بیٹھک ہوا کرتی تھی جس میں جوش صاحب پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ یہ صحبتیں کئی برسوں پر محیط تھیں۔

☆۲___ ہفت روزہ زندگی، کراچی، ۱۵ تا ۲۱ مارچ، ۱۹۷۱ء۔

یادوں کی برات میں جوش صاحب نے متعدد احباب وشخصیات کا تذکرہ کیا ہے اور اب جو یہ گمشدہ صفحات ملے ہیں ان میں تقریباً ۱۰۱ احباب کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بھی اپنی پوری ادبی زندگی میں انہوں نے ان گنت افراد پر تحریراً اظہار خیال کیا ہے، اُن کی باتیں کی ہیں، اُن پر لکھا ہے۔ مشفق خواجہ صاحب اگر موجود ہوتے تو یہ بات اُن سے براہ راست پوچھی بھی جا سکتی تھی کہ اس میں کتنے لوگ ہیں جن کی جاگیروں کے احاطے میں اور جن کے بینک بیلنس کے سائے میں جوش صاحب کا کھاتہ کھلا ہوا ہے۔ اس میں کتنے ہی مفلس شاعر، کتنے ہی مقروض ادیب اور کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کے پاس ذاتی گھر بھی نہیں ہے ☆

☆ ___ مشفق خواجہ صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ: ___ 'سرمایہ داری وسرمایہ داروں کے خلاف دہاڑنے والے شاعر انقلاب کو یادوں کی برات کے انتساب کے لیے روشن علی بھیم جی جیسے سرمایہ دار کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں ملا تھا ___' خواجہ صاحب مجھ سے ہمیشہ بہت محبت سے ملتے تھے، میں نے بھی اسی محبت واپنائیت سے انہیں یہ جواب دیا تھا کہ: ___ 'خواجہ صاحب روشن علی بھیم جی سے جوش صاحب کو کون سے خزانے مل گئے۔ انہوں نے یادوں کی برات کی اشاعت میں تعاون کیا، جوش صاحب کی شرافتِ کردار یہ تھی کہ انہوں نے اس کے بدل میں کتاب کا انتساب اُن کے نام کر دیا۔ بھیم جی صاحب جوش صاحب کا بہت احترام کرتے تھے لیکن انہوں نے کیا لعل وجواہر سے جوش صاحب کی جھولیاں بھر دیں؟ خورشید علی خاں کی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' جس میں آپ نے 'حرفے چند' کے عنوان سے ایک ابتدائیہ بھی لکھا ہے، اُسی میں خورشید صاحب نے یہ بات لکھی ہے کہ، جوش صاحب کے کہنے پر یہ بات معلوم کرنے کے لیے کہ یادوں کی برات چھپ گئی یا نہیں؟ وہ سبط حسن صاحب کے دفتر گئے۔ سبط حسن صاحب نے انہیں بتایا کہ ___ 'کتاب چھپ کر آگئی ہے اور اس کی جلد بندی بھی ہو گئی ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت ۳۰ روپے اور جلد کے بغیر ۱۵ روپے رکھی ہے۔ اس کتاب کی طباعت کے اخراجات کے لیے روشن علی بھیم جی صاحب سے ۲۰ ہزار روپے قرض لیے گئے تھے اب یہ کتاب دوکانداروں کو دی جائے گی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہو گی اس میں سے پہلے ۲۰ ہزار روپے وضع کر کے بھیم جی صاحب کا قرض ادا کیا جائے گا پھر باقی رقم میں خود جوش صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں گا ___'
خواجہ صاحب اب آپ خود بتایئے کہ کیا کسی کے دستِ سخاوت نے جوش صاحب پر یہ قارون کے خزانے کا دروازہ کھول دیا یا جوش صاحب کے ہاتھ میں صرف قلم ہی رہ گیا، جوش صاحب کے ہم عصروں اور اُن کے جونیئرز لکھنے والوں میں کئی معروف نام میں بتا سکتا ہوں، اپنے مفادات کے لیے بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ کے در دولت پر جن کی آمد ورفت رہتی ہے، جوش صاحب تو بقول تمکین کاظمی 'سیدھے سادے اجڈ پٹھان تھے ___ یقیناً انہیں کرپٹ معاشرے میں زندہ رہنے کا 'سلیقہ' ہی نہیں آیا ___'
مشفق خواجہ صاحب کی تحریروں میں جوش صاحب کے بارے میں ایک عجیب طرح کا تضاد نظر آتا ہے ایک طرف تو وہ ان کے بخیے ادھیڑنے میں کچھ تکلف روا نہیں رکھتے دوسری طرف یہ بھی انہی کی رائے ہے: ___ 'وہ بلاشبہ آج کے دور میں اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں بلکہ ہم یہاں تک کہیں گے کہ اگر ترازو کے پلڑے میں فیض احمد فیض سمیت تمام ترقی پسند شاعر بیٹھیں اور ایک طرف صرف جوش صاحب ہوں تو بھی جوش صاحب کا پلّہ بھاری رہے گا ___'
(جوش اور خامہ بگوش، مرتب، خواجہ عبدالرحمٰن طارق، فضلی سنز کراچی، سنِ اشاعت ندارد، ص: ۶۰)

کیا یہ قلمی نسخہ! چوتھا مسودہ ہے یا پانچواں؟

زیر بحث قلمی نسخہ جو اس وقت ہمارا موضوع ہے اس کے بارے میں بظاہر تو یہی کہا جائے گا کہ یہی وہ چوتھا، اور آخری مسودہ ہے جو کتابت ہو کر 'یادوں کی برات' میں تبدیل ہوا۔ یادوں کی برات کے کاتب اظہر عباس جعفری نے یہ تصدیق کی ہے کہ یقیناً یہی وہ مسودہ ہے جس سے انہوں نے کتابت کی تھی۔ اس پر اُن کی پینسل کی وہ لکیریں بھی ابھی مٹی نہیں ہیں جو کتابت شدہ صفحے کے اختتام اور نئے صفحے کے آغاز پر شناخت کے لیے ڈالی جاتی ہیں ـــــ یادوں کی برات کے مطبوعہ ایڈیشن سے اس قلمی نسخے کے ورق در ورق تقابلی مطالعے کے بعد ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ کیا واقعی یہ چوتھا مسودہ ہے ـــــ؟ جو نظروں کے سامنے ہے وہ تو یہی بتا رہا ہے کہ جوش صاحب نے گذشتہ تین مسودوں کی طرح پھر اس چوتھے مسودے پر قلم چلا کر اس کی مرکزی سرخیوں اور ذیلی سرخیوں کو تبدیل کیا، کئی جگہ خطِ تنسیخ پھیرا اور اسے پھر ایک نئے مسودے کی شکل دے دی جسے پانچواں مسودہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بظاہر تو جوش صاحب یہی کہتے ہیں کہ یہ چوتھا مسودہ ہے۔ اور یہ بات انہوں نے تسلسل سے کہی ہے فارغ بخاری اور راغب مراد آبادی سے گفتگو کرتے ہوئے اُن کے الفاظ یہ ہیں:

"ـــــ تین بار، یکے بعد دیگرے مجھے مسودے تلف کرنے پڑے اور آخر چوتھی بار اسے بڑے محتاط انداز میں پیش کیا ہے ـــــ" ☆

"ـــــ تین مسودے لکھے مکمل، ایک کی کتابت کرائی ☆۱، اُس کو بھی منسوخ کر دیا ـــــ"

۱۹۷۴ء میں جب جوش صاحب، یادوں کی برات کے لاہور ایڈیشن کے لئے کچھ اضافی تحریروں کو اسلام آباد میں ترتیب دے رہے تھے تو 'ملاقات و حکایات' کے مرتب امیر حسین چمن نے ان سے ایک انٹرویو کیا، اسی موضوع

☆ ـــــ شعلہ و شبنم، فارغ بخاری، مشمولہ دو ماہی، الفاظ، جولائی / اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص: ۲۳

☆۱ ـــــ جوش صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ایک مسودے کی کتابت کرائی گئی تھی۔ سرزمین امروہہ کے خوشنویس خاندان کے ایک بزرگ خوشنویس سید تہذیب حسین جنہیں کراچی کے نامور خوشنویسوں میں ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے انہوں نے (۱۹۹۱ء میں) مجھے بتایا تھا کہ ـــــ "راغب مراد آبادی ۱۹۶۸ء کے شاید آغاز میں (یا ۱۹۶۹ء میں) اُن کے پاس تشریف لائے تھے اور یادوں کی برات کی کتابت کے لیے کہا تھا یہ کتابت ڈھائی سے تین مہینے تک ضرور ہوئی تھی پھر نہ جانے کیا ہوا یہ کام بند ہو گیا۔ راغب صاحب کے ساتھ میں جوش صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور یہ جاننا چاہا کہ آخر کتابت کیوں روک دی گئی، کیا انہیں میرا خط پسند نہیں آیا انہوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے مسودے سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے کام روک دیا گیا ہے انہوں نے گذشتہ کام کا مجھے معاوضہ دینا چاہا تو میں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ جب کام ہی درمیان میں رک گیا اور آپ کا نقصان ہوا تو اس کا کیا معاوضہ لیکن وہ مصر رہے اور مجھے اُجرت لینا پڑی ـــــ

پر گفتگو کرتے ہوئے جوش صاحب نے ان سے ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی:

''____ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد، چند سال پہلے اس کا پہلا مسودہ مکمل ہوا، پڑھا تو لطف نہیں آیا، اسے ضائع کر دیا، پھر دوسرا، اور دوسرے کے بعد تقریباً ایک ہزار صفحات کا تیسرا مسودہ قلم بند کیا۔ اس کی کتابت مکمل ہو گئی مگر پروف ریڈنگ کے دوران اندازہ ہوا کہ بات کچھ بنی نہیں، اس کے بعد چوتھے مسودے کے فائنل ہونے کی باری آئی، ہر چند کہ یہ بھی میرے معیار اور مقصد پر پورا نہیں اُترتا تھا لیکن اب مجھ میں مزید ہمت نہیں تھی کہ ایک اور مسودہ لکھنے بیٹھوں ____'' ☆

مستند و معتبر، محقق، رشید حسن خاں نے یادوں کی برات کے مسودوں ہی کے ذیل میں یہ بات کہی کہ ''____ تین مسودے مرتب کیے اور پھاڑ کر پھینک دیے گئے، معلوم نہیں اس میں حقیقت کتنی ہے ____'' ☆۱

اس رائے میں شکوک وشبہات کی بے یقینی صاف جھلک رہی ہے۔ المیہ یہی ہے کہ جب صاحب نظر محقق بھی بغیر تحقیق وتصدیق کے ایک غیر ذمہ دارانہ رائے قلم بند کرتے ہیں تو پھر بعد کے خصوصاً نئی نسل کے محققین اس رائے کے نشان سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور اگر یہ محقق رشید حسن خاں جیسا با اعتبار محقق ہو تو پھر چوں چرا کیے بغیر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے اور یوں حوالہ در حوالہ اور اقتباس در اقتباس ناقص اور غیر مصدقہ نقطۂ نظر تحقیق میں اپنی جگہ بنانے لگتا ہے ____

یادوں کی برات کے قلمی نسخے کا ہر صفحہ خود بولتا ہے کہ جوش صاحب نے اس پر کتنی محنت کی ہے، اور اپنے سابقہ مسودوں سے اس مسودے کو کیونکر ایک الگ مسودہ بنایا ____ یہ پورا مسودہ جوش صاحب نے ایک سطر چھوڑ کر لکھا۔ ان کی متعدد غیر مطبوعہ، ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں میری نظر سے گزری ہیں۔ یہ ان کا وطیرہ نہیں رہا کہ وہ ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔ لیکن یادوں کی برات کے (صرف چند صفحات کو چھوڑ کر) ۱۴۰۰ سے زیادہ صفحات ایک سطر چھوڑ کر لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ روش اس لئے اختیار کی کہ اپنے ہی لکھے ہوئے مضامین اور تذکروں کو کاٹ چھانٹ اور کمی بیشی کے لئے جگہ درکار ہو گی۔ ان کی یہ طویل وضخیم خودنوشت یقیناً اس کی متقاضی تھی کہ اس کا خیال رکھیں کہ انہیں پھر لکھنا ہو گا اور پھر کاٹنا ہو گا۔

پانچواں مسودہ

یہ بات تو اسی مقدمے میں، پہلے بھی لکھی جا چکی ہے کہ یادوں کی برات جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی، تو ایسا نہیں تھا

☆ ____ ملاقات و حکایات، امیر حسین چمن، پرنٹ میڈیا پبلشر، کراچی / اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص: ۷۷

☆۱ ____ جوش بحیثیت انشاء پرداز۔ مشمولہ، ماہنامہ فنون، لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۲ء ____ اور ____ مشمولہ: جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتب، ڈاکٹر قمر رئیس، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، دہلی، ۱۹۹۳ء

کہ جوش صاحب نے اس کی تدوین وطباعت سے چار پانچ برس پہلے اسے لکھنا شروع کیا ہو۔ روحِ ادب کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۴۳ء) میں اُن کی جو ایک تحریر ہے اُس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُسی زمانے میں انہوں نے کچھ بنیادی باتیں اور یادیں لکھنا شروع کر دی تھیں تاکہ وہ کہیں انہیں بھول نہ جائیں، پھر جب ان میں تبدیلیاں کرتے تھے تو اوّلین تحریروں والے کاغذات ضائع کر دیتے تھے۔

شاعری میں تو جوش صاحب کے مسودے قابلِ دید ہیں، صفحے پر کسی ایک طرف قوافی کا تسلسل، کہیں الفاظ کی تلاش کے نشانات اور کہیں 'متعلقاتِ بشری' سے متعلق الفاظ کا اہتمام ___ اس کے بعد کے صفحے پر ان کے عکس تحریر میں یہ دونوں صفحات آپ کے سامنے ہیں ___ جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نفاستِ خیال کے انتہائی راستوں پر کتنی دور تک جاتے تھے۔

جوش صاحب نظموں میں رد و بدل اور تراش و خراش کو 'مُنھلائی' کہا کرتے تھے۔ راغب مراد آبادی نے اُن کی نثر نویسی کے حوالے سے یہ بات اُن سے پوچھی تھی کہ:

"___ کیا آپ نثری تخلیقات پر بھی نظرِ ثانی، ثالث یا رابع کرتے ہیں ___"

جوش صاحب نے جواب دیا تھا کہ: "___ صرف نظرِ ثانی کرتے ہیں ___" ☆۱

یہ درست ہے کہ اپنی شاعری کے مقابلے میں وہ اپنی نثر پر نظرِ ثانی ہی کیا کرتے تھے، اپنی کسی چھوٹی موٹی تحریر، کسی مختصر دیباچے یا پیش لفظ کو بھی لکھنے کے بعد وہ دوسری بار دیکھ لیا کرتے تھے، خط لکھنے کے بعد بھی اُس پر ایک اُچٹتی سی نظر ضرور ڈال لیتے تھے لیکن نثر پر صرف نظرِ ثانی کرنے والی بات کو یادوں کی برات کے سلسلے میں، تسلیم کرنے پر میں آمادہ نہیں۔ اُن کی یہ خودنوشت اُن کا ایک ایسا نثری ذخیرہ ہے جسے انہوں نے متعدد بار دیکھا ہے، لکھا ہے، کاٹا ہے، پھر نئے سرے سے لکھا، پھر اُسے رد کر دیا ___ تب جا کر ایک نئی شکل سامنے آسکی۔ وہ تو خود یہ بات کہتے ہیں کہ انہوں نے کئی مسودے لکھے اور رد کر دیے۔

ہمارے پیشِ نظر جو فہرست تھی اُس میں یادوں کی برات کے مقابلے میں قلمی نسخے کی جداحیثیت، بہت واضح ہوئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چوتھے مسودے کی یہ ایک نئی ترمیم شدہ صورت ہے جسے پانچواں مسودہ کہنا حق بہ جانب ہوگا۔ قلمی نسخے کی فہرست میں متعدد ذیلی سرخیاں ایسی ہیں جنہیں جوش صاحب نے بعد میں منسوخ کر دیا۔ نئی مرکزی سرخیاں اور نئے ابواب قائم کیے گئے، جہاں بریکٹ تھے انہیں کھول دیا گیا، رد و بدل کا یہ سلسلہ سوانحِ حیات کے ان حصوں میں زیادہ ہے جو آل انڈیا خلافت کانفرنس کے موضوع کے بعد سے (قلمی نسخہ ۳۷۴،۳۷۳) میری موجودہ زندگی کی چند جھلکیاں (قلمی نسخہ ۶۱۲) تک جاتا ہے۔ یہ روداد حیات اور یہ واقعات اپنے پس منظر میں وسیع تہذیبی، سماجی اور سیاسی عوامل رکھتے ہیں۔ جنہیں جوش صاحب نے قلم روک کر لکھا ہے۔

☆۱ ___ مکالماتِ جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، کینیڈا ۱۹۸۸ء، ص: ۴۵

یادوں کی برات کے ابتدائی مسودوں میں کافی کاٹ چھانٹ تھی۔ خصوصاً اجداد کے تذکرے، میرے دور کی چند عجیب وغریب ہستیاں اور ملیح آباد کے حالات پر، انہوں نے بار بار قلم چلایا تھا۔ جوش صاحب کے رشتے کی ایک بہن خدیجہ بیگم کے فرزند حاجی اشتیاق احمد خاں ☆ نے مجھے بتایا کہ:

"____ جوش صاحب جب یادوں کی برات لکھ رہے تھے، تو کئی واقعات کی تصدیق کے بارے میں وہ مجھ سے دریافت کرتے اور صلاح ومشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ بعض واقعات میں حافظہ ساتھ نہیں دیتا____"

حاجی اشتیاق یہ بھی بتاتے ہیں کہ جوش صاحب اپنی بہنوں سے بھی بعض واقعات کی تصدیق کیا کرتے تھے۔ حاجی اشتیاق کے علاوہ جوش صاحب کی حقیقی بھانجی صفیہ شمیم نے بھی مجھے یہ بتایا تھا کہ ماموں (جوش صاحب) اُن سے یہ پوچھا کرتے تھے کہ تمہاری ماں انیس جہاں بیگم ملیح آباد کے کیا کیا واقعات سناتی تھیں۔ اور پھر ان کی روشنی میں وہ اپنے لکھے ہوئے کو پرکھا بھی کرتے تھے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا تخلیق کار ہو جس نے اپنی تحریروں کو اتنے انہماک، ایسی سرگرمی اور اس شدومد سے دیکھا ہو۔ ان کے مخالفین میں سے بعض نے تو انہیں محنت اور فرض شناسی سے راہِ فرار اختیار کرنے والا آدمی قرار دیا ہے۔ جبکہ ممتاز حسن صاحب کے الفاظ میں:

"____ ان کی فرض شناسی اور محنت کی عادت بلکہ کہنا چاہیے کہ کام کی لت، ایسی چیزیں ہیں کہ ان کا اعتراف نہ کرنا بڑی بے انصافی ہوگی____" ☆۱

۱۹۶۱ء کے بعد کے زمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے صہبا لکھنوی نے لکھا ہے کہ:

"___ جوش صاحب ان دنوں یادوں کی برات کے مسودے پر تیسری مرتبہ نظر ڈال رہے تھے___" ☆۲

☆____ حاجی اشتیاق، جوش صاحب کے لڑکپن کے انتہائی قریبی دوست مختار احمد خاں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ جوش صاحب نے یادوں کی برات کے باب، میرے چند قابلِ ذکر احباب، میں مختار احمد کا خاں تذکرہ کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ وہ میرے ساتھ کھیلے ہوئے پڑوسی اور میرے باپ کے رفیق مشیر احمد خاں کے بیٹے ہیں۔ (ص: ۳۲۳) اپنے شعری مجموعے نقش و نگار (۱۹۳۶ء) میں جوش صاحب کی دو نظمیں، مختار احمد خاں (۱۹۲۲ء) اور مختار واپس آ (۱۹۲۵ء) انہیں کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ حاجی اشتیاق احمد خاں، عمر میں جوش صاحب سے ۱۸ سال چھوٹے ہیں۔ ان کی ولادت مرزا گنج ملیح آباد کی ہے۔ جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد حیدر صاحب کے مکان واقع بفرزون، کراچی میں ۲۷ راگست ۱۹۹۶ء کو اُن سے میری تفصیلی ملاقات ہوئی، جس میں، اُن سے میں نے ایک طویل انٹرویو کیا جوش صاحب کی پوتیاں ساجدہ اور تبسم بھی اس وقت موجود تھیں۔ حاجی اشتیاق احمد خاں نے، جوش صاحب کی زندگی کے بعض ایسے واقعات بھی سنائے جن کا ان کے علاوہ اب کوئی دوسرا راوی نہیں۔

☆۱____ پیغامات، تاثرات، مشمولہ، ماہنامہ افکار جوش نمبر، ۱۹۶۱ء، ص: ۶۳۳

☆۲____ افکار بیادِ جوش نمبر، جولائی ۱۹۸۲ء، ص: ۸۵

اور یہ نظر ڈالنا سرسری نہیں ہوا کرتا تھا صرف یہی نہیں کہ لفظ بدل دیا یا ایک دوسرا جملہ لکھ دیا وہ تو متن کے دروبست سے گزر کر جب تک ایک نیا پیکر تراش نہیں لیتے تھے، مطمئن نہیں ہوتے تھے ___ یادوں کی برات ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی اس سے چار برس پہلے ۱۹۶۶ء میں ترقی اردو بورڈ کے جریدے 'اردو نامہ' میں اور ۱۹۶۷ء میں انجمن ترقی اردو کے رسالے 'قومی زبان' میں یادوں کی برات سے کچھ تحریریں شائع ہوئیں جن کا انتخاب جوش صاحب ہی نے کیا تھا۔ ان دونوں رسالوں سے ایک ایک اقتباس اور اس کے مقابل شائع شدہ یادوں کی برات سے وہی مضمون نقل کیا جا رہا ہے ___ ان اقتباسات کے بعد دو مختلف مسودوں سے ایک ہی موضوع پر، ایک ایک صفحہ اُن کے عکس تحریر میں ملاحظہ کیجئے گا، ان سب پر غور کیجئے تو مسودوں پر جوش صاحب کی محنت وریاضت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(تیسرا مسودہ)

طلوعِ صبح کا پہلا دیدار

میرے گھر میں رات کے دو بجے تک دن رہتا تھا، اور، دو بجے رات سے لے کر دن کے دس گیارہ بجے تک، رات رہا کرتی تھی ___ ایک ایسے ماحول میں سحر خیزی اور طلوع بینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

لیکن سال میں دو تین مرتبہ اس صورت حال میں تبدیلی بھی ہوا کرتی تھی۔ یعنی میرے باپ جس روز اپنے علاقے کے دورے کے واسطے جانے والے ہوتے تھے، شام ہی سے سو جاتے اور تڑکے بیدار ہو جایا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک روز جب کہ میرے باپ دورے پر جانے والے تھے، ہماری پرانی ماما 'بوالحافظن' نے میرا شانہ ہلا کر آواز دی، منجھلے بھیا اٹھو، میاں کے ساتھ گاؤں کے جانا ہے۔

آنکھ کھلتے ہی میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ ہے کیا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اندھیرے میں اُجالا، اُجالے میں اندھیرا۔ میں نے تو یہ

(چوتھا مسودہ)

طلوعِ صبح کا اوّلیں دیدار

ہمارے گھر کے اندر، لطیفوں، نقلوں اور کہانیوں کی بناء پر، دن رہتا تھا، رات کے گیارہ بجے تک، اور رات رہتی تھی، دن کے بارہ، ایک بجے تک ___ اس لئے، اس غیر فطری ماحول میں پلا ہوا بچہ واقف ہی کیوں کر ہو سکتا تھا، صبح کی رنگینیوں سے۔

کیوں کر مالا مال ہوا میں اس دولتِ بیدار سے، اور کیوں کر یہ قرآن اُترا میری آنکھوں پر، اس کی روداد بھی سن لیجئے۔ میرے باپ، ربیع و خریف کے زمانے میں، دو بار اپنے علاقے کے دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے، صبح تین چار بجے۔ ایک بار جب وہ دورے پر جانے والے تھے، تو میں نے درخواست کی تھی کہ میاں ہمیں بھی اپنے ساتھ لیتے چلئے گا۔ تو انہوں نے میری یہ درخواست منظور کر کے، بوالحافظن کو مامور فرما دیا تھا کہ مجھ کو، بہت تڑکے، جگا دیں۔

اب سنئے اللہ کا کرنا کیا ہوتا ہے ___ جب لحافظن

سماں کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں بستر سے اُٹھا، انگنائی میں آیا، آسمان دیکھا اور انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ ارے دن ہی ہے نہ رات اور ان دونوں کی چھاؤں میں یہ کون آرہا ہے، یہ کالی اوڑھنی میں کون لچکا ٹانک رہا ہے، یہ دھویں کے خیموں کے گرد، کون منقش کی قناتیں کھڑی کر رہا ہے___ میں نے تو ایسا جادو کا سماں کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ میں حیران کھڑا ہوا تھا کہ یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے___ ارے اتنی چیزیں ایک وقت میں۔

سرمہ، کاجل، ململ، کریب، سونا، چاندی، لچکا پٹھا، ابیر، گلال، اور ان سب کے اوپر گھومتا ہوا کندن کا تھال۔

میں دیوانہ وار نیم کے نیچے آیا، نیم کی خوش بو، ناک میں پہنچی، نشہ سا چڑھ گیا___ شاخوں پر چڑیاں پھدک کر چوں چوں کر رہی تھیں۔ کوے منڈیروں پر بول رہے تھے اور ان کی قاؤں قاؤں کی چھاؤں میں بھیرویں ناچ رہی تھی۔

نشے میں جھومتا مردانے میں آیا، دیکھا کہ آسمان پر گلابیاں جھلک رہی ہیں، رنگ برس رہا ہے، اذان کی آواز دوشِ صبا پر لہرا رہی ہے___ ایک گوشے میں میرے باپ کی سواری کا میانہ سجا سجایا رکھا ہوا ہے، کہار چلمیں پی پی کر کھانس رہے ہیں، "لا الہ الا اللہ" کی آوازوں کے ساتھ منہ دھو دھو کر کمریں کس رہے ہیں، تلواریں بندوقیں چمک رہی ہیں، گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر، دُمیں ہلا رہے ہیں، ایک طرف حبشی کھڑی جھوم رہی ہے، حبشی پری نظر آرہی ہے، اور گنگناتے الاؤ میں زہرا کی بوا نے، بہت تڑکے، مجھ کو، جھنجھوڑ کر، جگایا کہ بھیا اُٹھ بیٹھو، میاں کے ساتھ گاؤں جانا ہے، تو میں اُٹھ بیٹھا___ اور، آنکھیں مل کر، نگاہ اُٹھائی، تو! بڑی حیرت کے ساتھ جب یہ دیکھا کہ دھندلے سنگِ مرمر کی تراشیدہ، اور دھوپ چھاؤں کی پروردہ، نیم پیدا و نیم پنہاں، گنگا جمنی پریاں، نقابوں کے سہروں کو چٹکیوں میں تولے، رسمساتے آسمان سے، کسمساتی زمین کی طرف، اُڑتی چلی آرہی ہیں تو میرے دل نے پوچھا ارے یہ ہو کیا رہا ہے، اور یہ سب کچھ ہوا کیا جا رہا ہے!___ دن ہے نہ رات۔ اندھیرا ہے نہ اُجالا۔ اندھیرے میں اُجالا ___ اُجالے میں اندھیرا___ صباحت میں ملاحت، ملاحت میں صباحت___ سُرمئی نقاب، گندنی مکھڑا___ سُرخی میں، گدرائی فضا کی انگڑائیاں آدھے جلوے، آدھی جھائیاں___ ظلمات میں، آبِ حیات کا آبشار، آبنوس کے شہر میں، مصر کا بازار___ ایک طرف مخمل، کم خواب، سُرمہ، کاجل، گیسو، ململ، کریب اور ریشم، اور، ایک طرف، افشاں، سلما، ستارہ، قشقہ، غازہ، گوٹا، کناری، سونا، چاندی، مرمر، لچکا، پٹھا، ابیر، اور گلال، فضا پر سنہرے تاروں کا جال، اور بڑی آہستگی کے ساتھ، اُبھرتا ہوا، کندن کا تھال۔

شلنگیں بھرتا نیم کے نیچے گیا، شاخ پر چہچہاتی چڑیاں، پھُر امار کر، اُڑ گئیں، ہات پھیلا کر، نیم کو چھاتی سے لگا لیا، ڈالی کو جھکا کر، اس کی پتیوں کو چوم لیا، مرغانِ سحری کی بانگ نے، خون کو گرم کر دیا___ دیوانہ وار مردانے میں پہنچا___ دیکھا کہ

کمر لچک رہی ہے تاک دھنا دھن، تاک! نہ جانے دل میں، یکا یک، کیا ترنگ آئی کہ میں دوڑ کر سامنے والے، کمرے میں داخل ہو گیا، دیکھا آئینہ رکھا ہوا ہے، جھٹ سے آئینہ اُٹھالیا، اپنا منہ دیکھا۔☆

میانہ صحن میں رکھا ہوا ہے، میانہ محمل نظر آیا، کہار، چلمیں پی پی کر، کھانس رہے ہیں، ان کی کھانسی بھی اچھی لگی، سپاہی "لا الہ الا اللہ" کہہ کر، منہ دھو رہے ہیں، اُن کے جھپکوں کی آواز نے دل موہ لیا۔ پھاٹک کے قریب، گھوڑے، دُمیں ہلا رہے ہیں، کنویں کے پاس کھڑی ہوئی ہتنی، جھوم رہی ہے، الاؤ کے گرد پاسی[۱] بیٹھے تاپ رہے ہیں، الاؤ کی اچھلتی آنچ میں، زہرا کی کمر لچک رہی ہے۔ اور، یہ سارا سماں، اندر کے اکھاڑے میں تبدیل ہو گیا ــــ میں وحشی چکارے کے مانند، دوڑ کر، سامنے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے، کی سموئی ہوئی گرمی سردی سے، جی خوش ہو گیا ــــ میں، ذرا سا مڑ کر، اور ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر، اپنا منہ دیکھنے لگا۔☆۱

(دوسرا مسودہ)

اس دورِ تصوف و تقشف میں میری سب سے پہلی مصور تصنیف "روحِ ادب" غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی جس میں میرے بزرگ لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی اور میرے دوست رفیع احمد خاں کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ اس مجموعے کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ افریقہ و

(چوتھا مسودہ)

اُسی دورِ تصوف و تقشف میں، میری سب سے پہلی، سترہ تصویروں والی، مصور تصنیف "روحِ ادب" غالباً میتھوڈسٹ پریس لکھنؤ سے رفیع احمد خاں کے مقدمے، اور حضرت اکبر کی رائے کے ساتھ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ہاتوں ہات فروخت ہو گئی تھی۔
"روحِ ادب" پر سب سے پہلے تعریفی تبصرہ کیا

☆ ــــ طلوعِ صبح کا پہلا دیدار، جوش ملیح آبادی، مشمولہ، اردو نامہ، شمارہ ۲۴ ، جون، ۱۹۶۶ء، ص: ۲۳-۲۶

☆۱ ــــ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۶۱-۶۲

۱ ــــ ایک ادنیٰ قوم جس سے زمیں دار پولیس کا کام لیتا ہے

رنگون وغیرہ نے بھی اس کے آرڈر آئے تھے
ـــــ "روحِ ادب" پر سب سے زیادہ تبصرہ کیا تھا۔
میرے اُس دور کے حبیب اور اِس دور کے حریف
مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے، جن کی
محبت کے غلو نے، میرے سے ہیچ مداں نو خیز
شاعر کو، غالب و ٹیگور کی صف میں لے جا کر بٹھا
دیا تھا اور "روحِ ادب" کی تنقیص پر سب سے
پہلے قلم اُٹھایا تھا سجاد انصاری مرحوم نے اس
وقت ماجد صاحب "کفر" سے منہ موڑ کر پھر
اسلام کی جانب آ چکے اور سجاد انصاری حلقۂ
اسلام سے بھاگ کر 'کفر' کی جانب افتاں وخیزاں
چلے جا رہے تھے۔ اور یہ ایک رسم بن چکی تھی کہ
ادب کے میدان میں وہ دونوں ایک دوسرے کے
ممدوح پر سب وشتم کیا کرتے تھے۔ اسی دوران
میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال نے بھی
ایک طویل خط لکھ کر مجھ کو "روحِ ادب" کی بہت
داد دی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر
فرمایا تھا کہ "کوئی شک نہیں کہ آپ کے ساغر تو
بالکل نئے ہیں ایسے نئے کہ انہیں دیکھ کر غبطہ پیدا
ہوتا ہے۔ مگر ان ساغروں میں شراب بھری ہوئی
ہے۔ وہ ہی پرانی۔ آپ حافظ اور ٹیگور سے بہت
زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو آگاہ
کرتا ہوں کہ ان دونوں کی شاعری اُبھار نہیں
پستی پیدا کرتی ہے۔ یہ انسان کو جگاتے نہیں،
بلکہ تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ آپ حافظ اور ٹیگور
سے دامن چھڑا لیجئے۔ فکری اور حرکی شاعری کی
طرف آیئے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی

تھا میرے اُس دور کے اجنبی اور اس دور کے
دوست اسرائیل احمد خاں اور میرے اُس دور
کے مدّاح اور اس دور کے معترض، حضرت مولانا
عبدالماجد دریابادی نے ـــــ اور سب سے پہلے
اعتراض کیا تھا سجاد انصاری مرحوم نے۔ اس
وقت "مسٹر"، "عبدالماجد" "مولانا" عبدالماجد،
کی جانب سفر کر رہے تھے اور کفر سے منہ موڑ
کر، اسلام کی جانب آ چکے تھے۔ اور سجاد انصاری
حلقۂ اسلام سے بھاگ کر، کفر کی جانب، افتاں و
خیزاں چلے جا رہے تھے۔ اور فریقین کے مابین
یہ غیر تحریری وغیر ملفوظی معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ ایک
دوسرے کے خلاف لکھیں، اور ایک دوسرے کے
ممدوح پر سب وشتم کریں گے۔

اور چوں کہ مولانا عبدالماجد نے، اپنی محبت کی بنا
پر مجھ کو غالب و ٹیگور کی صف میں بٹھا دیا تھا، اس
لئے سجاد انصاری پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ مجھے
شیاطین کے زمرے میں شامل کر دیں۔

اُسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبال
نے بھی، ایک طویل خط لکھ کر، میری شاعری کی
مدح سرائی فرمائی اور دل کھول کر داد دی تھی۔ اور
پنجاب یونی ورسٹی سے "روحِ ادب" کے تین سو
نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا ـــــ اور اسی کے
ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ، ہر چند میرے
ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ اُنہیں،
دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں شراب
بھری ہوئی ہے وہی پرانی، اس لئے مجھ کو چاہیے
کہ میں حافظ اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری

بے پناہ خداداد استعداد سے مجھ کو یقین ہے کہ آپ صفِ اوّل کے شعراء سے بھی سبقت لے جائیں گے۔ اس وقت میری طبیعت کا دھارا تصوف کے میدان میں بڑے زور شور سے، گونج رہا تھا، اس لئے حضرت اقبال کی نصیحت بزرگانہ کا اثر میں نے قبول نہیں کیا۔

لیکن آگے بڑھ کر، جب، میرا مزاج "روحِ ادب" سے مختلف ہونے لگا اور تصوف سے گزر کر میرے کلام نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ اور پھر سیاسی میدان سے آگے بڑھ کر جب میری شاعری تجسس وتشکک کی طرف مڑنے لگی تو اس وقت میرے دل میں یکا یک یہ خیال پیدا ہوا کہ ہونہ ہو، یہ حضرت اقبال ہی کی نصیحت کا اثر، اور یہ سب کچھ انہیں کا فیضان ہے، اس لئے کہ شنیدہ اثر ے دراد۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اقبال جس نے مجھ کو ٹوکا اور جس روش سے مجھے روکا، وہی عظیم اقبال چولا بدل کر۔ حافظ کے راستے پر خود گامزن ہو گیا۔☆

شاعری کی طرف آ جاؤں، اور حافظ و خیام کی طرح تھپک تھپک کر سُلانے کے عوض، انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں۔

لیکن اس وقت میری تخئیل کا دھارا، بڑے زور و شور سے تصوف کی پُر اسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا، ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ لیکن "شنیدہ اثرے دارد" کے طور پر اُن کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے، مجھ پر اثر کرتی رہی، اور جب چند ماہ و سال کے بعد، میری طبیعت "روحِ ادب" کے مزاج سے مختلف ہونے لگی، تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا، اور سیاست سے مڑ کر، جس وقت میری شاعری تجسس وتشکک کی جانب گامزن ہو گئی تو، میرے ناصح حضرت اقبال کی شاعری، اقوال، روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی۔☆۱

☆ ــــ بیادِ اقبال (یادوں کی برات سے ایک حصہ) جوش ملیح آبادی، مشمولہ، ماہنامہ قومی زبان کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، شمارہ اپریل ۱۹۶۷ء، ص: ۱۱-۱۲

☆۱ ــــ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۱۸۳-۱۸۴

ڈیڑھ ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل قلمی نسخے سے، اُن کے عکسِ تحریر میں ایک ہی موضوع پر صرف دو اقتباس نقل کیے گئے ایسی متعدد مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ اُن کے عکسِ تحریر سے پہلے ادبی رسائل اور یادوں کی برات سے بھی جو اقتباس دیے گئے تھے وہ آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ قلمی نسخے اور اس کے مقابل (مطبوعہ) یادوں کی برات کی ذیلی سرخیاں و مرکزی سرخیاں ہی ایک نظر دیکھ لی جائیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ جوش صاحب نے چوتھے مسودے کو بھی بہت تبدیل کیا۔ پھر قلمی نسخے کی فہرست میں یہ بھی دیکھئے کہ جوش صاحب نے اپنے خاندان کا تذکرہ سب سے آخر میں کیا ہے۔ لیکن جب اسے کتابت و اشاعت کے لیے دیا گیا تو انہوں نے اس کی ترتیب بھی یکسر بدل دی مطبوعہ یادوں کی برات، اس یادوں کی برات سے واضح طور پر الگ ہے جو قلمی نسخے میں ہے ___ تو اس مسودے کو چوتھا مسودہ کیوں کہا جائے؟۔ کیا یہ پانچوں مسودہ نہیں ہے؟
جوش صاحب نے یادوں کی برات کے آغاز ہی میں لکھا ہے:

> "___ میں نے اپنے حالات زندگی قلم بند کرنے کے سلسلے میں، کامل چھ برس تک، زیادہ تر مسلسل، اور گاہ گاہ غیر مسلسل، عرق ریزی کی ہے۔ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد پہلا مسودہ طیار کیا، اُسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا پھر ڈیڑھ برس میں دوسرا مسودہ مکمل کیا، اُس پر بھی تنسیخ کا خط کھینچ دیا، پھر ڈیڑھ پونے دو سال صرف کر کے، نو سو صفحات کا تیسرا مسودہ تحریر کیا، اور تین ہزار میں اُس کی کتابت بھی مکمل کرالی۔ مگر جب اُس پر غائر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ اس مسودے کو بھی ایک ایسے گھبرائے ہوئے آدمی کی طرح لکھا ہے، جو صبح کو بیدار ہو کر، رات کے خواب کو، اس خوف سے، جلدی جلدی، اُلٹا سیدھا، لکھ مارتا ہے کہ کہیں وہ ذہن کی گرفت سے نکل نہ جائے۔ اور خدا خدا کر کے، اب یہ چوتھا مسودہ شائع کیا جا رہا ہے۔
>
> اور میرے دل کی بات آپ پوچھیں تو یہ بھی کہہ دوں کہ میں اس چوتھے مسودے سے بھی مطمئن نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں اب مجھ میں دم باقی نہیں رہا ہے کہ، دو برس مزید عرق ریزی کر کے، پانچواں مسودہ لکھوں، اور اسے بھی قلم زد کر دوں۔ اور، اُس کے ساتھ ساتھ، یہ بھی سوچتا ہوں کہ اب میرے چل چلاؤ کا وقت، سر پر آ پہنچا ہے، اور:— جرس فریادمی دارد کہ بر بندید محمل ہا" ___ کی آوازیں برابر کانوں میں چلی آ رہی ہیں، اور یہ مصرعہ کہ: ___
>
> "نسیم، جاگو، کمر کو باندھو، اُٹھاؤ بستر، کہ رات کم ہے"
>
> دل میں گونجتا رہا ہے، اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ___ تحریر ہی میں خدا کے فضل و کرم سے، موت آجائے، اور مسودہ ناتمام پڑا رہے اس لئے اب جیسا بھی ہے،

چند ابتدائی باتیں

(مسودوں کی تنسیخ)

(یادوں کی برات کا پہلا صفحہ)

یادوں کی برات کا دوسرا صفحہ جس کی آخری سطر میں جوش صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اب پانچواں مسودہ پیش کر رہے ہیں مطبوعہ میں
چوتھا مسودہ شائع ہوا ہے

یہ چوتھا مسودہ پیش کر رہا ہوں ____ " ☆

اس اقتباس کی آخری مطبوعہ سطر یہ ہے ' ____ اس لئے اب جیسا بھی ہے یہ چوتھا مسودہ پیش کر رہا ہوں ____ '

اگر جوش صاحب کے عکسِ تحریر میں، اسی زیرِ بحث صفحے کو جس سے حوالہ دیا گیا ہے، (داہنے ہاتھ کے صفحے پر) آپ ملاحظہ کیجئے تو جوش صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی اس آخری سطر میں انہوں نے اسے پانچواں مسودہ ہی کہا ہے۔ عکسِ تحریر میں آخری سطر پڑھ لیجئے جو یہ ہے:

' ____ اس لئے اب جیسا بھی ہے یہ پانچواں مسودہ پیش کر رہا ہوں ____ '

پروف ریڈنگ کے وقت پانچواں کو پھر چوتھا کر دیا گیا۔ قلمی نسخہ بتاتا ہے کہ جوش صاحب نے اسے بھی متعدد بار پڑھا۔ کتنی ہی ذیلی سرخیاں ہیں جنہیں کاٹ دیا، ابواب نئی جگہ قائم کئے، پیراگراف کو نئی صورت دی، ایک سطر چھوڑ کر لکھے گئے مسودے میں بہ اعتبار زبان واسلوب بھی فقروں کی ساخت بدل دی، یہاں تک کہ اس کی ترتیب کو بھی تبدیل کر دیا۔

قلمی نسخے میں ایک ایک صفحے پر جو کئی کئی نمبر پڑے ہوئے ہیں، یہ اس لئے ہیں کہ وہ مسودے کی ترتیب کو بدلنے کے باوجود بھی مطمئن نہیں تھے، اور جب پورا مسودہ پھر پڑھتے تو پھر اس کا حلیہ بدلنے کا ارادہ کر لیتے۔ یہ قلمی نسخہ جو ۱۲ کاپیوں میں لکھا ہوا ہے یہ دراصل اس خودنوشت کی وہ صاف شکل ہے جو تین مسودوں کی قطع و برید اور ان گنت صفحات کو منسوخ کر دینے اور پھاڑ دینے کے بعد نظر آئی ہے۔ ☆۱

اور اسی مسودے پر جسے وہ چوتھا مسودہ کہہ رہے ہیں ان کا قلم چلتا رہا، اس کی صفائی ستھرائی میں بھی اتنا وقت لگا کہ قلمی میں ابتدائی صفحے پر جو یہ جملہ لکھا ہے ' ____ کچھ اوپر ستر برس کی پہاڑ سی زندگی کا احاطہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ____ کتابت سے پہلے ' کچھ اوپر ستر برس ' کو کاٹ کر انہوں نے ' چہتر برس ' لکھ دیا اور یہی فقرہ یادوں کی برات میں شائع ہوا۔

اس مسودے پر جوش صاحب نے سب سے زیادہ محنت ۱۹۶۸/۶۹ء کے زمانے میں کی، ۱۹۶۷ء میں وہ ہندوستان گئے تھے، انہوں نے وہاں کچھ قیام بھی کیا تھا۔ بہت سے چہرے، کئی ہم عصر، ان کے چاہنے والے

☆ ____ یادوں کی برات، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء، ص: ۲۳-۲۳

☆۱ ____ جوش صاحب کی اہلیہ اشرف جہاں صحت کی خرابی اور مسلسل اعضا شکنی کے سبب بہت کمزور ہو چکی تھیں ورنہ وہ ان پھٹے ہوئے منسوخ صفحات کو ضائع نہ ہونے دیتیں۔ کراچی میں فیڈرل بی ایریا والے مکان میں جو نواسے ان کے ساتھ رہتے تھے ان میں فرخ جمال اور سراج انور خاں میں یہ تڑپ اور کسی حد تک یہ سنجیدگی ضرور تھی کہ ان کے نانا (بابا) کی تحریریں برباد نہ ہوں لیکن بہ اعتبار سن وسال ابھی یہ دونوں نواسے شعور کی اس منزل پر نہیں تھے کہ ان نزاکتوں کو بخوبی سمجھ سکتے۔

اور ان سے محبت کرنے والے، ان سے چھوٹے احباب اُن سے ٹوٹ کر ملے، معانقے ہوتے، خط و کتابت جاری رکھنے کے وعدے ہوتے، ناراضگیاں ہوتیں لیکن گلے شکووں کی تلخی اپنائیت کی مٹھاس کو کم نہ کر سکی۔ احباب کی انہی یادوں سے یہ چند اقتباس دیکھئے جو یادوں کی برات کے غیر مطبوعہ اوراق میں پوشیدہ ہیں اور اب اس کتاب کے توسط سے آپ کے پیشِ نظر ہیں۔

جاں نثار اختر...... '____ اب کی بمبئی میں اصغری بیگم کی دعوت میں ملے تھے، میں نے ڈانٹا تھا کہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اور انہوں نے بڑی سعادت مندی کے ساتھ سر جھکا لیا تھا____'

میکش اکبر آبادی...... '____ ۱۹۶۷ء میں ان سے ملنے آگرے گیا تھا، اب رہ کیا گیا ہے، آگرے میں، تاج محل اور میکش کے علاوہ، دونوں کو جی بھر کے دیکھا____'

شکیل بدایونی...... '____ ان کی شاعری کے لبوں پر تبسم کی موجیں تھیں، اب کی بمبئی گیا تھا وہ بیمار تھے____'

ساغر نظامی...... '____ آخر کار میری بے لوث محبت نے ان کے دل پر اثر کیا اور اس بار ۱۹۶۷ء میں جب ہندوستان گیا تو انہوں نے رات کو اپنے گھر مجھ کو بلا لیا____'

ڈاکٹر آہ صفدر سیتاپوری...... '____ اب کی ۱۹۶۷ء میں جب بمبئی گیا، لوگوں سے گڑ گڑا، گڑگڑا کر کہا۔ کوئی مجھ کو ان تک پہنچا دے، یا اُن کو میری آمد کی خبر کر دے، لیکن کسی اللہ کے بندے نے دست گیری نہیں کی____'

آغا جانی کاشمیری...... '____ اس یار جانی سے اب کے سفر میں ملاقات نہیں ہو سکی، میری بدقسمتی سے وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے____'

یونس سلیم...... '____ مجھ رندِ سیار نامہ کا تو یہ رندِ ماضی و ملائے حال اس قدر پکا دوست ہے کہ ۱۹۶۷ء میں ہندوستان گیا تھا تو یہ اللہ کا بندہ اپنے سارے کام چھوڑ کر میرے ساتھ بمبئی گیا____'

قلمی نسخے کے وہ تمام غیر مطبوعہ صفحات جن کے تذکرے یادوں کی برات کا حصہ نہیں بن سکے تھے وہ جوش صاحب کی زندگی کا ایک گراں قدر اثاثہ ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ہندوستان کے سفر کے دوران، اُن کے دورِ گزشتہ کی دھندلاہٹوں اور پرچھائیوں کو نئی صحبتوں، بچھڑی ہوئی فضاؤں اور ہواؤں سے انفاسِ تازہ کی ایک ایسی دلکشی و دلفریبی ملی تھی جس نے یادوں کی برات کے بعض تذکروں میں ایک نئی زندگی اُجاگر کر دی____ ان سے محبت کرنے والے، ان کو چاہنے والے اور ان کا احترام کرنے والے کتنے ہی چہرے تھے جو ۱۹۶۷ء میں ان کے گرد جمع تھے، یادوں کی برات کے کتنے ہی غیر مطبوعہ اوراق ہیں جن میں ان صحبتوں اور ان ملاقاتوں کے

رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

صابر کمال نے ان صحبتوں اور ان ملاقاتوں کا تذکرہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے:

"_____ یوں تو دورانِ قیامِ ہند آپ سے ملاقات کرنے والوں میں شریمتی اندرا گاندھی صاحبہ اور کئی مرکزی وزراء، سفرا، ادیب، شاعر، نقاد، صحافی اور بڑے بڑے انشاء پرداز بھی ہیں لیکن جو لوگ آپ کی خدمت میں زیادہ حاضر ہوتے تھے ان میں محمد یونس سلیم، اجمل خاں صاحب، وِدیا شنکر (آئی سی ایس)، شنکر پرشاد صاحب (آئی سی ایس)، کنور مہندر سنگھ بیدی، (آئی سی ایس)، ساغر نظامی صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب، گلزار دہلوی صاحب، بسمل سعیدی صاحب، حیات لکھنوی صاحب، یوسف دہلوی صاحب، یونس دہلوی صاحب، بیگم ساغر نظامی صاحبہ، جمیلہ بانو صاحبہ وغیرہ شامل ہیں۔ ہر روز دعوتوں کا پروگرام بنتا، مخصوص نشستیں ہوتیں، _____ بمبئی کے فلم اسٹاروں میں دلیپ کمار، سائرہ بانو، پرتھوی راج، راج کپور، ششی کپور، وجے آنند، ناصر حسین، ستارہ دیوی، مراد، تبسم، شاعروں میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، سردار جعفری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، شام کشن نگم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں _____" ☆

یادوں کی برات میں جوش صاحب نے جن صفحات (مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں) پر اپنے حلقہ احباب کے تذکرے لکھے ہیں ان میں وہ فضا بھی شامل ہے جو ملیح آباد کے ایک قصبے سے شروع ہو کر ۱۹۶۷ء کی درج بالا صحبتوں اور کراچی و اسلام آباد کی زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔

یادوں کی برات کا گمشدہ باب!

'معاصر و احباب'

گمشدہ صفحات کے بارے میں یہ بات راغب صاحب ہی سے پتہ چلی تھی کہ یہ دراصل یادوں کی برات کا ایک باب تھا جس کا نام خود جوش صاحب ہی نے معاصر و احباب تجویز کیا تھا۔ راغب صاحب نے کیوں کے خودنوشت کے بڑے حصے کی پروف ریڈنگ کی تھی اور کتابت شدہ صفحات، اصل مسودے کے ساتھ انہی کے پاس آیا کرتے تھے، اس لیے ان باتوں کا، ان سے بہتر جاننے والا کوئی دوسرا نہیں ہے، یہ انہی کے الفاظ ہیں جو میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں:

☆ _____ جوش صاحب کے دوست، مشمولہ روزنامہ اردو، رہنمائے دکن۔ یکم جنوری ۱۹۷۸ء ص: ۳

'____ یادوں کی برات جب بعدِ اشاعت مارکٹ میں آئی تو ایک باب معاصر و احباب غائب تھا____' ☆

ان معاملات میں بہت زیادہ سر کھپانے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جوش صاحب یہ بات کہنے سے عموماً گریز ہی کرتے تھے کہ اس خود نوشت کی اشاعت کے ذمہ داروں کی طرف سے جن میں سبطِ حسن سرِ فہرست ہیں، یہ کہا گیا تھا کہ یادوں کی برات کی ضخامت بڑھتی جا رہی ہے اس لئے بہت سے تذکرے اس میں سے نکال دینے چاہئیں۔ شاید روشن علی بھیم جی سے تعلقِ خاطر اور احساسِ مروت کے سبب جوش صاحب اس بات کا چرچا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں تو قریبی دوستوں سے یہ باتیں کہی تھیں، لیکن اپنے خطوط اور اپنے انٹرویوز میں وہ یہ بات نہیں کہتے تھے۔

چٹان کے نائب مدیر اطہر سہیل نے جب ان سے کہا کہ:

''____ یادوں کی برات میں آپ نے ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی کا ذکر نہیں کیا حالانکہ آپ کو ان کی دوستی کا دعویٰ ہے____''

تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:

''____ یادوں کی برات سے بہت سے نام نکال دیئے ہیں، دوستوں کا خیال تھا کہ کچھ لوگوں کا تذکرہ ادھورا ہے، میرے احباب کے نام سے الگ کتاب لکھ رہا ہوں____'' ☆۱

۱۹۷۰ء میں یادوں کی برات شائع ہوئی، ۱۹۷۱ء میں راغب صاحب نے جوش صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ:

''____ آپ نے اپنے احباب کے متعلق جو باب یادوں کی برات میں شامل کیا تھا وہ بوجوہ شریکِ اشاعت نہیں ہو سکا، ایک بار آپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ آپ، معاصر و احباب کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا عزمِ صمیم فرما چکے ہیں یہ کتاب کب تک پایۂ تکمیل کو پہنچے گی____''

اُن کا جواب تھا:

''____ ذرا فرصت مل جائے اور مزید زندہ رہے تو کریں گے یہ کام____'' ☆۲

☆____ مکالمات جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص:۱۰

☆۱____ چٹان، لاہور، جوش ملیح آبادی سے پندرہ سوال، ۱۳ر ستمبر ۱۹۷۱ء، ص:۱۱

☆۲____ مکالمات جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص:۶۳

۵ راگست ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں اسلام آباد سے راغب صاحب کو لکھتے ہیں:

"____ ابھی تک میرے معاصر و احباب، کی جانب ذہن کی باگ مڑی نہیں ہے____" ☆

پھر اس خط کے لکھنے کے تقریباً ڈھائی سال بعد ۱۱ رمارچ ۱۹۷۶ء کو راغب صاحب کے پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ:

"____ معاصر و احباب ہنوز معرضِ تصنیف میں ہے____" ☆۱

جوش صاحب کی تحریر میں جو نادر و نایاب کاغذات، ان کے منتشر شعری و نثری اثاثے میں سے مل جاتے ہیں ان میں دو چار صفحے ایسے بھی ہیں جن پر لکھے ہوئے کچھ نام بتاتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے ان تمام احباب کے بارے میں لکھ رہے تھے، لکھ چکے تھے یا لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس صفحے کے بعد اُن کا جو عکس تحریر ہے اس میں ان کے قلم سے ۳۶ نام لکھے ہوئے ہیں:

'____ منور عباس وکیل ____، زیبا ردولوی ____، قیصر ____، ابوالحسن بلگرامی ____، ابو جعفر ____ رئیس امروہوی ____ تقی (جنگ)، ____ حکیم نصیر میاں ____، صبا، آگرہ ____، رعنا، آگرہ ____، راغب مرادآبادی ____، حکیم ندیم ____، پیر حسام الدین راشدی ____، ممتاز حسن، نیشنل بینک ____، روشن علی بھیم جی ____، میر علی احمد خاں تال پور ____، گویا جہاں آبادی ____، رشید ترابی ____، مولانا جوہر ____، سلیم اللہ فہمی ____، سلامت علی خاں، نرائن گنج ____، میر عترت حسین، لاہور ____، سالک لکھنوی ____، سید ہاشم رضا ____، سید آلِ رضا ____، پروفیسر احمد علی ____'

ان ۳۶ ر افراد و اشخاص میں (اس فہرست کی حد تک) سات شخصیات، حکیم ندیم، ممتاز حسن، گویا جہاں آبادی، علامہ رشید ترابی، سلیم اللہ فہمی، سالک لکھنوی اور پروفیسر احمد علی کے بارے میں تا حال ان کی کوئی تحریر میری دسترس میں نہیں ہے۔ امکان تو اسی بات کا ہے کہ جوش صاحب نے اپنے دور کے ان تمام حضرات پر بھی لکھا ہوگا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جوش صاحب، یادوں کی برات کے غائب شدہ باب کو اگر معاصر و احباب، کا نام دے کر ایک مجموعے کی شکل دینا چاہتے تھے تو پھر اس میں تاخیر کیوں ہو رہی تھی! اور اگر ان تمام تذکروں کو ایک الگ کتاب ہی بنانا تھا تو پھر یادوں کی برات کے لاہور ایڈیشن میں بعض احباب پر ایک نئے سرے سے لکھنے اور انہیں شامل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ تمام تحقیقی مسائل اُسی صورت میں اپنے

☆ ____ خطوطِ جوش ملیح آبادی، راغب مرادآبادی، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص: ۸۸

☆۱ ____ مکالماتِ جوش و راغب، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، کینیڈا، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۰۱

حل کی طرف جائیں گے جب جوش صاحب کی تمام غیر مطبوعہ تحریریں ہمارے پیش نظر ہوں گی ___ ☆

یادوں کی برات کا اضافہ شدہ ایڈیشن

یادوں کی برات کا لاہور ایڈیشن، مئی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا اضافہ شدہ حصہ ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحات میں، جوش صاحب نے یادوں کی برات کی طباعت (۱۹۷۰ء) کے بعد سے اضافہ شدہ حصے کی ترتیب و اشاعت (۱۹۷۴ء) کے وقت تک، اپنی موجودہ زندگی، اہلیہ کی وفات، ہندوستان و پاکستان میں اپنی ناقدری، پاکستان میں سیاسی ابتری، سقوطِ بنگال اور اپنے آخری عشق کا تذکرہ کیا ہے ۱۸ر صفحات میں ۳۱ر احباب اور دوستوں کا ذکر ہے۔ ان میں صرف ایک فیض احمد فیض ہیں جو گمشدہ اوراق میں بھی تھے اور اس لاہور ایڈیشن میں بھی اُن پر لکھا گیا ہے۔ دونوں جگہ مضمون جدا ہے۔ ۱۸ر صفحات میں فیض صاحب کے علاوہ جن باقی ۳۰ ر افراد پر بھی لکھا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں:

کلام خاں، جمال خاں، عزیز ہاشمی، سید عزادار حسین کاظمی، سید ارتضیٰ حسین زیدی، عون محمد رضوی، محمد رمضان، ڈاکٹر صفدر حسین، سیفی نوگانوی، ڈاکٹر سبطِ حسن، سید محمد واقف، نظم اکبر آبادی، سید اولاد باقر رضوی، کوثر نیازی، صفیہ شمیم: حفیظ الرحمٰن، فیضی، اعظمی، دانش، ارزش، محمد عظیم، یونس منصور، علی اختر زیدی، اظہار حیدر زیدی، شیخ منظور الٰہی، مختار مسعود، سید مہدی نواب، راز مراد آبادی اور اختر و منظور۔

ابھی گزشتہ صفحات میں جوش صاحب کے خطوط سے جو حوالے دیے گئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معاصر و احباب کو حتمی صورت دینے کی طرف مائل نہیں ہو پا رہے تھے ___ ۱۹۷۳/۷۴ء میں اپنی خود نوشت کے لاہور ایڈیشن کو اضافی صفحات کے ساتھ، ترتیب دینے کی طرف ان کی توجہات زیادہ مرکوز رہیں۔ اسی حوالے سے راغب صاحب کو اپنے خط (۳۱ ر اگست ۱۹۷۴ء) میں جوش صاحب اسلام آباد سے لکھتے ہیں:

☆ ___ جوش صاحب کی وفات (۱۹۸۲ء) کے بعد ان کی غیر مطبوعہ تحریریں ان کے صاحبزادے سجاد حیدر صاحب کے اختیار میں تھیں، ان کے بعد ان کی اولاد اس اثاثے کے بارے میں آگاہی رکھتی ہے۔ جوش صاحب کے پوتے ساجد حیدر اور فواد حیدر سے تو اس بارے میں میری بات نہیں ہو سکی لیکن ان تینوں پوتیوں، ساجدہ آفریدی، ترنم آفریدی اور تبسم اخلاق سے متعدد بار یہ گزارش کرتا رہا ہوں کہ وہ جوش صاحب کے غیر مطبوعہ اثاثے کو یا تو اپنی نگرانی میں منظرِ عام پر لے آئیں، اگر کسی بڑے اشاعتی ادارے سے بات نہیں بنتی تو کسی ایک معاہدے کے تحت (جو میرے دائرۂ اختیار میں ہو) وہ مجھے دے دیں تاکہ ایک تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ یہ ادبی تاریخ کے ہاتھوں میں پہنچ سکے ___ ساجدہ آفریدی ناگہانی طور پر ۲۵ ر اگست ۲۰۰۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں ___ تبسم اخلاق اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ راولپنڈی، اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں جبکہ ترنم ناز کراچی ہی میں اپنے مرحوم والد کے گھر بفرزون میں رہتی ہیں۔

"_______یادوں کی برات کا مسودہ ان صاحب کے حوالے کر دیجئے
جنھوں نے کتابت کا وعدہ کیا تھا۔ کتابت کی تکمیل کے بعد، آپ ہی تکلیف کر کے،
اس کی تصحیح کر دیں، ایسی زبردست تصحیح کہ ایک غلطی بھی نہ رہنے پائے کتابت کا بل
یہاں بھیج دیں میں فوراً منی آرڈر کر دوں گا_____" ☆

اس کے بعد کے ایک دوسرے خط سے یہ چند سطریں ملاحظہ کیجئے جس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب کتابت شدہ صفحات کو کتنے انہماک اور توجہ سے دیکھتے تھے۔

"_____یادوں کی برات کی سطریں ۲۲/اور جہاں سرخی ہے وہاں ۲۱/ ہیں، کاتب
صاحب پر تاکید کر دیجئے کہ پندرہ دن کے اندر اندر کتابت کو مکمل کر کے بھیج دیں لاہور
سے تقاضوں پر تقاضے ہو رہے ہیں۔ یہ خوف دامن گیر ہے کہ اگر تاخیر ہوگئی تو یہ ہو سکتا
ہے کہ طباعت ہی معرضِ خطر میں آجائے_____" ☆۱

آثار و شواہد تو یہی بتاتے ہیں کہ زندگی کے اس آخری دور میں جوش صاحب معاصر و احباب پر باقاعدہ توجہ نہیں کر پا رہے تھے_____ خورشید علی خاں صاحب کا مجھ سے کہنا یہ تھا کہ:

'_____جوش صاحب معاصر و احباب، کے تذکروں میں اپنی اُن تحریروں ہی کو بنیاد
بنا کر آگے بڑھنا چاہتے تھے جو "گم" ہوگئی ہیں، انہیں شاید یہ بھی خیال نہیں رہا کہ
انہوں نے یادوں کی برات کے قلم زد صفحات میں کیا کیا لکھا تھا_____'

اظہر عباس جعفری صاحب سے میں نے پوچھا کہ کیا جوش صاحب نے کبھی آپ سے دوبارہ کہا کہ جو کاپی انہوں نے آپ کو دی تھی وہ آپ انہیں لوٹا دیں۔ انہوں نے کہا کہ'_____ نہیں ایسا تو نہیں ہوا، جوش صاحب کیوں کے کراچی چھوڑ کر اسلام چلے گئے تھے اس لئے ان سے رابطہ ہی منقطع ہو گیا_____'!

جوش صاحب کے نوادرات جب بھی ان کے ورثا کے ہاتھوں ادبی تاریخ کو مہیا ہوں گے تو ہو سکتا ہے کہ یادوں کی برات کا گم شدہ باب معاصر و احباب، ایک نئی ترتیب و تدوین کے ساتھ اس میں موجود ہو لیکن بظاہر اس کا امکان کم ہی ہے۔

یادوں کی برات کی پروف ریڈنگ

قلمی نسخے کے کم و بیش ڈیڑھ ہزار صفحات کی دریافت سے، مطبوعہ یادوں کی برات کی پروف ریڈنگ میں اغلاط

☆_____ خطوط جوش ملیح آبادی، راغب مراد آبادی، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص:۹۱

☆۱_____ ایضاً، ص:۹۳

کی نشاندہی کے لئے اس لیے بہت آسانی پیدا ہوگئی کہ کتابت شدہ صفحات کو جوش صاحب کے اصل مسودے کی روشنی میں سطر در سطر پڑھنے کی راہ میسّر آگئی۔ اور یوں صحتِ متن سے ہم بہت قریب ہو جائیں گے۔
یادوں کی برات کے بیشتر پروف راغب صاحب ہی نے پڑھے تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین یہ بتاتے تھے کہ جوش صاحب نے ایک بار کچھ صفحات انہیں بھی دیئے تھے کہ وہ بتائیں کہ کتابت میں اغلاط کا رجحان کتنا ہے۔ صہبا لکھنوی نے ایک ملاقات میں یہ بات بتائی تھی کہ جب یادوں کی برات کی کتابت مکمل ہوگئی تو جوش صاحب نے ان سے کہا تھا کہ ماہنامہ افکار کے پروف جو حضرات پڑھتے ہیں وہ بھی اس پوری کتاب پر اگر ایک نظر ڈال لیں تو اور اطمینان ہو جائے گا۔ جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد حیدر جب جوش صاحب کی زبانی یادوں کی برات کی ریکارڈنگ کر رہے تھے ☆ تو انہی دنوں ان سے یہ بات پتہ چلی تھی کہ جوش صاحب نے ایک موقع پر حکیم سعید صاحب سے بھی یہ کہا تھا کہ اگر ان کے ادارے میں کچھ ایسے لوگ ہوں جو پروف پڑھنے میں مہارت رکھتے ہوں تو وہ ان کی ضرور مدد فرمائیں۔
راغب مرادآبادی صاحب یہ درست کہا کرتے تھے کہ

> '____ جوش صاحب کی تحریر میں جو ایک مقرّس آہنگ ہے، ان کے فقروں میں تراکیب کا جو شکوہ اور الفاظ میں مترادفات اور قوافی کا جو تسلسل اور تکرار ہے اس پر ہر پروف پڑھنے والے کی گرفت نہیں ہوسکتی۔ جوش صاحب اپنی نظم اور نثر دونوں پر بہت زیادہ محنت کرنے والے انسان تھے لیکن پروف ریڈنگ جیسے غیر تخلیقی کاموں کی طرف مائل ہونا ان کے مزاج کے برعکس تھا پھر بھی انہوں نے یادوں کی برات کے لئے بہت وقت نکالا۔ متعدد بار یہ بھی ہوا کہ جوش صاحب کے ہاتھ میں مسودہ ہے، کتابت شدہ صفحہ میرے سامنے ہے، وہ پڑھ رہے ہیں اور میں غلطیوں کی تلاش میں ہوں____'

راغب صاحب سے جب بھی سرِ راہ یا ان کے گھر پر ملاقات ہوئی، موضوعِ گفتگو عموماً جوش صاحب ہی ہوا

☆____ سجاد حیدر صاحب کراچی کے محلہ اورنگ آباد پاپوش نگر (ناظم آباد نمبر ۲) کے مکان ۱۲/۲۱۷ میں رہا کرتے تھے۔ انہوں نے جوش صاحب کی آواز میں یادوں کی برات ریکارڈ کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ میرے سوالنامے کے ایک جواب میں ان کی صاحبزادی تبسم اخلاق نے لکھا کہ: '____ اسلام آباد آنے سے قبل بھی ابا نے بابا کی زبانی یادوں کی برات ریکارڈ کرنا شروع کی تھی اور بہت ساری ریکارڈ بھی ہوئی چند قسطیں ریکارڈ ہوئی تھیں کبھی چائے آگئی یا کبھی کوئی ملنے والا آگیا تو ٹیپ بند کرنا پڑتا تھا۔ بمشکل دو گھنٹے ریکارڈ ہو سکے۔ اسپول پر ریکارڈنگ کی تھی۔ بعد کو یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور بابا اسلام آباد چلے گئے تھے۔ پھر ۱۹۷۵ء میں ہم لوگوں کے اسلام آباد آنے کے بعد ابا نے دوبارہ نئے سرے سے ریکارڈنگ شروع کی لیکن وہ بھی مکمل نہ ہوسکی غالباً اس کی وجہ بابا کی ناسازیٔ طبع تھی____'۔ (۳۰ ستمبر ۱۹۹۶ء، بفرزون کراچی)

کرتے تھے۔ یوں ہر حوالے سے، جس میں پروف ریڈنگ کے مسائل اور معاملات بھی شامل ہیں۔ میری ڈائری میں معلومات کا ایک اچھا ذخیرہ محفوظ ہوگیا۔ جس سے یادوں کی برات کے بارے میں بھی کچھ حقائق کا علم ہوا___ میں نے راغب صاحب سے کہا کہ اگر سطر در سطر ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے تو یادوں کی برات کے پروف میں جو اغلاط رہ گئی ہیں وہ صاف نظر آتی ہیں۔ راغب صاحب نے ان تمام باتوں سے ہمیشہ اتفاق کیا ☆ قلمی نسخے کی دریافت کے بعد پروف ریڈنگ کی خامیاں اور نمایاں ہوگئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تو بہت سی ہیں۔ جس سے صداقتِ متن اور اصلِ مفہوم پر بھی آنچ آتی ہے، مثلاً یہ جملہ:

'___ گاندھی جی کے پاس پنڈت موتی لال کی صاحبزادی وجے لکشمی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں___' (مطبوعہ، ص:۲۰۶)

جبکہ جوش صاحب نے لکھا ہے سر جھکائے ہوئے اُداس بیٹھی تھیں۔ اُداس کا لفظ لکھنا کاتب سے رہ گیا___

اُداس کا لفظ نہ ہونے سے وجے لکشمی کے سر جھکا کر بیٹھنے کی کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا___ یا یہ جملہ '___ میرے دل میں یہ بات مدتوں سے کھٹکتی رہتی تھی کہ حسینیت کی سی دولت کے علمبردار، شہادتِ حسین پر تو آنسو بہاتے ہیں، لیکن عزیمتِ حسین سے جی چراتے ہیں___' (مطبوعہ، ص:۲۷۵)۔ جوش صاحب نے

☆___ راغب صاحب فیڈرل بی ایریا کے بلاک ۱۶ مکان نمبر آر۔۱۰۱ میں رہا کرتے تھے۔ میرا گھر فیڈرل بی ایریا بلاک ۹ میں تھا۔ جب بھی ان سے ملاقات کرنا ضروری ہوتا تو میں پیدل چل کر ۲۰ منٹ میں اُن کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں جب بھی ان سے ملنے جایا کرتا تو میری جیب میں قلم اور ہاتھ میں ڈائری ضرور ہوا کرتی۔ ان سے جوش صاحب کے بارے میں باتیں ہوا کرتیں اور جب بھی میری معلومات میں کسی اہم بات کا اضافہ ہوتا میں ڈائری پر اس روز کی تاریخ ڈال کر محفوظ کر لیا کرتا۔ جوش صاحب کے پورے حلقۂ احباب میں وہ واحد شخص تھے جنہیں جوش صاحب کے ہر شعبۂ حیات کا کچھ نہ کچھ علم ضرور تھا___ میں یہ جانتا تھا کہ ان کے پاس جوش صاحب کی نادر تحریریں بھی ہیں جس کا تذکرہ وہ سب سے نہیں کرتے تھے۔ میرے بہت پوچھنے پر کچھ بتا بھی دیا کرتے تھے، کچھ تحریریں بھی انہوں نے دیں جن کا تذکرہ میں اپنے مضامین اور تصانیف میں کرتا رہا ہوں___ ایک اطلاع میرے پاس یہ بھی تھی کہ ان کے پاس وہ دیوان حافظ بھی ہے جس پر جوش صاحب کی تحریر ہے لیکن وہ اس بارے میں کوئی رائے نہیں دیا کرتے تھے۔ ۲۰۱۱ء میں جو ان کی زندگی کا آخری سال تھا اور ان کی طبیعت بھی خراب تھی، حواس بھی کام نہیں کرتے تھے، ان کے ہمدمِ دیرینہ اور میرے کرم فرما فراست رضوی مجھے ان کے پاس اس یقین سے لے گئے کہ وہ آپ کو جوش صاحب کے متعلق جو نوادرات ہیں وہ دینا چاہتے ہیں۔ میں اور فراست رضوی چلے بھی گئے، دیر تک بیٹھے بھی، لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے راغب صاحب بہکی بہکی باتیں کرتے رہے۔ فراست رضوی نے کہا بھی کہ، آپ ہلال صاحب کو سب تحریریں دے دیجئے۔ انہوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا___ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ کچھ روز بعد وہ انتقال کر گئے۔

لکھا ہے 'حسینیت کی سی دولتِ کبرئی کے علمبردار.......... کُمرئی کا لفظ کتابت سے رہ گیا___ حسینیت کی سی دولت اور حسینیت کی سی دولتِ کُمرئی میں بڑا فرق ہے، اس سے جوش صاحب کے صحیح نقطۂ نگاہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے___ ایسی متعدد خامیاں ہیں جن پر ایک جامع کتابچہ بھی مرتب کیا جاسکتا ہے۔

جوش صاحب نے اپنی بیوی اشرف جہاں بیگم کے تذکرے میں ان کی نانی کا ذکر کیا ہے جن کا نام سالمہ بیگم (ص: ۳۷۷) تھا۔ دوسری سطر میں تو سالمہ بیگم ہی لکھا اس کے بعد بار بار سالمہ بیگم کتاب ہوا۔ اور اس کی گرفت بھی نہیں ہو سکی!

قلمی نسخے میں جوش صاحب نے 'املا' کا بہت زیادہ خیال رکھا، ان کے نزدیک لفظ کو جس طرح لکھا گیا ہے، کتابت میں بھی وہ اس کی پابندی چاہتے تھے___ یہاں میں مختلف صفحات سے یہ تین لفظ نقل کر رہا ہوں ___ گمنام___ رامپوری___ حیرتناک___ جوش صاحب نے ان تینوں لفظوں میں جو املا اختیار کیا ہے وہ یہ ہے___ گم نام___ رام پوری___ حیرت ناک___ کاتب اظہر عباس جعفری نے اپنے انٹرویو میں مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ جوش صاحب کو بتا دیا گیا تھا کہ اعراب کی پابندی نہیں کی جاسکے گی اور لفظ کو لکھنے کا جو رائج طریقہ ہے (جوش صاحب کے نزدیک وہ غلط سہی) اس سے کاتبوں کے لیے گریز ذرا مشکل ہو گیا ہے کیوں کہ وہ لکھتے لکھتے اسی رائج طریقے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بہت احتیاط اور حاضر دماغی کے باوجود جوش صاحب سے بھی کہیں کہیں کوتاہی ہو گئی ہے، مثلاً جوش صاحب نے اپنے دادا کے ذکر میں ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کا ایک جگہ تذکرہ کیا ہے لیکن بجائے ۱۸۵۷ء کے انھوں نے ۱۹۵۷ء کی جنگِ آزادی لکھ دیا ایسے میں پروف ریڈر کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، اگر اصل میں ہی غلطی ہے تو اسے نقل میں درست کرلیا جاتا لیکن اس پر توجہ نہیں کی گئی۔ یادوں کی برات میں بھی (ص: ۳۵۵ پر) ۱۹۵۷ ہی کی جنگِ آزادی شائع ہوا۔ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن کے فوراً بعد جو ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کیا گیا اُس میں بھی یہ غلطیاں اسی طرح موجود ہیں___

جیسا کے گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے کہ اسرار الحق مجاز کا تذکرہ شامل کرنے کی وجہ سے پہلے ایڈیشن سے شمس زبیری، سبطِ حسن اور منور عباس کے تذکرے والے صفحات نکال دیئے گئے تھے، پہلے ایڈیشن کی تقسیم اور کتب فروشوں تک اس کی ترسیل روک کر ترمیم شدہ ایڈیشن کی طباعت کے لئے ابتدائی ایک دو پلیٹیں دوبارہ تیار کی گئیں۔ آغاز کے صفحات میں ایک صفحے پر فارسی کا جو شعر درج تھا اسے ہٹا دیا گیا۔ جب اس نوعیت کی ایک دو تبدیلیاں کی جارہی تھیں اور ایک دو فارم دوبارہ شائع کیے جارہے تھے تو فہرست پر بھی غور کرنے کی ضرورت تھی۔ پہلے ایڈیشن کی فہرست چار صفحات پر مشتمل تھی، فہرست کے چوتھے صفحے پر سرخیوں کے سامنے جو صفحات نمبر (۵۸۲ سے ۷۲۵ تک) درج کیے گئے تھے وہ تمام کے تمام غلط تھے جب ترمیم شدہ ایڈیشن طباعت کو دیا گیا تو چوتھے صفحے کی فہرست کے نمبر (شاید شمس زبیری صاحب نے) درست کروا دیئے لیکن فہرست کے تیسرے صفحے کے آخری صفحے پر توجہ نہیں کی گئی اور آج بھی پہلے ایڈیشن ہی کی طرح ان پر غلط نمبر درج ہیں___

یادوں کی برات کا اضافہ شدہ لاہور ایڈیشن، جوش صاحب کی اجازت ومشاورت سے مئی ۱۹۷۵ء میں شائع کیا گیا۔ اخراجات سے بچنے کے لیے ادارے نے از سر نو کتابت سے گریز کیا اور ترمیم شدہ ایڈیشن کے تقریباً ۷۴۴ صفحات کے عکس لے کر یہ ایڈیشن شائع کر دیا چنانچہ غلطیاں جو پہلے بھی تھیں اب بھی اسی طرح باقی رہیں اس تیسرے ایڈیشن کے ادارۂ اشاعت، مکتبہ شعروادب چوہدری اکیڈمی نے تو یہ زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ جوش صاحب نے جن مضامین وتذکروں کا (ص: ۷۲۷ سے ص: ۷۸۰ تک) اضافہ کیا ان کا اظہار فہرست میں بھی کیا جائے۔ لیکن اس کے لیے ایک صفحہ علیحدہ سے کتابت کروانا پڑتا۔ جبکہ وہ اس تیسرے ایڈیشن کو سابقہ ایڈیشن کا عکس لے کر شائع کر رہے تھے۔ فہرست کے اس عکس میں انہوں نے صفحات نمبر البتہ دوبارہ لکھوائے لیکن اس میں بھی فہرست کا آخری صفحہ نمبر ۷۰۱ کے بجائے ۶۰۱ لکھ دیا گیا جوش صاحب نے پہلے ایڈیشن کے (اور ترمیم شدہ ایڈیشن کے بھی) ابتدائی صفحات پر جو اشعار نقل کیے تھے اور جس سے سوانح نگار کے ذہن کو پڑھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لاہور ایڈیشن میں وہ سب ہٹا دیے گئے اور انہیں بعض اندرونی صفحات کی خالی جگہوں کو بھرنے کے لئے شائع کر دیا گیا۔

اظہارِ تشکر

مقدمے کے آخر میں دو چار باتوں کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے۔ جس میں سب سے اہم بات یہ کہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جوش صاحب لفظ کو جس املا میں لکھا کرتے تھے اس کی بہت زیادہ پاسداری نہیں کی جا سکی۔ صحتِ املا کے معاملات ومسائل بہت نازک ہیں۔ کمپیوٹر، اردو کمپوزنگ میں ابھی شاید اس کامل سطح پر نہیں آسکا جہاں املا کی ہر احتیاط ہمارے اختیار میں ہو، ادبی جریدے سخن ور کے مدیر نقوش نقوی نے محنت اور توجہ سے اس پوری کتاب کی کمپوزنگ کی ہے۔ جوش صاحب کی تحریر پڑھنے میں انہوں نے بہت احتیاط سے کام لیا اور یہی چاہا کہ لفظ کو درست املا میں کمپوز کیا جائے وہ جہاں نہیں کر سکے وہ ان کا نہیں کمپیوٹر کے مشینی ذہن کا قصور ہے۔ ان کی سعی پیہم کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

مولانا شبلی نے شعر العجم میں کہیں یہ بات لکھی ہے کہ دنیا میں ناممکنات کی اب تک جو فہرست تیار ہو چکی ہے اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک کتاب کا صحیح چھپنا، مشروط ہے اس کی محتاط پروف ریڈنگ سے۔ عمدہ کاغذ اور اعلیٰ طباعت سے مرصع ایسی کتاب کا کیا کرنا جس کے چہرے پر ناقص پروف ریڈنگ کے داغ باقی رہ جائیں۔ میں نے یہ کوشش تو کی ہے کہ پروف ریڈنگ میں حتی المقدور اغلاط سے بچا جائے ______ لیکن کہیں نہ کہیں ٹھوکر بھی کھائی ہوگی۔

میں تو عام کتب میں بھی اشاریہ کا قائل ہوں اس سے قاری کے لیے 'منزل' کی تلاش بہت سہل ہو جاتی ہے۔ یہ تو سراپا ایک تحقیقی کتاب ہے، جس میں اشاریہ کا اہتمام ضرور کیا جانا تھا۔ محنت طلب کام تھا لیکن اسے بھی کامیابی

سے سر کر ہی لیا گیا۔

یادوں کی برات کے گمشدہ اوراق کے حصول میں، علم دوست محقق رفیق احمد نقش کے پُر خلوص کردار کا گزشتہ صفحات میں، اگر چہ میں ذکر کر چکا ہوں لیکن اس اختتامی صفحے پر ایک بار پھر ان کی عنایتوں کو فراموش نہیں کرنا چاہتا۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا یقیناً مجھ پر واجب ہے۔

اظہارِ تشکر کے اس آخری موڑ پر میں اپنے زمانۂ طالب علمی کے ساتھی اور دوست اقبال حیدر کے لئے کچھ کہنا چاہتا ہوں ___ مگر کیا کہوں؟ ___ مجھے یاد ہے کہ وہ اپنی نوعمری ہی سے کراچی میں، جوش صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل رہے ___ جوش صاحب کی زندگی ہی میں وہ پاکستان سے (۱۹۷۶ء میں) نقلِ مکانی کر کے، کینیڈا کے شہر کیلگری میں جا کر آباد ہو گئے، وہاں اگر چہ انہوں نے پاور انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا لیکن اُن کا شعبۂ حیات ادب ہی رہا۔ جوش صاحب کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۸۳ء میں انہوں نے کیلگری میں جوش لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ جس کے پہلے سرپرست پروفیسر ممتاز حسین اور دوسرے علی سردار جعفری تھے اور پھر ۱۹۸۷ء میں ڈاکٹر قمر رئیس نے اس کی سرپرستی قبول کی۔ اقبال حیدر اگر چہ پاکستان سے بہت دور ہیں لیکن انہوں نے وہاں جوش لٹریری سوسائٹی قائم کر کے جوش شناسی کے تمام فاصلوں کو مٹا دیا، وہ وہاں جوش صاحب کے حوالے سے ادبی صحبتوں کا اہتمام کرتے ہیں، سیمینار کا انعقاد کرتے ہیں اور پوری دنیا سے نامور مقالہ نگاروں اور اسکالرز کو مدعو کرنے کے لئے مضطرب رہتے ہیں! ___ آرٹس کونسل کراچی کی ادبی کمیٹی کی جانب سے دسمبر ۲۰۰۸ء میں سات روزہ عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جوش ملیح آبادی کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اقبال حیدر اپنی بہن شائستہ رضوی اور اہلیہ نگہت حیدر صاحبہ کے ساتھ اس میں، تن من دھن سے شریک ہوئے تھے۔ انہی دنوں میں جب وہ میرے گھر آئے اور انہوں نے یادوں کی برات کے اس نایاب قلمی نسخے کو دیکھا تو حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ: آپ جب بھی اسے منظرِ عام پر لائیں گے اسے ہمارا ادارہ 'جوش لٹریری سوسائٹی (کینیڈا)' شائع کرے گا ___ انہوں نے اپنے وعدے کی پاسداری کی اور آج انہی کے پلیٹ فارم سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

۲۲ رفروری ۲۰۱۳ء

ڈاکٹر ہلال نقوی
وزیٹنگ فیکلٹی
پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی یونیورسٹی

قلمی نسخے کے وہ صفحات

جو یادوں کی برات میں شامل نہیں ہو سکے

حواشی و تعلیقات

هلال نقوی

زندگی خوابِ پریشاں ہے، کوئی کیا جانے
موت کی لرزشِ مژگاں ہے، کوئی کیا جانے

رامش و رنگ کے ایوان میں، لیلائے حیات
صرف اک رات کی مہماں ہے، کوئی کیا جانے

گلشنِ زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں
دجلۂ خونِ رگِ جاں ہے، کوئی کیا جانے

رنگ و آہنگ سے بجتی ہوئی یادوں کی برات
رہروِ جادۂ نسیاں ہے، کوئی کیا جانے

از مئے بے عاقبت — آغاز ہستی ام عشق

کز گران خوابی — سرِ افسانہ را گم کردہ ام

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

9

شہر بھی، اس دن یہ خواب بھی جائے گا، وہ بھی خواب تھا!

EDITORIAL ...
MANAGERIAL ...
Phone: ...
56751-55

Daily HURRIYET حریت

HAROON HOUSE, KUTCHERY ROAD, KARACHI-4 PAKISTAN.
G. P. O. Box No. 61

D.O.No.A/E/202/69.   May 22, 1969.

Mohtram Josh Saheb,

With reference to your conversation with the Executive Editor, HURRIYET, I feel pleasure in requesting you to allow us to serialise in HURRIYET selected parts of your memoirs before they are published in the form of a book. We intend to use one instalment weekly in our Sunday or any regular issue. The length of each instalment will be approximately 2½ columns of the newspaper and we hope that you will also be able to provide us suitable photographs to illustrate the feature. We offer you Rs.500/- p.m. for the aforesaid contributions.

If this proposal is acceptable to you, kindly sign the confirmatory copy and send it back to us alongwith the instalments so that we can start publishing them from June 1, 1969.

Yours sincerely,

(M. IQBAL MANJAL)
GENERAL MANAGER.

معاف فرمایئے اُردو کی سی حقیر زبان میں دستخط
کرنے کا ارتکاب کر رہا ہوں
جوش
۱۹/۵/۲۳

Josh Malihabadi Esqr.
Block 4, Federal B Area,
KARACHI.

روز نامہ حریت کراچی میں

یادوں کی برات کی پہلے پہل، قسط وار اشاعت ___ آغاز و اختتام

پہلی بار یادوں کی برات کے کچھ اقتباس، کراچی کے ادبی رسائل، اردو نامہ (۱۹۶۶ء) اور قومی زبان (۱۹۶۷ء) میں شائع ہوئے اس وقت جوش صاحب اپنی خودنوشت کی کاٹ چھانٹ، مسودوں میں رد و بدل اور اضافوں کے عمل سے گزر رہے تھے۔ کراچی کا اخبار روز نامہ حریت وہ پہلا اخبار تھا جس نے جوش صاحب سے درخواست کی کہ وہ ہفتے میں ایک بار اپنی خودنوشت اس اخبار میں شائع ہونے کے لیے دیا کریں۔ ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء کو حریت کے جنرل منیجر نے ایک دفتری خط کے ذریعے جوش صاحب کو اس بارے میں مطلع کیا اور ان کی رائے طلب کی جوش صاحب نے رضامندی ظاہر کر دی اور اسی تاریخ کو انہوں نے دستخط کر دیے اور معاہدہ طے پا گیا ۲۹ مئی ۱۹۶۹ء کو جوش صاحب نے پہلی قسط روانہ کی جو ایک طرح سے تمہیدی پیرائے میں ان کی خودنوشت کا تعارف بھی تھا۔ روز نامہ حریت کراچی میں یادوں کی برات کی قسط وار اشاعت کے سفر کا یہ آغاز تھا۔ چار پانچ صفحات پر مشتمل جوش صاحب کی اس پہلی قسط کی تحریر کا عکس مجھے راغب مراد آبادی صاحب سے ملا تھا۔ اشاعت کے بعد، حریت کے دفتر سے اس کے اصل کاغذات بھی وہ لے آئے تھے، بعد میں انہوں نے اپنی کتاب 'مکالمات جوش و راغب' (۱۹۸۸ء) میں بھی اس کی نقل شائع کی تھی اس پہلے تمہیدی مضمون کے بعد جوش صاحب نے اپنے کچھ ابواب سے اقتباس اخبار کے لیے بھیجنا شروع کیے۔ بی بی سی اردو سروس (لندن) کے جناب رضا علی عابدی اُن دنوں حریت ہی سے وابستہ تھے اپنی تازہ کتاب 'اخبار کی راتیں' میں وہ اس تمام صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"___ طے یہ پایا کہ جوش ملیح آبادی سے اُن کی خودنوشت لکھوائی جائے۔ درمیان میں راغب مراد آبادی پڑے اور فرہاد زیدی خود جوش صاحب سے ملنے گئے اور انہیں تین ہزار روپے ماہانہ کی پیش کش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ زیدی صاحب کے جانے کا اس سے بھی بڑا مقصد جوش صاحب کو یہ سمجھانا تھا کہ گھروں میں پڑھے جانے والے اخباروں کو بعض نزاکتوں اور مصلحتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ 'جی ہاں' میں خوب سمجھتا ہوں۔ اب ان کا لکھا ہوا پہلا باب آیا جس کا عنوان کچھ یوں تھا کہ میں نے شراب نوشی کیسے شروع کی۔ ابھی یہ شائع نہیں ہوا تھا کہ اگلے ہفتے کے لیے اگلی قسط آ گئی جو کچھ یوں تھی 'میں کب اور کیسے دہریا ہوا' جوش صاحب کو آہستگی سے سمجھایا گیا کہ جو کنبے اخبار پڑھتے ہیں وہ ان تحریروں پر ناک بھوں چڑھائیں گے اس پر جوش صاحب نے اخبار کو اپنے استعفے کا خط لکھا جو یوں شروع ہوتا تھا 'اے میری شرمیلی قوم!' ___ لیکن شاعر انقلاب نے ایک کمال کیا انہوں نے پھر اپنے قلم کو رکنے نہیں دیا اور یادوں کی برات مکمل کر کے چھوڑی ___" (اخبار کی راتیں، رضا علی عابدی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۳۹)

قسطِ اوّل

(برائے حریت)

پہلے یہ سماعت فرما لیجئے:___

میں [نے] اس حیاتِ دوزخ بردوش و جنت در آغوش کے، گو ہر بداماں و سرشک بہ گوں حالاتِ شیریں و تلخ کو ''یادوں کی برات'' کے نام سے، چھ برس کی مسلسل جگر کاوی کے بعد، مُرتب کیا ہے۔

حافظ میرا ''ماہ و سال کے دھوئیں سے کجلا سا گیا ہے'' ___ جو واقعات، آسانی سے یاد آ گئے، انہیں قلم بند کر لیا ___ جو واقعات، دور سے جھلکیاں دکھا کر، نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، اُن پر آہ بھر کر رہ گیا۔

دُہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ تم کہیں سے بھول گئے ہو، کہیں سے ہم

میں نے، ہر چند نسیاں کے گھپ اندھیرے میں، ٹٹول ٹٹول کر، یہ سفر طے کیا ہے، پھر بھی شہرِ قرطاس کی شاہ راہ سے، میں نے اپنی یادوں کی برات بڑے دھوم دھڑکے سے نکالی ہے:___ ''عاشق کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے'' یا بقولِ مومن:___ کیا علم، دھوم سے، تیرے شُہداء کے اُٹھے۔

یہ ایک ایسے خون میں نہائے ہوئے، رنگیں مزاج و گل پوش دولھا کی برات ہے، جس کی جلو میں، ہندوستان کی تقریباً ایک صدی کی سیاسی ہنگامہ آرائیاں، مدنی تحریکیں، تہذیبی سرگرمیاں، معاشی ناہمواریاں، مجلسی رنگینیاں، موسمی جھلکیاں، تقریباتی گہما گہمیاں، ثقافتی بلور باریاں، اور ناقابلِ فہم افراد کی حیرت ناکیاں،...... ولولہ انگیز و پُرشور براتیوں کے مانند، معرضِ حرکت میں نظر آئیں گی ___

میں نے اپنی زندگی کی تصویر کو، اپنے پورے عہد کے بہت بڑے چوکھٹے میں لگا کر پیش کیا ہے۔ یہ صرف میری، یعنی ایک فرد ہی کی داستانِ حیات نہیں ہے ___ یہ تو ایک صدی کی داستان ہے ___ ایسی بھرپور صدی کی داستان

جس میں عہدِ رفتہ کے حالات، تاریخ کے مڑتے ہوئے دھارے، مشرقی و مغربی تہذیبوں کا تصادم، قدیم اقدار سے، جدید اقدار کی آویزشیں، فرنگی کا عروج و زوال، دورِ عبوری کے بھونچال، ہندو مسلم اتحاد و عناد، قدماء کی وضع داریاں، عجیب و غریب افراد کی سیرتیں، طلوع و غروب کی رنگ سامانیاں اور سوگ واریاں، مردوں کی سج دھج، عورتیں کے گہنے پاتے، دورِ قدیم کے ملبوسات و ماکولات، ان کے مرغوبات و مکروہات، جنوں، پریوں کے حکایات، تہواروں کی دھومیں، مجلسوں کے آداب، اور، شادیوں کے ناچ گانے ــــ یہ سب کے سب، اپنی اپنی نقابیں اُلٹے نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوں گے۔

اور اُسی کے دوش بدوش اس دائرۂ خنجر و ہلال میں میری داستانیں، میری زندگی کے بیتے لمحے، میرے بچھڑے یار و آشنا، میری کھوئی ہوئیں برساتیں، میری لٹکتی راتیں، میری، چھپ چھپ کر ملاقاتیں، میرے دورِ عاشقی کی راگنیاں، ہچکیاں اور مناجاتیں، اور میرے گم کردہ نگارانِ بادہ فام و بلور اندام، زلف چھنکاتے اور انگڑائیاں لیتے نظر آئیں گے۔ آپ اس ''برات'' کو دیکھیں گے تو پتا چل جائے گا کہ میں کیا تھا ــــ اور اب کیا ہو کر رہ گیا ہوں۔

آدمی جس قدر بلندی سے گرتا ہے، اُسی کے بقدر چوٹ بھی زیادہ آتی ہے ــــ میں ایک بہت بڑی بلندی سے گرا ہوں، اور، اسی بناء پر، میری چوٹوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا ــــ

میں، اودھ کے ایک ایسے خانوادۂ عالی میں پیدا ہوا تھا، جس کے قبضۂ قدرت میں بے شمار دولت بھی تھی، اور بے پناہ اقتدار بھی تھا ــــ میرے جدِّ اعلےٰ حسام الدولہ، تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں بہادر گویا، اودھ کے سپاہ سالار بھی تھے اور ایک صوبے کے گورنر بھی۔ اس لیے میرا بچپن سونے کے پالنے میں جُھولا ــــ میرا لڑکپن مخمل کے فرش پر کھیلا ــــ اور میری جوانی مدھ ماتیوں کی زلفوں کی چھاؤں میں جھومی اور اینڈی ــــ

لیکن جب عمرِ ڈھال کی طرف آنے لگی، میری امارت کا آفتاب ڈوب گیا۔ ناقدر شناس و بے مہر دنیا نے میرا خلعتِ خواجگی چھین کر، مجھے غلامی کا لباس پہنایا، اور، میری گردن میں نظامِ دکن کی ملازمت کا طوق ڈال دیا

میری سانس رکنے لگی___ مگر کیا کرتا___ اپنے نازوں کے پلے ہوئے بچوں کی ذمہ داری پر نگاہ کر کے میں نے اس اہانت سے مصالحت کر لی۔
مگر کچھ دن کے بعد، میری ناقابلِ برداشت خودداری اور میری موت سے بھی نہ ڈرنے والی راست گفتاری نے، مجھ سے نظامِ دکن کے خلاف ایک نظم کہلائی، اور اعیانِ حکومت کی بھری مجلس میں پڑھوا بھی دی___ جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ میں معتوبِ سلطانی ہو کر حیدر آباد سے خارج البلد کر دیا گیا___ نوکری بھی ہات سے گئی، اور اُس سے بھی جُدا ہو گیا، جس کی ایک لمحے کی جدائی بھی ایک صدی معلوم ہوتی تھی اُس کے بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔ میرے جگری دوست پنڈت جواہر لال، مجھ کو بمبئی سے پکڑ لائے، اور حکومتِ ہند کے ماہ نامہ ''آج کل'' کا مدیرِ اعلیٰ بنا دیا۔ اور زندگی فراغت و عزت سے گزرنے لگی___
ہندوستان کی آزادی کے بعد جب میں نے دیکھا کے خود پنڈت نہرو کے علی الرغم، اردو زبان پر چھری پھیری جا رہی ہے تو میں نے ارادہ کر لیا کہ، اپنی زبان کی خدمت کے لیے پاکستان چلا جاؤں___
نہرو نے مجھ کو لاکھ لاکھ روکا، مگر اردو کی لگن ایسی لگی تھی کہ میں نہرو کی نم آلودہ پلکوں کے سائے سے گزرتا ہوا، پاکستان آ گیا۔ میرے پاکستان آتے ہی، یہاں کے تمام اخبار مجھ پر بھونکنے لگے۔ میں نے کسی کا جواب نہیں دیا، اور اس دُھن میں لگ گیا کہ یہاں اردو اکاڈمی قائم ہو جائے میں اس دُھن میں تین چار برس تک برابر دوڑا، ہر چند اردو اکاڈمی نہیں بن سکی، لیکن ممتاز حسن صاحب کی دست گیری کی بدولت ''ترقی اردو بورڈ'' کے قائم کرنے میں کام یاب ہو گیا، اور وہاں مشیرِ ادب و مدیرِ لغت کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔
اُس کے بعد اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جب میں ۱۹۶۷ء میں،
اپنے آم کے باغوں کا انتظام درست کرنے کے واسطے ہندوستان گیا___، اور وہاں بمبئی کے ایک انگریزی اخبار میں میرا انٹرویو شائع ہوا___ تو یہاں کے ایک متعصب اخبار نے میرے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا، جب لاہور پہنچ کر اُس اخبار کی دروغ بیانی و زہر افشانی کا مجھ کو علم ہوا تو میں نے اخباروں میں

اُس کا ابطال شائع کرادیا۔ لیکن لاہور سے جب کراچی پہنچا تو میرے دفتر کے اعزازی سکریٹری شان الحق حقی نے، بمبئی کے اُس انٹرویو کے سلسلے میں مجھے ایک نہایت اوچھا اور سوقیانہ مراسلہ بھیج کر، مجھ سے جواب طلب کیا___ میں نے کہا اللہ تیری شان۔

میرا اور حقی صاحب کا برتاؤ خوردانہ و بزرگانہ تھا، مجھے اُن کی تحریر سے یہ خیال کر کے بڑی تکلیف ہوئی کہ وہ ایک اچھے خاندان کے رکن ہیں، انہوں نے ایسا غیر شریفانہ برتاؤ کیوں روا رکھا (مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھ سے بھرے بیٹھے تھے)

دو ایک غیر مہذب و ننگِ شرافت مراسلوں کے بعد میں نے ان کو صاف صاف لکھ دیا کہ میں جس خاندان کا فرد، اور جس مزاج کا شخص ہوں، وہ ٹوٹ تو سکتا ہے، مگر لچک نہیں سکتا___ آپ جو چاہیں، سو کریں۔

نگاہِ گرم سے حالت ہو دل کی اور تباہ
ترا یہی ہے ارادہ اگر تو بسم اللہ

حقی صاحب میں اس قدر جسارت تو تھی نہیں کہ وہ مجھے یہ لکھتے کہ میرے بمبئی کے انٹرویو کی بناء پر مجھے علیحدہ کیا جا رہا ہے اس لیے انہوں نے میری بہمہ وجوہ کارآمد درازیٔ عمر کو حیلہ بنا کر، مجھ کو ملازمت سے سبک دوش فرما دیا۔

اُسی کے ساتھ ساتھ ایک اوچھے وار کی صورت سے وزارتِ اطلاعات عامہ کے ایمائے مبارک سے، میرے پاس جو ذیل پاک کی ایجنسی تھی وہ بھی چھین لی گئی، اور، خیر سے، میرا پاسپورٹ بھی ضبط فرما لیا گیا۔

اُس کے بعد حقی صاحب اور وزارتِ اطلاعات کو جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب میرے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا ہے، تو انہوں نے اطمینان کی سانس لی، اور میرے وسائل معاش کی شمع گل کر کے اپنے اپنے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے___

مگر وہ جو کہتے ہیں جس کو اللہ رکھے، اُسے کون چکھے، میں اب تک زندہ ہوں، میرا اکل و شرب حسب دستور جاری ہے، اور نعرہ لگا رہا ہوں کہ:___ ہم مرے تو ہم مریں، ہمری مرے بلائے۔

میرے بدخواہانِ کرام کو، جنہیں میں، دل سے معاف کر چکا ہوں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ:

قتلِ ایں خستہ ، بہ شمشیرِ تو ، تقدیر نہ بود
ورنہ ہیچ از دلِ بے مہرِ تو تقصیر نہ بود

اس تمہید کے بعد، جیسا کہ "حُریت" سے طے ہوا ہے، میں آئندہ اتوار سے، اپنے حالات لکھنا شروع کر دوں گا۔ آپ انتظار فرمائیں ____ لیکن مجھ پر ترس نہ کھائیں اس لیے کہ بحمد اللہ:......

گوہرِ مخزنِ اسرار ہماں است کہ بود
حقۂ مہر بداں ، مُہر و نشاں است کہ بود
عاشقاں، زمرۂ اربابِ امانت باشند
لاجرم ، چشمِ گہر بار ہماں است کہ بود
از صبا پرس کہ مارا ہمہ شب ، تا دمِ صبح
بوئے زلفِ تو ہماں مونسِ جان است کہ بود

جوشؔ۔ باوصف شدائد اب بھی صاحبِ تن و توش۔ اور کیوں نہ ہو کہ: ____

ثبت است بر جریدۂ عالم ، دوامِ ما !

۶۹/۵/۹

'میرے چند قابلِ ذکر احباب'

یادوں کی برات کی فہرست میں پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں ۔ا___ چند ابتدائی باتیں،۲___ میرا خاندان،۳___ میرے چند قابلِ ذکر احباب،۴___ میرے دور کی چند عجیب ہستیاں،۵___ میرے معاشقے۔

ان پانچوں ابواب میں تیسرا باب یعنی 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' اس خودنوشت کا بہت اہم باب ہے۔ یہی وہ باب ہے جس کے بیشتر صفحات یادوں کی برات کا حصہ نہیں بن سکے۔

قلمی نسخے کے مطالعے و جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جوش صاحب نے یادوں کی برات میں 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' کو بہت تفصیل سے قلم بند کیا تھا اور تقریباً ۱۳۹/احباب کے بارے میں لکھا لیکن جب کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں صرف ۳۵/احباب کا تذکرہ تھا اور ۱۰۴/احباب کے تذکرے اس میں شامل نہیں تھے۔

قلمی نسخے میں ۱۳۹/احباب کے تذکرے کو انہوں نے ردوبدل کے بعد تین شاخوں اور حصوں میں تقسیم کیا

حصہ اوّل___ میرے چند قابلِ ذکر احباب

حصہ دویم___ میرے خورد احباب

حصہ سویم___ میرے پاکستانی دوست

۶۲۳

(۲)

یلغوں کا تراشہ

افسوس، دریغا کہ ندیم گلزاران رفتند

شیریں سخنان و گل عذاران رفتند

چوں بوئے گل آمدند بر باد سوار

در حال چو قطرہ‌ہائے باران رفتند !!!

—

”یاں کبھی دھوپ ہے، گلاب سایا“

”رستا ہے سحاب، آب حیات چھایا“

”جلدی آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح“

”آیا — یاران رفتہ! آیا، آیا“

(حصہ اوّل)

میرے چند قابلِ ذکر احباب☆

☆ وہ احباب جو یادوں کی برات (مطبوعہ) میں شامل نہیں ہیں لیکن قلمی نسخے میں اُن کا تذکرہ موجود و محفوظ ہے۔ ان احباب میں سے ۵۹ کا تذکرہ اس حصۂ اوّل میں کیا گیا ہے۔

ہلال نقوی کے نام

جوش ملیح آبادی کے دو خطوں سے اقتباس

میاں ہلال نقوی، خوش وخرم رہو.......... 'یادوں کی برات میں نہ صرف جمیل مظہری بلکہ دوسرے دوستوں کا بھی ذکر تھا، مگر نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی، کتاب چھپنے گئی، تو اس کے اصل مسودات میں سے بعض تذکرے کوئی لے اڑا..........'

۲۴ر ستمبر ۱۹۸۰ء، اسلام آباد

پیارے ہلال.......... 'تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے، مجھے اپنی طبیعت پر، بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں۔ تم نے جس سوال کا جواب چاہا ہے، وہ بہت تفصیل چاہتا ہے، اور، کمزوری ہے کہ بدن توڑے دے رہی ہے۔ زیادہ لکھتا ہوں تو حروف کی شکلیں مسخ ہونے لگتی ہیں..........'

تمہارا بیمار جوش، ۱۷ر جون ۱۹۸۱ء اسلام آباد

(جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی ۱۹۸۸ء، ص: ۱۷۳، ۱۷۴)

حکیم مخمور

لکھنؤ کے نامی اطبائے "جھوائی ٹولہ" کے خاندان کے چشم چراغ۔ طبیب، نیم مفکر، شاعر، عاشق مزاج، رند مشرب، مُغنی، اور اختلاج کے مارے ہوئے، پستہ قامت و ملائم اعضا، آدمی تھے۔
اُن کی صحت خراب تھی، اور مئی جون میں بھی اُن کے، روئی کے سے ملائم ہات، برف کی طرح ٹھنڈے رہتے تھے۔ اور، اثنائے بادہ خواری میں اپنی مونچھوں اور کنپٹی کے بالوں کو بار بار چھوا کرتے تھے ___
اُن کی یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ بند مقام پر بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے ___ اور جب ہم میں سے کوئی اُن کو چھیڑنے کے لیے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا تو وہ ماہیِ بے آب کے مانند، تڑپنے اور چلّانے لگتے تھے ___ اور تو اور، وہ ریل کے سفر میں بھی اپنے درجے کا دروازہ کھلا رکھتے، اور، گاڑی ٹھہرتے ہی، کھٹ سے، ہر پلیٹ فارم پر اُتر جایا کرتے تھے ___ ایک بار، دھوکا کھا کر وہ میرے ساتھ لفٹ میں کھڑے ہوگئے، اور جب لفٹ والے نے اس کا دروازہ بند کیا اور وہ، سرسرا کر، اوپر چڑھنے لگا تو انہوں نے اس قدر زور زور سے چیخنا شروع کر دیا کہ لوگوں کے حواس اُڑ گئے۔ اور لفٹ والا گھبرا کر، فوراً لفٹ کو نیچے لے آیا اور دروازہ کھول دیا، لیکن لفٹ سے باہر آ جانے کے بعد بھی، وہ تھوڑی دیر تک، برابر چیختے رہے ___ اور اُن کے گرد میلا سا لگ گیا اور انہیں باتوں کو دیکھ کر میں نے ان کا نام رکھ دیا تھا "وحشت کا چتوغا" ☆ مجاز کی طرح، مخمور کو بھی شراب کا ہوکا تھا، اور تنگ ظرفی کے باوجود، چاہتے یہ تھے کہ گھڑوں پی جائیں، رئیس احمد میری محفل کے ساقی تھے، وہ مخمور کو جان بوجھ کر، شراب کی کم مقدار دینا چاہتے تھے تاکہ وہ مدہوش نہ ہو جائیں، مخمور کو رئیس احمد کی یہ اداز ہر لگتی تھی، اور جب رئیس اُن کے پیانے میں شراب اُنڈیلتے تھے تو وہ، بار بار جھک کر اُس کے قطرے گنا کرتے تھے ___ اور، ہات بڑھا بڑھا کر کہا کرتے تھے، خدا کے واسطے ذرا سی اور ___ اور جب رئیس مقدار نہیں بڑھاتے تھے، تو اُس کا وہ یہ توڑ کیا کرتے تھے کہ جلدی جلدی اپنا ساغر خالی کر کے، میرے سامنے رکھ دیتے تھے، اور میں رئیس سے کہا کرتا تھا کہ اس کاسۂ گدائی کو جلد بھر دو ___ صد حیف کہ اختلاج کی شدت اور شراب کی کثرت نے انہیں قبل از وقت ہلاک کر دیا۔ اور وہ بے شمار صلاحیتیں لیے ہوئے زمین کا پیوند بن گئے۔

☆ ___ یادوں کی برات میں جوش صاحب نے اپنے نواسوں کو جو خطابات عطا کیے ہیں اُن میں اپنے تیسرے نواسے پرویز شہاب خاں کو بھی انہوں۔ نے 'وحشت کا چتوغا' لکھا ہے (ص ۳۹۱)

میرزا جعفر حسین ☆

لکھنؤ کے نام ور و کام یاب ایڈووکیٹ تھے۔ اور اب شہر کے مشہور ناکام لیڈر ہیں ___ پلیڈری میں بہت کچھ کمایا، لیڈری میں سب کچھ گنوا دیا ___ پلیڈری کی ''پ'' کاٹ کر اس کو ''لیڈری'' بنا دیا۔ پیٹ کی ''پ''(Pay) بھی ہات سے گئی، اور مفلس ہو کر رہ گئے ___

☆ ___ میرزا جعفر حسین کا شمار جوش صاحب کے انتہائی قریبی دوستوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ بھی انیسویں صدی کے اُسی آخری عشرے میں پیدا ہوئے (۱۸۹۹ء) جس میں جوش صاحب کی ولادت (۱۸۹۴ء) ہوئی۔ اور اُن کی وفات (۱۹۸۹ء) بھی بیسویں صدی کے اُس عشرے میں ہوئی جس میں جوش صاحب کا انتقال (۱۹۸۲ء) ہوا۔ اُن کا شمار لکھنؤ کی انتہائی گراں قدر اور صاحب مطالعہ شخصیات میں کیا جانا چاہیے اُن کی کئی تصانیف ہیں جن میں، بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں، متاعِ غالب، مسعود حسن رضوی حیات و خدمات اور اُن کی آپ بیتی کشمکش حیات سے اہلِ ادب بہ خوبی آگاہ ہیں۔ میرزا جعفر حسین کے نام جوش صاحب کے ۱۳ خطوط راغب مراد آبادی نے 'مخطوطِ جوش ملیح آبادی' (ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۶۴ تا ۷۶) میں جمع کر دیے ہیں یہ خطوط ۱۹۴۳ء (پونہ) سے ۱۹۷۶ء (اسلام آباد) کے درمیان لکھے گئے۔ ان خطوط سے میرزا جعفر حسین صاحب سے جوش صاحب کے قریبی تعلقات کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ۹ ر جولائی ۱۹۴۳ء کو پونا سے ایک خط میں جوش صاحب لکھتے ہیں:

'' ___ میرزا صاحب آپ کے جانے کے دوسرے ہی دن ملیریا جسم کے اندر ادھم مچانے لگا، اور اس قدر شدید بخار آیا کہ اللہ دے اور بندہ لے...... حسرت رہ گئی کہ دو چار راتیں بمبئی میں اور آپ کے ساتھ گزر جاتیں...... پرسوں پانچ دانت اور نکلوا دیے اب پوپلے منہ کے ساتھ بمبئی آ گیا جاؤں، اس مہینے کی انیسویں یا بیسویں تک، صاحب دنداں ہو جاؤں گا، اس کے بعد بمبئی کی زیارت کروں گا۔ خضاب اور اصغر علی کا دانے دار سیاہ زردہ، جس کا ایک تین ۸ کا ہوتا ہے جلد سے جلد وی پی کر دیجیے...... حکیم صاحب، احتشام صاحب، وزیر صاحب، امید صاحب، اعظم صاحب اور اُن...... (دو لفظ مٹے ہوئے ہیں) عالیہ سے میر اسلام کہیے گا جو گاہ گاہ حکیم صاحب کی معیت میں آتے، اور مہین مہین مسکراتے تھے ___'' (ص ۶۴)

اُن کی قانون دانی کا تو مجھ کو علم نہیں کہ اس کوچے سے قطعاً بیگانہ ہوں ___ البتہ اُن کی غیر معمولی علمیت وادبیت کے بارے میں، بلا خوفِ ابطال، یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ وہ، اس میدان میں، ایک استثنائی شخصیت کے مالک ہیں۔ لیکن اس کا بھی نہایت افسوس کے ساتھ، اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُن میں عقلِ سلیم کا عنصر کم ہے۔ بارہا کہہ چکا ہوں کہ مطلق العنان ذہانت بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے، اور اُس کے منہ میں اگر عقلِ سلیم کی لگام نہیں لگائی جاتی ہے، تو وہ اپنے راکب کو گرا کر، پامال کر ڈالتی ہے ___ اور اسی بناء پر وہ پامال ہو کر رہ گئے ہیں۔
بنیادی طور پر وہ نہایت شریف اور مخلص انسان ہیں ___ لیکن اپنی ناعاقبت اندیشی کی پیدا کردہ احتیاج کے ناقابلِ برداشت بوجھ کے نیچے دب کر جب وہ کراہنے لگتے ہیں تو، گاہ گاہ، شرافت واخلاص کا دامن، اُن بے چارے کے ہات سے چھوٹ جاتا ہے ___ اور کیوں نہ ہو کہ ___ 'بوقتِ احتیاج، شیر مرداں را در نقب ہا گرفتار کردہ اند'
جب کبھی لکھنؤ جاتا ہوں، اُن کو آفات میں گھرا پاتا ہوں ___ ہائے دریائے علم وادب کا اتنا بڑا پیراک، ڈوبتا چلا جارہا ہے قعرِ ادبار میں۔ اپنی زندگی کے اُس زرّیں دور کو، بڑی حسرت سے، یاد کیا کرتا ہوں جب کہ میرزا جعفر حسین کے مکان پر، ہم تمام اولیائے خرابات کی پھڑ جما کرتی تھی، اور، حکیم صاحب عالم کا سا متقی، صدارت کیا کرتا تھا ___ ہائے وہ سرشار جولانیاں، وہ مستانہ شعر خوانیاں وہ یاروں کی جادو بیانیاں ___ وہ بادہ گساروں کے نرت، وہ مخمور کے گلے کی چلت پھرت ___ وہ مجاز کا ناچنا گانا، وہ یاروں کا بھاؤ بتانا ___ وہ زمزمے، وہ قہقہے، وہ لطیفے ___ وہ فحاشیاں، اور وہ اوباشیاں ___ اب اُن راتوں کو یاد کرتا ہوں تو دل پر گھن سا چلنے لگتا ہے ___ ارے کیا ہم دو دن اس لیے ہنسائے جاتے ہیں کہ عمر بھر رُلائے جائیں؟ ۔ ارے یہ اسکیم بنائی ہے کس نے؟ کس نے دہکایا ہے یہ الاؤ؟ ذرا اسے میرے سامنے تو لاؤ۔

❁

جگر، مرادآبادی

صورت کے اعتبار سے ناقابلِ برداشت، مجموعی سیرت کے اعتبار سے قابلِ محبت انسان تھے۔اُن کا رنگ سیاہ تھا، اور اُن کے رخساروں کی دونوں ہڈیوں کے اوپر، اُس سے بھی سیاہ تر، دو چلکتے پڑے ہوئے تھے۔ جنھیں دیکھ کر اخترؔ اکبرآبادی نے کہا تھا کہ جگرؔ تم ساری دنیا سے نرالے مبروص ہو، ہر برص کے مریض کے چہرے پر سفید دھبے ہوتے ہیں، لیکن تم سیاہ برص میں گرفتار ہو۔

اُن کا دہانہ بڑا تھا، داڑھی گھنی تھی، سر پر، بڑے بڑے پٹے تھے، قد اوسط درجے کا تھا، آنکھوں سے ذہانت و ثقافت کے بجائے دحشت ٹپکتی تھی۔اور معاش کی خاطر، وہ بے چارے، پھیری والوں کی طرح، عینک فروشی کیا کرتے تھے۔جس طرح نومسلم، راسخ العقیدہ اور سخت متعصب ہوتا ہے، اسی طرح چوں کہ وہ شیعہ سے سنّی ہو گئے تھے، اِس لیے نوسنّی ہونے کی بنا پر، وہ بڑے زبردست حنفی اور شیعوں کے نہایت مخالف تھے۔اور، انتہائی بے تکلفی کی بنا پر، چوں کہ میں اُن کو دین داری و دہریت اور سنیت و شیعیت کے سلسلے میں اکثر، چھیڑا کرتا تھا، اِس لیے اُنھوں نے مجھ کو "دہریہ رافضی" کا خطاب بخش دیا تھا اور میرے عقائد اور میری شاعری، دونوں کی وہ بے حد مذمت کیا کرتے تھے۔لیکن اِس کے باوجود اُن کو، مجھ سے، اور مجھے اُن سے، بہت زیادہ محبت تھی۔

ایک دن جب میں نے اُن سے کہا "ارے جگروے! (جگرؔ) تُو میری مذمت و غیبت میں جس قدر اپنا وقت برباد کرتا ہے، اگر اُس وقت کو مطالعہ و تفکّر میں صَرف کرے تو آدمی بن جائے" ____ تو اُنھوں نے کہا" ارے بھیے! (جوشؔ) رکھا ہی کیا ہے مطالعہ و تفکّر میں۔ فکر انسان سے ایمان کی دولت چھین لیتی ہے، اب رہا مطالعہ، سو کتابیں بھی اِس قابل ہوتی ہیں کہ کوئی شاعر اُن کو منہ لگائے"

میں نے کہا "قرآنِ مجید بھی ایک کتاب ہے، اُس کے باب میں کیا ارشادِ عالی ہے؟" اور وہ بغلیں جھانکنے لگے۔

میں نے کہا "بغلیں نہ جھانکو، تم کو کتابوں سے اِس قدر بیر ہے کہ تم، اپنے تحتِ شعور سے، مجبور ہو کر، نادانستہ طور پر سہی، لیکن قرآنِ حکیم کی مذمت کر چکے ہو"

اُنھوں نے کہا، ''غلط، بالکل غلط!''
میں نے کہا، ''اپنا شعر سن لو:

کدھر سے برق چمکتی ہے، دیکھیں اے واعظ[۱]
میں اپنا جام اٹھاتا ہوں، تُو کتاب اٹھا''

میں نے کہا'' کیا یہ تمھارا شعر نہیں ہے؟'' اُنھوں نے جواب دیا'' ہے تو میرا ہی شعر''
میں نے کہا،'' اِس شعر میں تم اپنے جام کو واعظ کی کتاب پر ترجیح دے رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ واعظ کی کتاب 'فسانۂ عجائب' ہی ہے نہ 'طلسم ہوش ربا'۔ واعظ کی کتاب تو قرآن اور صرف قرآن ہے، اب تو پکڑے گئے''

اُنھوں نے سر جھکالیا اور دونوں کان پکڑ کر توبہ توبہ کرنے لگے۔ دہلی کا ذکر ہے۔ ایک روز وہ آئے، نشے میں دُھت۔ میرے زانو پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے:

''ابے دہریے رافضی! میں تجھ سے فقط یہ بات کہنے آیا ہوں کہ سوئی کے ناکے سے تو بیس ہزار اونٹ گزر سکتے ہیں، مگر کم بخت رافضی کبھی شاعر ہو ہی نہیں سکتا'' میں نے کہا'' شاعر تو بڑی چیز ہوتا ہے، رافضی تو آدمی بھی نہیں ہو سکتا''

یہ سن کر میرے ایک پرانے، کٹّر شیعہ دوست سید محمد عسکری صاحب بگڑ گئے۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا، میں خوب جانتا ہوں کہ آپ، اِس وقت مذاق فرما رہے ہیں، مگر اِس خارجی کے سامنے تو ایسا مذاق نہ کیجیے۔ جگر نے اپنے متعلق 'خارجی' سنا تو میرے زانو سے اتر کر عسکری صاحب سے ہاتھا پائی کرنے لگے۔ عسکری تگڑے آدمی تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اُن کو گرائے دے رہے ہیں تو میں نے اور آزاد صاحب انصاری نے، درمیان میں آ کر، اُنھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور میں نے قہقہہ مار کر حضرتِ اکبر کا یہ شعر پڑھا:

شیعہ و سنّی میں، جنگ، اک دھوم دھامی ہو گئی
چار یار و پنج تن کی نیک نامی ہو گئی

وہ اُن لوگوں سے میں سے تھے کہ اگر وہ خرابات کا رخ کریں تو حاجب کا یہ فرض ہے کہ وہ اُن کو دروازے ہی سے پلٹا دے اور خانقاہ جانے میں تساہل کریں تو پولیس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ کوڑے مار مار کر اُن کو، وہاں لے جائے اور باہر سے زنجیر لگا دے۔ شراب، اُن پر، قطعی طور سے حرام تھی۔ وہ شراب کو بدنام کرنے والوں کے سردار تھے اور اُن کو دیکھ کر، بدتوفیقوں کو موقع ملتا تھا یہ کہنے کا کہ شراب اُمّ الخبائث اور عمل شیطانی ہے۔

---

[۱] میں نے یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ ''برق چمکنا'' روزمرہ کے خلاف ہے ''بجلی چمکنا'' کہنا چاہیے۔

ترکِ شراب کے بعد، ایک روز، وہ شام کو میرے پاس آئے، کہنے لگے "جوش! مجھ سے پینے کا اصرار نہ کرنا" میں نے کہا

"بھائی، تمھاری توبہ سے تو شراب کو اُس کی تلف شدہ عزت واپس مل گئی ہے، تم نے بنتِ عنب کے سر سے چادر اور پاؤں سے پاپوش چھین لی تھی، تمھاری ترکِ بادہ خواری نے اُس کی چھنی ہوئی چادر اور پاپوش واپس کر دی ہے۔ کیا مجھے کتے نے کاٹا ہے کہ تم کو، دوبارہ مے خواری کے ڈھرّے پر ڈال کر، شغلِ رندی کو پھر بدنام کرنے کی طرح ڈال دوں"

اُس دور میں بھی جب کہ وہ، چارپائیوں پر لد کر، مشاعروں میں آیا کرتے ☆ اور تمام ہندوستان میں اُن

☆___ اسرار الحق مجاز کی مے نوشی کے غیر معتدل روّیے نے اُن کی صحت پر جو شدید مضر اثرات قائم کیے تھے اُس سے جوش صاحب بہت پریشان و مضطرب تھے۔ اُن کی نظم 'پند نامہ' (۱۹۴۹ء) اسی تاثر کی عکاسی کرتی ہے۔ جس میں جوش صاحب مجاز کے لیے ایک ناصحِ مشفق کے کردار میں نظر آتے ہیں۔ ۱۵۲، اشعار کی اس نظم میں جہاں جگر مرادآبادی کا تذکرہ ہے وہ چند شعر یہ ہیں:

کثرتِ بادہ رنگ لاتی ہے — آدمی کو لہو رلاتی ہے
اور جب آفت جگر پہ لاتی ہے — رند کو مولوی بناتی ہے

———

یاد ہے جب جگر چڑھاتے تھے — کیا اُلف ہو کے بن ہناتے تھے
میری گردن میں، بھر کے چند آہیں — پاؤں سے ڈالتے تھے وہ بانہیں
عقل کی موت علم کی پستی — الاماں، لعنتو یہ مستی

ان اشعار کے ساتھ جوش صاحب نے ایک حاشیہ بھی لکھا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"___ میرے حبیب سوفور اور رفیقِ مغفور حضرتِ جگر مرادآبادی (ساقی مشہور) اپنے زمانۂ رندی میں بھی ظاہری تر دامنی کے باوجود، بہ باطن ماشاءاللہ ایک زاہدِ خشک ہی تھے۔ اور اب تو از روئے طریقتِ صوفیائے خوش کلام اپنے دورِ بندگی میں اور از روئے شریعتِ قلندرانِ کرام، اپنے دورِ ارتداد میں وہ نام خدا ایک ایسے چھوٹے موٹے بڑے یا اڑھے قسم کے پیر جی بن چکے ہیں، جسے محرابِ خانقاہ، مزارِ عبدل شاہ اور مریدانِ گردن کوتاہ کا انتہائی ذوق اور شدید انتظار ہے اور اس کربِ انتظار میں گڑگڑا، گڑگڑا، اور ناک رگڑ رگڑ کر، بوڑھی بیواؤں کی طرح وہ صبح شام دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اے ربِ مقلب القلوب مجھ بلبلِ بُستانِ غزل سرائی کو جلد سے زاغِ 'تکیہ شریف' میں تبدیل فرما دے تا کہ حورانِ بہشتی کا صدقہ بن سکوں ___ قبول مبادا ایں دعائے نا ہنجار، یا جبارُ و یا قہار! ___"

جوش کی نظم پند نامہ اُن کے شعری مجموعے 'سرود و خروش' میں (۱۹۵۲ء، دہلی صفحہ ۱۳۱ تا صفحہ ۱۶۱) شائع ہوئی ہے

کی 'رندی' کے ڈنکے پٹے ہوئے تھے، میں کہا کرتا تھا کہ جگر قطعی طور پر رند نہیں، فقط شراب خوار ہیں۔ رندی میں ذہن کی بیداری، آداب کی اُستواری اور تمام عالمِ انسانی کی غم خواری ایک لازمی چیز ہے، اور جگر اِن تمام امور سے دور رہتے، شیعہ سنّی کے جھگڑوں میں اپنا وقت ضائع کرتے، اور جب نشے میں چور ہو جاتے ہیں تو اللہ اللہ، اللہ اللہ کے نعرے لگاتے رہتے ہیں، میری یہ پیش گوئی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن، شراب ترک فرما کر خالص کٹھ ملا بن جائیں گے۔ چناں چہ میری پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔ اُنھوں نے شراب چھوڑ دی اور اپنی جماعت کے علاوہ، ساری دنیا پر کفر کے فتوے لگانے لگے۔ پھر بھی، اُنھوں نے، پابندی کے ساتھ، نماز نہیں پڑھی، اور تاش بازی کے نشے میں ڈوب گئے۔

حیدرآباد سے اخراج کے بعد، میں نے، جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں، کئی مہینے دھول پور میں گزارے تھے۔ اور، اُس زمانے میں، جگر صاحب کو آگرے سے، دھول پور لے آیا اور غالباً ڈیڑھ دو مہینے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میں نے اُن کی داڑھی منڈا دی تھی، اُن کو صبح وشام کے غسل پر مجبور کر دیا تھا اور دن کی بادہ خواری بالکل چھڑا دی تھی، جس کا اُن کی صحت پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ راتوں کو ہم روپ سنگھ کی کوٹھی، یا اختری بائی کے کمرے پر بیٹھا کرتے تھے، اور جب وہ پی کر "یاہو، یاہو" کے نعرے لگانے لگتے تھے، تو ہم سب، چونچ دکھا دکھا کر، "یابدٔ هوهو، یابدٔ هوهو" کے جوابی نعروں سے اُن کو چڑھایا کرتے اور وہ بگڑ کر ہم سے کہا کرتے تھے کہ "اے مردودو! تمھارا ٹھکانا ساتویں جہنم کے سوا اور کہیں نہیں ہے" اور جب رات کو ہم اُنھیں "خدا حافظ" کہہ کر رخصت ہونے لگتے تھے، تو وہ جل کر فرماتے تھے، "تم کافروں کا شیطان حافظ!"

دین کے علاوہ، شاعری پر بھی، ہم دونوں میں، بڑی نوک جھوک رہا کرتی تھی۔ میں اُن کو "گجلیا"[۱]، کہتا اور وہ مجھ کو "نجمیا"[۲] کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔

ایک روز ہم دونوں 'گجلیے' اور 'نجمیے' تانگے میں جا رہے تھے۔ ایک بڑے سے کھانچے میں پھنس کر جب ہمارے تانگے میں زور سے جھٹکا لگا تو اُن کے منہ سے نکل گیا، "یا اللہ" اور میں نے فوراً کہا، "لبیک یا عبدی!" اُنھوں نے کہا میں نے تو اللہ کو پکارا تھا، یہ شیطان کہاں سے بول اٹھا۔ میں نے کہا "شیطان کے عز و شرف سے واقف بھی ہو؟ شیطان تو نام ہے مصلحتِ ایزدی کا۔ اور تم بدھو، یزدان و اہرمن کے چکر میں پڑے ہوئے ہو"

اُنھوں نے کہا "بزرگانِ دین نے سچ کہا ہے کہ مباحثے میں کوئی شیطان سے جیت نہیں سکتا" وہ بے چارے، کبھی فارغ البال نہیں رہے، پھر بھی، جو کچھ بھی مشاعروں وغیرہ سے اُن کو مل جاتا تھا، اُس

---

[۱] + [۲] میں غزل کو معرضِ تحقیر میں لا کر "گجل" کہتا اور "گجل" میں "یا" کا لاحقہ لگا کر "غزل بکنے والا" کا مفہوم پیدا کرتا اسی طرح وہ "نظم" کو "نجم" میں پیدا کر کے "نظم بکنے والا" کے معنی پیدا کرتے تھے۔

سے وہ مستحقین کی امداد کیا کرتے تھے۔

اُن کی عیب پوشی و نیک نفسی کا یہ عالم تھا کہ ایک روز جب وہ سیلون میں بال ترشوا رہے تھے، اپنے سامنے کے آئینے میں جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ اُن کی پشت پر لٹکی ہوئی شیروانی سے اُن کے ایک ساتھی اُن کا بٹوا نکال رہے ہیں۔ اُس فرشتہ سیرت انسان نے، آنکھیں جھکا لیں، اور ایک حرف بھی نہیں کہا۔ کوئی اِس امر سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ ایک نہایت خوش فکر غزل گو تھے، لیکن اُن کا وہ سریلا گلا، جو اُنھوں نے اپنے سوز خواں باپ ☆ سے بطور وراثت پایا تھا، اگر اُن کا ساتھ نہ دیتا تو اُن کو اِس قدر قبولِ عام کا شرف کبھی حاصل نہ ہوتا۔

آخر میں ایک نہایت دل چسپ واقعہ بھی سن لیجیے۔ ایک بار، ہم لوگ، ریل میں سفر کر رہے اور، ایک پرانی وضع کے بڑے میاں، ہمارے چہچہوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ وصل صاحب نے کہا ''ارے جگر صاحب، ایک پان تو بنا دیجیے''

جگر کا نام سن کر وہ پرانی وضع کے بڑے میاں اچھل سے گئے، اور پھر کچھ سوچنے سے لگے اور اُن سے جب ضبط نہ ہو سکا تو وہ جگر صاحب کے قریب آ گئے اور اُن کو گھورنے لگے۔

جگر نے پوچھا ''جناب والا، کیا بات ہے؟''

انھوں نے پوچھا ''جگر صاحب مراد آبادی آپ ہی ہیں''

اُنھوں نے کہا ''جی ہاں، فرمایئے''

بڑے میاں نے اُن کو پھر غور سے دیکھا اور پھر، آنکھیں جھکا کر کہا، ''میاں کچھ جچے نہیں!'' ہم سب نے اُن کے اُس فقرے پر قہقہہ لگایا، اور جگر صاحب کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ـــ اور اُس دن سے ''میاں کچھ جچے نہیں'' اُن کی چوٹ بن گئی۔

☆ ـــ جوش صاحب نے پہلے 'شیعہ سوز خواں باپ' لکھا تھا پھر لفظِ شیعہ کاٹ دیا اور صرف 'سوز خواں باپ' رہنے دیا

مولوی سمیع اللہ

پستہ قامت، بلند حوصلہ، قلیل البعاعت، کثیر التواضع۔ گھنی داڑھی، شگفتہ مزاج۔ گٹھیا سے، تقریباً معذور، ذہنی چلت پھرت میں بھر پور۔ ماتھے پر، داغِ سجود کی سیاہی، دل میں، انوارِ صبح گاہی، مفتی کفایت اللہ کے داماد، لیکن عشاق کے جگت استاد، مجروحِ نماز، لیکن میہمان نواز۔ ''صاحبِ ترتیب'' حد تک پرہیزگار، پھر بھی، حسینوں کے، جان و دل سے پرستار۔ اور...... اسالیب، ان کے ناز بردار۔

پیشہ ہے کتب فروشی، دکان ہے، دہلی جامع مسجد کے سامنے، اردو بازار میں۔ دکان نہیں، خانِ خاناں کا دربار ہے، جہاں دہلی کے تمام مشاہیر کا، صبح سے لے کر شام تک، ایک، میلا سا لگا رہتا ہے۔ چائے کی پیالیاں، ہر آن گردش کرتی رہتی ہیں، دن بھر میں جو کچھ کماتے ہیں رات ہوتے ہوتے، وہ سب کچھ میہمان نوازی میں صرف کر کے، خالی جیب کو سینے سے لگا کر، سو جاتے ہیں۔

یہ اُن کی زندگی کا مستقل معمول ہے، یہ نہ رہے، تو اُن کی نبضیں ساقط ہو کر رہ جائیں۔

دہلی کے جس ہنرمند، فن کار، ادیب، یا شاعر سے آپ کو ملنا ہو، شام کو اُن کی دکان پر چلے جائیے، آج نہیں، تو کل، اُس سے ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ میں، جب بھی دہلی جاتا ہوں، اُن کو اپنے گرد و پیش پاتا ہوں، وہ میری راتوں کی محفل میں بھی آتے ہیں، اور شیشہ و ساغر کا، دور سے لطف اُٹھاتے ہیں، اور صبح ہوتے ہی جامع مسجد کی نہاری کھلاتے ہیں۔ اور بادہ خواری و پرہیزگاری کا یہ سنگم دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے ہیں۔ دہلی کی محرابِ تہذیب کے نیچے، صرف اُن کے چراغ سے روشنی باقی ہے، اللہ اس چراغ کو جلتا رکھے۔ اور، نصیبِ دشمناں جب وہ نہیں [1] رہیں گے، تو پھر اتنے صاحبانِ کمال، دہلی کی کسی ایک چھت کے نیچے، کبھی جمع نہیں ہو سکیں گے۔ اور آج وہی ایک تنہا شخص ہیں، جو دہلی کو مخاطب کر کے، بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ:

پروانوں سے، نہ شمع سے، رونق ہمیں سے ہے
ہم اُٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا!

---

[1] ــــ صد حیف کہ ابھی چند مہینے ہوئے کہ اُن کا انتقال ہو گیا، اور دہلی ویران ہو کر رہ گئی۔

شنکر پرساد، آئی، سی، ایس

درمیانہ قد، سانولے پن سے گراہٹ کی طرف مڑتا ہوا رنگ، کلین شیو، مکتب کے پڑھے ہوئے، اردو، فارسی کے شیدائی، سخن شناس، بذلہ سنج، ایسے جادو بیاں کہ جب زبان کو معرض حرکت میں لاتے ہیں، ہزاروں باغ لگاتے چلے جاتے ہیں، جی بھر کے ہنستے ہیں، دل کھول کر ہنساتے ہیں۔ تنہائی سہ نہیں سکتے، معشوقہ کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ رامش و رنگ کے رسیا ہیں، اور مزا جا کنھیا ہیں۔

میرے دہلی کے ابتدائی دور میں دہلی کے چیف کمشنر تھے۔ پھر امور کشمیر کے سکریٹری ہو کر پنشن پا چکے، اور، حوضِ خاص کے قریب، اپنے نو تعمیر و کشادہ مکان میں بچّیوں کی شادیوں، بیوی کے انتقال کے بعد، بھائیں بھائیں کرتے مکان میں خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔

اُن کی بیوی بڑی نیک اور پوجا پاٹ کی بے حد پابند تھیں۔ اور جب وہ اُن کی رنگین مزاجی کی مجھ سے شکایت کیا کرتی تھیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ہائی کار چور سے ایک شاطر گرہ کٹ کی شکایت کر رہی ہیں۔ اور ابولہب کے سامنے، ابوجہل کے کفر کا دکھڑا رو رہی ہیں۔

اُن کی عادت ہے کہ وہ چپراسی کو ''کوئی ہے؟'' کہہ کر بلاتے ہیں، ایک بار ایک بانگڑو چپراسیوں کے زمرے میں نیا نیا بھرتی ہو کر آیا تھا۔ ہم سب اُن کے کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے، اُنھیں پیاس لگی اور حسبِ معمول اُنھوں نے چپراسی کو آواز دی، ''کوئی ہے؟'' وہ بانگڑو، نیا چپراسی دوڑا ہوا اندر آیا، اور، بڑے ادب سے سر جھکا کر اُس نے کہا، ''سرکار، کوئی نہیں ہے، ورانڈا خالی پڑا ہوا ہے۔'' اور اُس کا وہ ''کوئی نہیں ہے'' کا جواب سن کر ہم سب کے پیٹ میں، ہنستے ہنستے بل پڑ گئے، اور وہ بانگڑو، گھبرا کر، کمرے سے نکل گیا کہ شاید ہم سب بھنگ پیے بیٹھے ہیں۔

ایک روز ہم لوگ اُن کے اُطاقِ جلوت [۱] میں بیٹھے ہنس بول رہے تھے کہ چپراسی، ایک بڑا سا کارڈ لے کر آیا، کارڈ دیکھ کر، اُنھوں نے کہا، ''بلا لاؤ'' اور جب ایک جوان آدمی نہایت اعلا درجے کا

---

۱ ___ drawing room

سوٹ پہنے آیا تو شنکر پرشاد صاحب "لفافہ" کہہ کر اُس سے لپٹ گئے۔ اُنھوں نے اُس سے اردو میں پوچھا، "آپ انگلستان سے کب آئے؟" اُس نے انگریزی میں جواب دیا، "کوئی ایک ہفتہ ہوا۔" شنکر پرشاد نے میری طرف اشارہ کر کے اُس سے کہا، "Please meet him, he is our greatest living poet." ("اِن سے ملیے، یہ ہمارے سب سے بڑے زندہ شاعر ہیں۔") اُس ولایت گزیدہ نے مجھ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پوچھا، "Is he Mister Ghalib?" ("کیا یہ مسٹر غالب ہیں؟") اب نہ پوچھیے کہ اِس عجیب سوال کے بعد، ہم سب کا کیا حال ہوا، ہنستے ہنستے ہم صوفوں پر گر پڑے، اور لوٹنے لگے، اور وہ پوچھنے والا، رومال سے اپنے ماتھے کا پسینا پوچھنے لگا اور اُس دن سے اُس کا نام ہی پڑ گیا: Is he Mister Ghalib?۔

ایک بار میں اُن کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مولانا صاحب نے بڑی لجاجت کے ساتھ کہا کہ میں... درگاہ کا متولّی بننا چاہتا ہوں، آپ مجھ پر اِس قدر کرم فرمائیں کہ جمعے کے دن صبح دس بجے تشریف لا کر میرے سر پر پگڑی باندھ دیں۔"

اُنھوں نے کہا، "میں کس بنیاد پر پگڑی باندھ دوں؟"

مولانا نے ٹین کے ایک لانبے سے چُنگلے سے ایک لانبا سا محضر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا، "اِسے ملاحظہ فرمائیے۔ اِس پر درگاہ کے ساڑھے تین سَو متوسّلین کے دست خط موجود ہیں کہ مجھ کو متولّی بنا دیا جائے۔" اُنھوں نے محضر پر سرسری نظر ڈال کر کہا، "مولانا صاحب، آپ کو چیف کمشنر کی ضرورت ہی کیا ہے، جب آپ اِتنا بڑا 'نقارۂ خدا' ساتھ لیے پھر رہے ہیں تو درگاہ جائیے اور اللہ کا نام لے کر خود اپنے ہات سے اپنے سر پر پگڑی باندھ لیجیے۔" 'نقارۂ خدا' سن کر میرا قہقہہ بلند ہو گیا اور مولانا اپنا منھ چُنگلے میں داخل کر کے چلے گئے۔

ایک روز میں اُن کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہمارے ایک مشترک [دوست] باریش خان بہادر صاحب اُن کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سامنے چائے کی بھری ہوئی پیالی رکھی ہوئی ہے اور وہ یہ عذر فرما رہے ہیں کہ میں روزے سے ہوں۔ اُن کا عذر سن کر شنکر نے مجھ سے کہا، "جوش صاحب، آپ دیکھ رہے ہیں کہ خان بہادر کے ہونٹ خشک ہیں، آنکھوں کا نور سلب ہو چکا ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں، لیکن اِس کے باوجود یہ چائے سے انکار کر رہے ہیں۔ آپ سمجھے، اِس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے کہا، "یہ دین کی پابندی ہے۔"

اُنھوں نے کہا، "پابندی ایک بہت بڑا عذاب ہوتی ہے اور یہ اُس عذاب کو فقط اِس لیے برداشت کر رہے ہیں کہ اِن بے چارے پر آسمانی لاٹھی چارج ہو چکا ہے۔"

میں ہنسنے لگا۔ خان بہادر نے جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ اِس طرح گردن نیچی کر لی کہ اُن کی عینک ناک

سے پھسل کر چائے کی پیالی میں غوطہ مار گئی اور میں نے قہقہہ مار کر کہا، ''فرعون غرق دریا۔''

ایک بار ہندوؤں کا ایک وفد اُن کے پاس آیا جو ایک ہندو مسلم فساد پھیلانے والے سادھو کو ہاتی پر بٹھا کر چاندنی چوک سے اُس کا جلوس نکالنا چاہتا تھا۔ اُنھوں نے کہا، ''میں اِس جلوس کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' سردار وفد نے کہا، ''حضور، ہاتی اِس قدر سدھا ہوا ہے کہ وہ تاشوں باجوں کی آواز سے ذرا بھی نہیں بھڑکے گا اور سر جھکائے گزر جائے گا۔'' اُنھوں نے کہا، ''مجھے ہاتھی سے کوئی خوف نہیں ہے۔ ہاتی کو تو بہ آسانی قابو میں لایا جا سکتا ہے، لیکن میں تو آدمی سے ڈرتا ہوں، اِس لیے کہ جب آدمی مست ہو جاتا ہے، تو پھر کسی کے قابو میں نہیں آتا اور آدمی کے مست ہو جانے میں دیر نہیں لگتی۔'' اور ارباب وفد منھ لٹکائے رخصت ہو گئے۔

اپریل فول منانے کے لیے ایک روز میں بہت تڑکے اُن کے پاس پہنچا اور بڑے گھبرائے اور سوکھے منھ سے کہا، ''شنکر پرشاد صاحب، بڑا غضب ہو گیا۔''

اُنھوں نے گھبرا کر پوچھا، ''کیا ہوا؟''

میں نے کہا، ''کنور مہندر سنگھ پاگل ہو گئے ہیں۔''

اُنھوں نے کہا، ''بڑا غضب ہو گیا۔''

میں نے کہا،

''ایسا ویسا! اُنھوں نے اپنی داڑھی کے تمام بال اکھاڑ ڈالے ہیں، تمام چہرہ لہولہان ہو رہا ہے۔ گھر والوں نے اُن کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے، اب کیا کیا جائے۔ وہ جس کمرے میں بند ہیں، اُس کی کھڑکیوں کے تمام شیشے توڑ چکے ہیں اور اب سلاخوں پر زور آزمائی کر رہے ہیں۔ کس طرح اُن کو قابو میں لایا جائے۔''

اُنھوں نے بڑی سراسیمگی کے ساتھ پولیس کے انسپکٹر جنرل چودھری کو فون کر کے، سارا ماجرا بتایا اور کہا، ''آپ پولیس کو لے کر فوراً وہاں جائیں، کنور صاحب کو قابو میں لائیں اور مجھ کو فوراً فون سے مطلع کریں۔'' جب وہ فون کر چکے، میں نے کہا، ''اب آپ نہائیں دھوئیں۔ میں کنور صاحب کے پاس جاتا ہوں، وہاں سے آپ کو فون کروں گا۔'' پانچ منٹ کے اندر میں کنور صاحب کے مکان پہنچ گیا۔ اُنھوں نے مجھ کو اپنی خواب گاہ میں بلا لیا۔ وہ ورزش کر رہے تھے، مگدر زمیں پر رکھ کر پوچھا، ''خیریت تو ہے، آپ اس قدر سویرے کیسے آ گئے؟'' میں نے کہا، ''ٹہل کر واپس ہو رہا تھا، جی چاہا، آپ کا دیدار کرتا جاؤں۔'' اُنھوں نے کہا، ''آپ میرے بستر پر آرام سے بیٹھ جائیں، ابھی میری تھوڑی سی ورزش باقی ہے۔'' میرے لیے چائے آ گئی اور وہ ورزش کرنے لگے۔ اِتنے میں بجلی کی گھنٹی بجی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا کہ چودھری صاحب پولیس کے جوانوں کے ساتھ گاڑی سے اتر رہے ہیں، مجھ کو دیکھتے ہی

اُنھوں نے کہا، ''جوش صاحب، کس کمرے میں بند کیا گیا ہے کنور صاحب کو۔''

میں نے کہا، ''اندر کے کمرے میں۔''

اُنھوں نے کہا، ''یہاں تو کوئی شور نہیں ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا، ''کنور صاحب بے ہوش ہو چکے ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ میں اُن کی بیگم کو بلا کے لا تا ہوں۔''

اندر جا کر میں نے کہا، ''کنور صاحب، چودھری آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

اُنھوں نے منہ بنا کر چپکے سے کہا، ''بڑے ناوقت آئے ہیں۔ میں تو ابھی نہایا بھی نہیں ہوں۔ یہ ہر حال، آپ جا کر اُنھیں باتوں میں لگائیے، میں کپڑے پہن کر آتا ہوں۔''

باہر آ کر میں نے کہا، ''چودھری صاحب، بیگم تو موٹر میں بیٹھ کر دماغی ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آنے کے لیے گئی ہوئی ہیں، آتی ہوں گی۔'' چودھری نے مجھ سے کہا، ''وہ بے ہوش پڑے ہوئے ہیں۔ یہ موقع بہت غنیمت ہے، اُن کے ہاتھ پاؤں آسانی کے ساتھ باندھ لیے جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا، ''بہت اچھا، تو پھر چلیے۔'' وہ پولیس والوں کو بلانے کے لیے برآمدے کی طرف چلے گئے اور اتنے میں کنور صاحب باہر نکل آئے، آتے ہی مجھ سے پوچھا، ''کیا چودھری صاحب چلے گئے؟'' میں نے کہا، ''نہیں، برآمدے تک گئے ہیں۔''

کنور صاحب نے برآمدے میں قدم رکھتے ہی یہ دیکھا کہ چودھری صاحب کی پشت اُن کی جانب ہے اور اُن کے سامنے آٹھ دس پولیس والے کھڑے ہوئے ہیں، جنھیں وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھا رہے ہیں۔ کنور صاحب دنگ ہو کر وہ سماں دیکھنے لگے اور جیسے ہی پولیس والوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے چودھری مڑے تو پشت پر کنور صاحب کو دیکھ کر اُن کی چیخ نکل گئی۔ کنور صاحب نے حیران ہو کر دریافت کیا ''چودھری صاحب! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے۔''

چودھری نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا، ''کنور صاحب، آپ کیسے ہیں؟''

اُنھوں نے کہا، ''میں تو اچھا ہوں، لیکن آپ اپنا حال بتائیں۔''

چودھری صاحب نے کہا، ''ارے!''

کنور صاحب نے کہا، ''ارے!''

اِس 'ارے، ارے' کی تکرار پر میرا قہقہہ نکل گیا۔ برآمدے میں آ کر میں نے کہا، ''کنور صاحب اور چودھری صاحب، آپ دونوں ڈرائنگ روم میں آ جائیں، ابھی حال کھل جائے گا۔'' دونوں آ گئے۔ چودھری مجھے آنکھ مار کر دور کے سوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے شنکر پرشاد صاحب کو فون کیا کہ آپ اِس وقت کنور صاحب کے مکان آ جائیں۔ کنور صاحب نے کہا، ''جوش صاحب، آخر کچھ تو بتائیے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ چودھری

صاحب مجھ سے دور بیٹھے مجھے گھور رہے ہیں، باہر پولیس کے جوان کھڑے ہوئے ہیں، آپ چیف کمشنر صاحب کو یہاں بلا رہے ہیں: یہ سب کچھ ہو کیا رہا ہے؟"

میں نے کہا، "کنور صاحب، شنکر پرشاد صاحب کے آتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔"

کنور "ابھی آتا ہوں" کہہ کر اندر چلے گئے۔ اِتنے میں شنکر پرشاد آ گئے۔ چودھری سے گھبرا کر پوچھا، "کہیے، آپ نے کیا کیا؟" اِتنے میں کنور باہر آ گئے۔ شنکر پرشاد صاحب نے اُنھیں دیکھتے ہی بڑے زور سے کہا، "ارے!"

کنور صاحب نے پھٹی آنکھوں اور کھلے منھ کے ساتھ پوچھا، "ارے یہ کیا!"

چودھری صاحب نے کہا، "ارے!"

شنکر پرشاد صاحب نے کہا، "ارے!"

آخرکار کہاں تک میں ضبط کرتا، ایک اُڑا ٹے دار، گھن گرج قہقہہ میرے منھ سے بم کے گولے کی طرح نکلا اور فضا پر بلند ہو کر پھٹ گیا اور تمام حاضرین ہل کر رہ گئے اور میں نے تالی بجا کر کہا،

"یارو، اپریل فول مبارک! اپریل فول مبارک!— اپریل فول مبارک!"

اور پھر تو شنکر پرشاد اور چودھری کا یہ عالم ہو گیا، گویا ہنستے ہنستے اُن کا دم نکل جائے گا اور کنور صاحب کو چوں کہ کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے، وہ انتہائی حیرت کے ساتھ ہم سب کو دیکھنے لگے اور جب ہنسی کا دَونگڑا پڑ چکا تو شنکر پرشاد صاحب نے مجھ سے کہا، "کمال کر دیا آپ نے جوش صاحب! کچھ اِس ادا سے آپ نے کہا کہ کنور صاحب پاگل ہو گئے ہیں، اُنھوں نے اپنی داڑھی کا ایک ایک بال اکھاڑ ڈالا ہے اور اُن کا تمام چہرہ لہولہان ہو رہا ہے کہ مجھے یقین آ گیا اور چودھری صاحب کو فوراً یہاں بھیج دیا۔ اِس کا خیال بھی نہیں آیا کہ آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے۔" کنور صاحب نے جب یہ سنا تو اُنھوں نے پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیا اور اُن کے ہنسنے پر ہم سب پھر ہنسنے لگے۔

ایک روز میری اور فراقؔ کی موجودگی میں اُن کے ایک بہت پرانے دوست، جو ہندی کے مشہور شاعر ہیں، اُن سے ملنے آئے، باتوں باتوں میں اُنھوں نے فرمائش کی کہ کچھ سنائیے اور جب وہ اپنا کلام سنا چکے تو اُنھوں نے مسکرا کر کہا، "ابھی جوشؔ صاحب اور فراقؔ صاحب اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے تو شاعری کا مزا آ رہا تھا، لیکن جب آپ نے اپنا کلام شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ زبردست بلوا ہو رہا ہے۔"

❁

سیّد محمد عسکری

مضافاتِ اودھ کے باشندے، بھوپال کے ایڈووکیٹ، عقائد میں پختہ، اعمال میں خام، شاعری کے قدرداں، موسیقی کے شیدائی، شیعہ سنّی مباحثے پر ہمہ وقت طیار، گاہ گاہ کے بادہ خوار، لیکن پینے پر آئیں تو کیا اندک اور کیا بسیار، میر انیس کے حافظ و پرستار اور موڈ آجائے تو مرثیہ خوانی میں یکتائے روزگار۔ اور قیصرِ جرمنی کی سی رعب دار مونچھیں رکھنے والے، لانبے تڑانگے، کھلے رنگ کے گندم فام، خوش مزاج اور خوب رُو انسان تھے۔ دہلی کا واقعہ ہے۔ ایک بار وہ میرے دفتر میں بیٹھے تھے۔ عرشؔ ملسیانی نے کہا، ''عسکری صاحب، ذرا میر صاحب کا کلام تو سنا دیجیے۔''

اُنھوں نے کہا، ''اِس وقت موڈ نہیں ہے۔''

اور جب اُنھوں نے بار بار اصرار اور اُنھوں نے بار بار انکار کیا تو عرشؔ نے میرے کان میں کہا، ''دیکھیے، ابھی ایک چٹکلا چھوڑتا ہوں، فوراً سنانے لگیں گے۔''

اور مجھ سے یہ کہہ کر عرشؔ کھڑے ہو گئے اور بڑے ولولے کے ساتھ کہنے لگے، ''جوشؔ صاحب، مولانا شبلی بہت بڑے شاعر، ادیب، نقاد اور مؤرّخ تھے اور 'الفاروق' لکھ کر تو بس اُنھوں نے قلم ہی توڑ دیا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ وہ بھنّا کر کھڑے ہو گئے اور میز پر زور سے گھونسا مار کر اور انگشتِ شہادت کو بلند کر کے اُنھوں نے کہا: Shutup, Shibli was a great literary fraud. (''بکواس بند کرو، شبلی ایک بہت بڑا ادبی فریب کار تھا۔'') اُس شخص کو آلِ رسول سے دشمنی اور اُن کے دشمنوں سے محبت تھی۔ جوشؔ صاحب، میں آپ سے کہتا ہوں، خوارج ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں، لیکن آلِ رسول کا نام مٹا نہیں سکے۔ اُن کے نام قیامت تک باقی رہیں گے۔ لیجیے، آلِ رسول کی شان میں میر صاحب کے چند بند سنیے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے بڑے ولولے کے ساتھ اُن کا کلام سنانا شروع کر دیا اور عرشؔ، عسکری صاحب کو زور زور داد

دینے اور میری طرف آنکھ مار کر مجھ سے اپنی چالاکی کی داد لینے لگے۔...........................

............................میں جب بمبئی میں تھا، وہ اپنے بیٹے کو 'ہم وار' کرنے بمبئی آئے تھے، اُن کا بیٹا کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہو کر وہاں کی مرکزی پارٹی کے ممبروں کے ساتھ کام کرنے بمبئی آ گیا تھا اور وہ نہایت بے چین تھے اُس کو واپس لے جانے کے لیے۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا، "جوش صاحب، آپ بھتیجے کو سمجھائیں کہ وہ اِن خرافات باتوں کو ترک کر کے میرے ساتھ بھوپال چلے چلے۔"

میں نے کہا، "میں اُس سے یہ کیونکر کہوں کہ وہ راہِ راست پر آ جانے کے بعد پھر کج روی اختیار کر لے۔" اُنھوں نے بڑی تلخی آمیز حیرت سے کہا، "اچھا تو آپ بھی؟" میں نے بڑے جھٹکے سے کہا، "جی ہاں! 'ایں ہم بچۂ شتراست' کا معاملہ ہے۔" اُنھوں نے کہا، "یہ تو وہی ہوا کہ:

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کم بخت ترا چاہنے والا نکلا۔"

میں نے کہا، "اور مجھ سے پوچھیے تو میں یہ کہوں گا کہ اپنے فرزند کے باب میں آپ کا مجھ سے یہ ارشاد فرمانا کہ میں اُس کو یہ سمجھاؤں کہ وہ اِن خرافات باتوں کو ترک کر دے، مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا کسی یہودی کا بیٹا مسلمان ہو گیا ہے اور اُس کا باپ کسی شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ درخواست کر رہا ہے کہ حضور اُس کو سمجھا دیں کہ وہ دوبارہ یہودی ہو جائے۔"

اُنھوں نے کہا، "چلیے، میں نے مان لیا کہ کمیونزم بہت اچھی چیز ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر نیا آئین، خوں ریزی کی منزلوں سے گزر کر پروان چڑھتا ہے اور ہر نئے آئین کے لانے والوں میں بہت سے لوگ موت کے گھاٹ بھی اتار دیے جاتے ہیں۔ آپ بھتیجے کو کم سے کم یہ تو سمجھا دیں کہ وہ دل سے کمیونسٹ رہے، لیکن اِس وقت چپ چپاتے میرے ساتھ بھوپال چلا چلے اور جب کمیونزم کی فتح ہو جائے اور کوئی کھٹکا باقی نہ رہے تو وہ پارٹی میں آ کر شریک ہو جائے۔"

میں نے قہقہہ مار کر کہا، "اچھا تو آپ ماشاءاللہ 'دکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں' کی فلاسفی کے پیرو ہیں؟" اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا، "اچھا جوش صاحب، آپ جیتے اور میں ہارا، لِلّٰہ چھوڑیے اِس ذکر کو۔ ایک شیعہ لڑکا دہریہ ہوا جا رہا ہے اور آپ کو پروا نہیں۔" میں نے کہا، "میں تو باعمل دہریے کو بے عمل مومن پر ترجیح دیتا ہوں۔" اور وہ مجھے گھورتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ میرے قہقہے نے اُن کا تعاقب کیا۔ ایک بار جگر، فانی، وصل بلگرامی اور میں، یہ سب لوگ بھوپال گئے اور شملہ کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وقتِ شام اور جام، دونوں گردش میں تھے کہ عسکری صاحب آ گئے۔☆

☆ اس جملے کے بعد سے ڈیڑھ صفحے سے زیادہ حصہ خالی ہے جوش صاحب شاید بعد میں کچھ اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

انتقال سے غالباً ڈیڑھ دو برس پیش تر وہ پاکستان آئے اور اپنی بیٹی ڈاکٹر عالیہ[1] کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ایک شام کو بوتل در بغل پہنچا۔ اُن کے اُس اداس چہرے پر (جس کی شان دار مونچھیں بیوی کے غم میں اُنھوں نے منڈوا ڈالی تھیں) شگفتگی کی دھاریاں دوڑ گئیں اور آدمی بھیج کر اُنھوں نے نیاز فتح پوری کو، جو پڑوس ہی میں رہتے تھے، فوراً بلا لیا — اور نیاز کے آتے ہی دور چلنے لگا۔ دو گلاس خالی کر کے اُن کا جسم جوانی سے بھر گیا۔ وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بڑے مزے کے ساتھ جوانی کی سنی ہوئی ٹھمریاں گانے اور نیاز صاحب سرشار ہو کر تالیاں بجانے اور اُن کے ساتھ بھاؤ بتانے لگے اور میں بھی میز پر طبلہ بجانے لگا اور عالیہ ہم بوڑھوں کی یہ اُٹھتی جوانی دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ (ہائے، اُن کے ساتھ وہ آخری ملاقات تھی۔)

اُور لیجیے، بات میں بات نکل آئی، اِس نوعیت کا ایک واقعہ اُور بھی یاد آ گیا۔ ایک بار حیدرآباد سے لکھنؤ جاتے ہوئے میں نے تار دے کر اُنھیں بھوپال اسٹیشن پر بلایا تھا۔ گاڑی ٹھہرتے ہی وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے اور قلیوں سے کہا، فوراً میرا سامان اتار لیں اور قلیوں کو حکم دے [کر]، اُنھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور گنگنا کر کہنے لگے، "جائیے نہ پیہو، ہمار گھر آئے کے۔" (ہمارے گھر آ کر جانے نہیں پاؤ گے۔)

میں نے کہا، "عسکری صاحب، میں سر آنکھوں سے رک جاتا، لیکن کیا کروں، پرسوں لکھنؤ میں ایک ادبی کانفرنس ہو رہی ہے۔ وعدہ کرتا ہوں کہ واپس آ کر آپ کے وہاں دو تین دن قیام کروں گا۔"

اُنھوں نے کہا، "قسم کھائیے۔"

میں نے پوچھا، "کس کی؟"

اُنھوں نے کہا، "اُس کی، جس کی آپ سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا، "سید محمد عسکری کی قسم کھاتا ہوں کہ واپسی پر آپ کے وہاں ضرور ٹھہروں گا۔"

اُنھوں نے لپک کر میرا ماتھا چوم لیا۔ اِتنے میں گارڈ نے جھنڈی ہلا کر سیٹی بجائی۔ میں نے مزاحاً کہا، "کیوں صاحب! 'آخر کے تئیں، ہنس اکیلا ہی سدھارا' کا معاملہ ہو گا، آپ میرے ساتھ لکھنؤ نہیں چلیں گے!" میرے اِس مذاق کو وہ میری سنجیدہ گزارش سمجھے۔ سامانِ سفر اور ٹکٹ کے بغیر وہ رینگتی گاڑی کی پروانہ

---

[1] عالیہ، ماشاءاللہ، بے حد ذہین ہے، اُس نے اردو میں پی ایچ ڈی کیا ہے، بڑی ہی شگفتہ مزاج ہے، بات بات پر قہقہے مارتی ہے، ہے تو کمیونسٹ، مگر دل کے اندر دین چھپا ہوا ہے۔ وہ روس کا دورہ، اور چین میں، سال ڈیڑھ سال قیام بھی کر چکی ہے، لیکن افسوس کہ اُس نے اس قدر کھلنڈرا مزاج پایا ہے کہ وہ جم کر کوئی کام نہیں کر سکتی، روز انجمنیں بناتی اور انھیں توڑ دیتی ہے۔ اُس کے اِس تلوّن کی بناء پر میں اُس کو "بادِ صبا" اور اُمّ الشعراء "چھلبلی" کہتی ہیں —

کرتے ہوئے دوڑے اور کھٹ سے میرے درجے میں آگئے اور کہا، "لیجیے، آپ بھی کیا یاد کریں گے۔" میں نے "شاباش" کہہ کر اُن کو گلے لگا لیا۔ اور گاڑی تیز ہو گئی اور میرے درجے میں انھیں کی طرح کے جو دو سوٹڈ بوٹڈ 'جنٹلمین' قسم کے مسافر بیٹھے تھے، اُن کے اُس لاابالی پن پر مسکرانے لگے۔
شام کو جب بوتل کھلی، اُنھوں نے اپنا گریبان کھول دیا، کالر اور کوٹ اتار ڈالا اور "یا ساقیٔ کوثر" کا نعرہ لگا کر منھ سے جام لگا لیا اور دوسرے ہی پیگ پر گانا شروع کر دیا: "اندھریا ہے رات، سجن رہیو کہ جیہو؟" (رات اندھیری ہے، اے سجن، رہو گے کہ چلے جاؤ گے؟) گاتے گاتے اُنھوں نے مجھ سے کہا،

"ذرا اِس گیت میں عورت کی خودداری کے تیور تو دیکھیے، وہ اپنے ساجن سے براہِ راست یہ درخواست نہیں کرتی کہ میرے گھر ٹھہر جاؤ' اور 'اندھریا ہے رات' کہہ کر بطورِ کنایہ ایک suggestion دیتی ہے کہ اندھیری رات میں گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ میرے گھر ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے پیمانہ بھرا، دو گھونٹ پیے اور پھر گانے لگے: "آ ہے، اندھریا ہے رات، سجن، رہیو کہ جیہو؟" گاتے گاتے یہ دیکھ کر کہ وہ دونوں ہم سفر 'جنٹلمین' اُن کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، اُنھوں نے میرے کان میں پوچھا، "تمھارے پاس اِس کے علاوہ اور بوتل بھی ہے؟" میں نے جواب دیا، "ہے۔" اُنھوں نے کہا، "اُسے بھی نکال لو، یہ دونوں .... مجھ پر مسکرا رہے ہیں، اِن کو offer (پیش) کر دو، عجب نہیں کہ پینے لگیں اور سالے مسکرانا چھوڑ دیں۔" اور جب وہ دونوں ہم سفر بھی شریک ہو گئے۔ اُنھوں نے بھی ایک ایک پیگ کے بعد اپنے اپنے کالر اور کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیے اور تیسرے پیگ پر وہ بھی 'اندھریا ہے رات' پر تھر کنے لگے اور میں بڑے تال سُر سے تالیاں بجانے لگا۔
وہ بڑی گھنگھور رات تھی، ایک بڑے جنکشن پر گاڑی رک بھی گئی اور ہمیں پتا نہیں چلا۔ عسکری صاحب اُسی طرح "اندھریا ہے رات" گاتے، دونوں ہم سفر پھر کی بے تھرکتے رہے اور میں تڑاتڑ تالیاں بجاتا رہا کہ یکا یک ہمارے درجے کا دروازہ دھڑام سے کھل گیا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک لانبی داڑھی کے مولانا سامان سمیت ہمارے درجے کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں اور ہم سب کا یہ عالم دیکھ کر قلی سے کہہ رہے ہیں، "نہیں نہیں، میں اِس درجے میں سفر نہیں کروں گا، کسی اَور درجے کی طرف لے چلو۔" قلی نے کہا، "تمام سیکن' (سیکنڈ) اور 'فرس' (فرسٹ) کلاس بھرے ہوئے ہیں، کہیں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہے، جلدی کیجیے۔" مولانا نے قلی سے ڈانٹ کر کہا، "گاڑی چھوٹ جانے دو، پروا نہیں، مگر ہم ایسے لوگوں کے ساتھ سفر نہیں کریں گے۔"
اب گاڑی رینگنے لگی اور عسکری صاحب نے کھڑکی سے اپنا ہاتھ نکالا اور جلدی سے اُن کا داڑھا چھو کر کہا،

"سجن رہیو کہ جیو؟" مولانا اچھل گئے —— اور گاڑی تیز ہو گئی۔ ☆

❁

☆ سید محمد عسکری اور ان کی صاحبزادی ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں جوش صاحب کی ایک اور تحریر بھی ہمارے پیش نظر ہے جسے ضمیمے کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔ جوش صاحب کی وفات (۱۹۸۲) کے دس برس بعد ۱۹۹۲ء میں میری کتاب ' جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں' (جلد اوّل) کراچی سے شائع ہوئی۔ اس میں جن شخصیات سے مجھے جوش صاحب کی غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئی تھیں اُن میں راغب مراد آبادی، خورشید علی خاں، شان الحق حقی، ڈاکٹر یاور عباس، نصیر ترابی، مظفر عباس، جوش صاحب کی صاحبزادی سعیدہ خاتون، نواسی صبوحی خاتون، اور نواسے سراج انور خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ غیر مطبوعہ تحریروں میں سید محمد عسکری اور اُن کی صاحبزادی ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں جوش صاحب کی جو دو تحریریں میں نے کتاب میں شامل کی تھیں وہ مجھے نصیر ترابی نے دی تھیں۔ عسکری صاحب کے بارے میں جو تحریر تھی وہ یادوں کی برات کی اشاعت سے پانچ سال پہلے کی تحریر ہے جبکہ عالیہ امام کے بارے میں جوش صاحب کی تحریر یادوں کی برات کی اشاعت کے تین سال بعد کی ہے۔ مطبوعہ مسودے سے ان تحریروں کی مماثلت بتاتی ہے کہ یہ یادوں کی برات ہی کے کسی منسوخ شدہ مسودے کا حصہ ہیں۔

[سید محمد عسکری کے بارے میں]

یہ دیکھیے میرے پرانے دوست عسکری صاحب ہیں یادش بخیر، آج سے تقریباً تیس برس پہلے جب میں پہلی بار اُن سے بھوپال میں ملا تھا، وہ ایک کامیاب ایڈووکیٹ اور ایک خوش رو جوان تھے، رنگ ان کا سرخ و سفید تھا، مونچھیں بڑی بڑی، رعب آفریں و جمال انگیز تھیں۔

عسکری صاحب، موسیقی کے قدر داں اور میر انیس کے پرستاروں میں سے ہیں، حافظے کا یہ عالم ہے کہ میر صاحب کے تمام مرثیے ان کے حافظے میں محفوظ ہیں، اور جس مرثیے کے جس مقام کی فرمائش کیجئے، وہ اسی مقام سے، بے تکلف سنانے لگتے ہیں اور رات کو جب سرخوشی کی موج میں آتے ہیں تو ایسی ایسی ٹھمریاں اور ایسے ایسے دادرے، لہک لہک کر سناتے ہیں کہ تمام فضا رقص کرنے لگتی ہے۔ بیتے ہوئے جشن ہائے رامش و رنگ سامنے آ آ کر سر پیٹنے اور آنسو بہانے لگتے ہیں، اور فضا سے آواز آنے لگتی ہے۔

ہائے جوانی، ہائے زمانے

ان کی بیگم کے انتقال نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ کچھ تو اس بے پناہ غم اور کچھ ماہ و سال کے نقوشِ قدم نے ان کے چہرے اور ان کے دل، دونوں کو بجھا کر رکھ دیا ہے، چہرے کی آب و تاب اُڑ چکی ہے، حسین مونچھیں منڈ چکی ہیں، چلنے پھرنے کا دم نہیں رہا ہے اور آنکھیں جواب دینے کے قریب ہیں۔ صد حیف! روزگار کے ستم پر جس نے ایک خوب رو، انسان کو یوں گم سُم اور نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔ گزشتہ سال جب عسکری صاحب کراچی آئے اور اپنی قابل نازبیٹی

ڈاکٹر عالیہ کے وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میں اُن سے ملنے گیا تھا، فریقین نے جب ایک دوسرے کو اس قدر بوڑھا دیکھا تو دونوں کی آنکھیں بھر آئیں، میری جگر جگر صورت اُن کی آنکھوں اور اُن کی جگمگاتی صورت میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ ہائے وہ عالم، جب دو جوانی کے عالم میں جدا ہونے والے، بڑھاپے کے دور میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ اب دو ایک چھوٹے موٹے لطیفے بھی سن لیجئے۔

جاں نثار اختر نے، ترقی پسندوں کا ایک مشاعرہ بھوپال میں کیا تھا۔ اور اُس مشاعرے میں مجھ کو پکڑنے کے واسطے انہوں نے عسکری صاحب کو میرے پاس لکھنؤ بھیجا تھا، عسکری صاحب سے میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ کل صبح کی گاڑی سے ان کے ہم راہ چلوں گا۔ چنانچہ حسب وعدہ میں اُن کے ساتھ چار باغ اسٹیشن پہنچ گیا۔ ٹکٹ خرید لئے گئے، ہم دونوں اپنے درجے میں جا کر بیٹھ گئے، لیکن ایک دَم میں میرا موڈ بدل گیا، دل سے آواز آئی "جوش بھاگ کھڑا ہو" یہ کیفیت پیدا ہوتے ہی میں ریل کی آخری سیٹی کا انتظار کرنے لگا۔ اور جیسے ہی آخری سیٹی کے ساتھ ریل حرکت میں آئی۔ میں دروازہ کھول کر کود پڑا، لیکن اس طرّاری کے ساتھ کہ عسکری صاحب کو اس سانحے کا پتا نہیں چلا۔

عسکری صاحب کو تھوڑی ہی دیر میں پتا چل گیا کہ میں غائب ہو گیا ہوں، لیکن ڈاک گاڑی تھی، بیچ میں وہ کہیں اتر ہی نہیں سکے، جب کانپور اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو اُترے، انجن سے گارڈ کے درجے تک مجھے تلاش کیا اور جب میں نہیں ملا تو کان پور سے، دوسری گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے لکھنؤ آئے اور میرا سامنا ہوتے ہی مجھ پر برس پڑے، اور گرفتار کر کے کان پور لے گئے۔

ایک بار میں حیدر آباد دکن سے لکھنؤ جا رہا تھا، عسکری صاحب کو تار دیا کہ بھوپال اسٹیشن پر مل جائیں۔ وہ پلیٹ فارم پر ملے، ہم آغوش ہوئے، مجھ سے وعدہ لیا کہ واپسی میں دو روز کے واسطے بھوپال میں ضرور قیام کروں گا۔ اتنے میں گاڑی رینگنے لگی، میں نے کہا "پیارے کیا میرے ساتھ لکھنؤ نہیں چلو گے، انہوں نے کہا ضرور چلوں گا اور جھپٹ کر میرے ڈبے میں آ گئے، نہ کپڑے تھے، نہ بستر، لیکن انہوں نے پرواہ نہیں کی، اور شام ہوتے ہی ایسی ایسی ٹھمریاں سنانا شروع کر دیں کہ میرے تمام رفقائے سفر جھومنے لگے۔

ایک بار جب کہ میں بمبئی میں رہتا تھا، دیکھتا ہوں کہ عسکری صاحب پریشان صورت بنائے میرے سامنے کھڑے ہیں، اُن کے چہرے کی دہشت دیکھ کر میں معانقہ بھول گیا۔ اور پوچھنے لگا معاملہ کیا ہے، کہنے لگے میرا بیٹا کمیونسٹ ہو گیا تھا، اس لیے آیا ہوں کہ اس کو پکڑ کر بھوپال لے جاؤں، میں نے زور سے قہقہہ لگایا تو بگڑ گئے "کیوں صاحب آپ کے لڑکے کو صراطِ مستقیم مل گیا ہے اور آپ آئے ہیں اُس کو گم راہ کرنے۔ ابوجہل کا بیٹا اگر مسلمان ہو جاتا تو اس کو بھی ایسا ہی غصہ آتا۔ میری باتیں سن کر عسکری صاحب ہنسنے لگے، اور پھر سنجیدہ ہو کر انہوں نے کہا میں بھی اشتراکیت کو پسند کرتا ہوں، لیکن ہر تحریک کے آغاز میں لوگوں کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں، میرا بیٹا قربانی کا بکرا کیوں بنے، جب اشتراکیت کو فتح حاصل ہو جائے اُس وقت وہ اس میں شامل ہو جائے۔

میں نے کہا، کیوں صاحب آپ کا پُوت تو پُوت ہے، اور دوسروں کے پُوت پنگو ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ قہقہے مار کر مجھ سے لپٹ گئے اور گانے لگے۔ اندھریا ہے رات، بجن بچھو کر رہیو، اری اندھریا ہے رات'' ۲۱-۲-۶۵.....کراچی

[ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں]

''.....ڈاکٹر عالیہ امام، ماشاء اللہ، قبول صورت بھی ہیں، اور قبول سیرت بھی، ان کے والد محترم سید عسکری صاحب، میرے بے حد محبوب دوست، اور نہایت سخن سنج انسان تھے۔ اُن کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ میر انیس کا تمام کلام، اُن کے ذہن میں اس قدر مستحضر تھا کہ، جس مقام سے بھی فرمائش کر دیجئے، وہیں سے وہ سنانے لگتے تھے، اور پڑھنے کے انداز کا یہ عالم تھا کہ چشم و ابرو سے، معانی کی تصویر بن جایا کرتے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ، موسیقی پر اُن کو اس قدر عبور حاصل تھا کہ جب بھی، عالم سرخوشی میں، وہ ٹھمریاں اور دادرے گانے لگتے تھے، تو میرے عنفوانِ شباب کا لکھنؤ، آنکھوں کے نیچے پھرنے لگتا تھا۔ ہائے کہاں ہیں اب ایسے لوگ۔

وے صورتیں الٰہی، کس دیس، بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو، آنکھیں ترستیاں ہیں

عالیہ بی بی نے باپ کی ذکاوت و ذہانت ورثے میں پائی ہے۔ اور اسی کے دوش بدوش وہ سیاست میں بھی گہری نظر رکھتی ہیں اور اسی ذوقِ سیاست کی وجہ سے وہ چین و روس کا دورہ کر آئی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی دولت، ان کی خطابت ہے۔ سرو حق نائیڈو کے بعد، اگر کہیں نظر پڑتی ہے تو ان کے اندازِ خطابت پر، وہ جب بولتی ہیں تو ان کا لب ولہجہ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔
اُن میں خوش مزاجی کا جوہر بھی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ باتیں کرنے پر آتی ہیں تو کھلکھلتے قہقہے برساتی ہیں، اور قہقہوں سے شہد کی بوندیں ٹپکاتی ہیں۔ ان کے مزاج کی یہ خصوصیت بھی نہایت قابلِ قدر ہے کہ جب وہ کوئی شاعرانہ بات سُنتی ہیں، اس کو لکھ کر، محفوظ کر لیتی ہیں ان کو ہر ذہین مرد اور عورت کی طرح اُمورِ خانہ داری سے کوئی دور کا بھی شغف نہیں ہے، اور اس لیے ان کے شوہر میاں کاظم امام کا منہ پھولا رہتا ہے۔

وہ مستقل مزاجی اور تلون، دونوں کا مجموعہ ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے، نامساعد حالات کے باوجود ایم اے کر کے، پی ایچ ڈی کی سند، بڑے استقلال کے ساتھ، حاصل کر لی، اور دوسری طرف تلون کا یہ عالم ہے کہ روز نئی نئی ادبی اسکیمیں بناتی ہیں۔ اور نئی نئی انجمنوں طرح ڈالتی رہتی ہیں مگر کسی کو بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچاتیں۔ یعنی وہ قطب بھی ہیں باد صبا بھی اور یہی مجموعیت اُن کی ذہانت کی دلیل ہے۔ ان کو، میں نے تقریر کی شاہزادی کہا تھا اور اب بلبلِ پاکستان کا خطاب دیتا ہوں۔''☆ جوش:.....۲۳-۲-۷۳

☆ ___ جوش صاحب سے ڈاکٹر عالیہ امام کی وابستگی محض کسی سرسری وقتی جذباتی عقیدت کا اظہار نہیں ہے اس میں ذہنی اور فکری تعلق کا دخل زیادہ ہے۔ جس کا ایک مظہر اُن کی کتاب 'شاعرِ انقلاب نظریاتی و تنقیدی مطالعہ' بھی ہے۔

سیّدابوالخیر، مودودی

ذی علم، قلیل البحث، کثیر المطالعہ، سخن فہم، نفاست پسند، زود رنج، بالغ نظر۔ نفرتِ تالیف و تصنیف سے بھُور، ذوقِ نشر و طباعت سے دور۔ قائم اللّیل، [1] نائم النہار، غروب نواز، طلوع بیزار، مثلِ عروساں، نازک رفتار، مانندِ سازشیاں، آہستہ گفتار۔ جوانی میں، ورایت بدوشِ تفکّر کے غازی، بڑھاپے [میں] روایت درآغوش نمازی۔

ایسے دبلے پتلے عطر میں بسے ہوئے، نازک بدن کہ جب مشقِ خرام فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی کامنی، سر پر بھری گاگر اٹھائے، پنگھٹ سے، گاتی آ رہی ہے:

"موری پتلی کمریا ہائے۔ ساجن دوہری ہو ہو جائے"

حیدرآباد میں میرے رفیقِ دارالترجمہ، اور عربی کے مترجم تھے، ہر روز ملاقات ہوتی تھی اور تقریباً ہر رات کو وہ میری صحبت میں بیٹھتے تھے، مگر شراب کو کبھی منھ نہیں لگایا، البتہ ایک حسینہ پر مرمٹے تھے، جس کی تصویر آج تک اُن کے پاس ہے۔ ایک رات کو، جب حیدرآباد سے، یاد نہیں کیوں، میری گاڑی میں، اپنی محبوبہ کو بٹھا کر، وہ تیرہ میل باہر گئے تھے، اور دس بارہ شوالوں کے حلقے میں پہنچ کر جب گاڑی رو کی گئی تھی تو، شوالوں کے بدگمان پجاریوں نے، کان کھڑے کر کر کے، ہم کو گھورنا شروع کر دیا تھا اور وہاں سے گاڑی اسٹارٹ کر کے جب ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے تو آگے چل کر گاڑی خراب ہو گئی تھی [2] اور، میں، اُس اندھیری رات میں، تیرہ میل پیدل چل کر، حیدرآباد سے، دوسری گاڑی لایا تھا۔

حیدرآباد میں جب طاعون چلا تھا، میں مودودی کے مکان میں اُٹھ آیا تھا، اُس زمانے میں اُن کے چھوٹے بھائی سیّد ابوالاعلیٰ، امیرِ جماعتِ اسلامی اُنھیں کے پاس رہتے، اور اُنھیں کے سہارے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس وقت اُن کے منھ پر داڑھی نہیں تھی۔ داڑھی تو بڑی چیز ہے، وہ مونچھیں تک منڈاتے، اور، ایک

---

[1] رات بھر لکھتے پڑھتے، اور تقریباً دوپہر تک سوتے ہیں۔

[2] ملاحظہ فرمایئے میری نظم:

توڑ ڈالی تھی سواری ہم رہانِ خام نے
اور تیرہ میل کا پیدل سفر تھا سامنے

نارمل انسان کے مانند ہنستے بولتے اور ہماری تفریحوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور آج وہ دونوں بھائی لاہور میں ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب ہی رہتے ہیں۔ چھوٹے بھائی ابوالاعلیٰ مودودی، ایک کوٹھی میں ہیں اور فارغ البال ☆، اور، بڑے بھائی ابوالخیر صاحب ایک کھنڈر میں ہیں، اور خستہ حال:

یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے!

وہ (ابوالخیر) پہلے متشکک اور نماز روزے کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب، بڑھاپے میں جب کہ دماغ اور جسم دونوں پر ضعف طاری ہو گیا ہے، آبائی اثرات نے اُنھیں دبوچ لیا ہے۔ تشکک سے یقین کی جانب آنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور نماز شروع کر دی ہے، مگر پانچوں وقت کے عوض ابھی صرف ایک مغرب کی نماز پڑھتے ہیں۔ میرؔ یہ شعر شاید اُنھیں کے واسطے کہہ گئے ہیں:

دَیر سے اٹھ کے، کعبے آیا میرؔ
جس کو چاہے، خدا خراب کرے

☆ ___ حکیم محمود احمد برکاتی صاحب نے اپنے مضمون 'چند مہکتی یادوں کے ساتھ' میں اپنی یادیں سمیٹتے ہوئے لکھا ہے کہ ___ ''جوش صاحب سے مولانا مودودی کے روابط حیدرآباد دکن میں قیام کے زمانے سے تھے۔ مولانا کے برادر بزرگ مولانا سید ابوالخیر مودودی (م: اگست ۱۹۷۹ء) اور جوش صاحب ایک ہی مکان میں کچھ عرصے تک رہے تھے۔ لکڑی کے پُل (محلّہ) میں مکان کے اوپر کے حصے میں جوش صاحب اور نیچے ابوالخیر صاحب رہتے تھے۔ جوش صاحب کا جب ریاست حیدرآباد سے اخراج ہوا تو ان ریاستوں میں جو ماحول ہوتا تھا اس کے پیشِ نظر ان کے احباب تو ایک طرف، قریب ترین اعزہ بھی اُن سے ملنے اور تعلق ظاہر کرنے سے کتراتے تھے۔ مگر جیسا کہ خود جوش صاحب نے یادوں کی برات میں لکھا ہے کہ انہیں اسٹیشن پر رخصت کرنے صرف مودودی برادران آئے تھے اس کے بعد برسوں دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی۔

مولانا مودودی پاکستان میں تھے اور جوش صاحب بھارت میں۔ پھر جب جوش اپنے دوست جواہر لال نہرو اور ''نئے بھارت'' سے مایوس ہو کر پاکستان آ گئے اور کراچی میں طرحِ اقامت ڈالی تو ایک دن مولانا مودودی سے ملاقات ہو گئی۔ مولانا کراچی تشریف لائے ہوئے تھے اور پیر الٰہی بخش کالونی میں شیخ سلطان احمد صاحب لکھنؤ والے کے ہاں مقیم تھے۔ جوش صاحب پتہ حاصل کر کے ایک دوپہر وہاں پہنچ گئے۔ پروفیسر حبیب اللہ رُشدی (م: ۱۹۶۹ء) جوش صاحب کے ساتھ تھے۔ رُشدی صاحب کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا وہ وہاں پر صفِ اوّل کے صحافی تھے روزنامہ نظام گزٹ انھی نے جاری کیا تھا اور تقسیم کے بعد کراچی میں مقیم تھے۔ حبیب اللہ رُشدی صاحب اور جوش صاحب سلطان صاحب کے ہاں پہنچے۔ جب جوش صاحب کو بتایا گیا کہ مولانا مودودی کھانے اور نمازِ ظہر سے فراغت کے بعد آرام کر رہے ہیں، تو جوش نے اصرار کر کے معلوم کیا کہ مولانا کس کمرے میں سو رہے ہیں اور پھر بے تکلفی سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا تو ہانک لگائی ''عوام کو جگا کر علما سو گئے'' مولانا نے خوشدلی سے جوش کا استقبال کیا اور دیر تک یہ مجلس گرم رہی (ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۳ء، ص: ۲۱۸)

وِدّیا شنکر، آئی، سی، اِس

سانولے سلونے، بھرے بھرے گالوں کے، بالا بلند اور خوب صورت انسان ہیں۔ اودھ کے باشی، فارسی و اردو کے ماہر، ظرافت میں یکتائے روزگار، قیامت کے ذہین، اور، بغیر طیاری ایسی رواں دواں اور شگفتہ و شیریں تقریر کرنے والے کہ سامعین پر جادو کر دیا کرتے ہیں۔
وہ سردار پٹیل کی مونچھ کا بال اور نہرو، اور پٹیل کے بعد، پورے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ اور اگر وہ پٹیل کے منھ میں، لگام نہ لگا دیتے، تو ہند کے مسلمانوں کو روند کر رکھ دیا جاتا۔
میں ذاتی طور پر اُن کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے میری دھول پور کی ننھیالی جاگیر واپس کرانے میں میری امداد کی تھی، اور تا فیصلہ، اُس جاگیر سے میرے پان سَو ماہانہ مقرّر کرا دیے تھے اور اگر پٹیل اور قدوائی صاحب کا انتقال نہ ہو جاتا تو وہ میری جاگیر مجھے ضرور واپس دلا دیتے۔
پٹیل صاحب اُن کی ساری زندگی پٹیل چکے تھے اور اُن کے عہد میں اُنھیں سانس لینے، حتّٰی کہ اپنے بچّوں تک سے بات کرنے کی بھی فرصت میسّر نہیں تھی، اُن کے بعد، فرصت ملی تو وہ، ہماری شبینہ صحبتوں میں شریک ہونے لگے۔
میرے دہلی کے اثنائے قیام میں ہم تمام رندانِ خرابات، یعنی کنور مہندر سنگھ، شنکر پرشاد، چودھری رگھو ونندر سنگھ، پریم نرائن، مس شاما، ساحر ہوشیارپوری، بسمل ٹونکی، وِدّیا شنکر، اور، حد سے زیادہ موٹے تازے سردار مہربان سنگھ، دھوپیا، جن کا خطاب ہے: His heavyman (آں جناب، فربہی مآب)۔ مہر ولی کی ایک، وسیع و چمن درآغوش کوٹھی میں، ہر ہفتے، شام ہوتے ہی، جمع ہو جایا کرتے، سب سے پہلے، پکّے اشنان تال میں پیرا کرتے تھے۔ ہمارے پیرنے کی شان یہ ہوتی تھی کہ تالاب کے کنارے ہم سب کے بھرے گلاس چن دیے جاتے تھے، اور اُن میں سے ہم لوگ دو دو گھونٹ پی پی کر پیرا کرتے اور مس شاما کو اُن کے شیدائی پریم نرائن، اپنے ہاتوں پر تراتے ہوئے، ہماری صفوں سے گزرتے اور ہم اُن کے گیتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اُس کے بعد کوٹھی میں بڑے دھوم دھڑکے سے مُجرا اور مُجرا ہوتا، کھانا کھایا جاتا، اور شاعری کا دور چلا کرتا تھا۔

اُس اثنائے رامش و رنگ۔ ردو بربط و چنگ میں اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وِدّیا شنکر بڑے زنّاٹے سے مس شاما پر عاشق ہو گئے اور شادی پر تُل گئے۔ اُن کی بیوی کی رسائی جواہر لال تک تھی۔ جب اُنھوں نے یہ بات سنی، اپنے میاں کی، جا کر شکایت کر دی۔ (عاشق ہو جانا بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اُس کی شکایت کی جائے!) جواہر نے مجھے بلا کر کہا کہ "وِدّیا شنکر سے جا کر کہہ دیجیے کہ وہ شاما سے شادی نہ کریں، ورنہ اچھا نہیں ہوگا"۔ میں نے اُن کو جا کر وہ پیام دیا اور اپنے طور پر بھی سمجھایا کہ شادی کر کے وہ اپنی اور خود اپنے عشق کی بھی مٹی پلید نہ کریں، لیکن وہ نہیں مانے، اُنھوں نے کہا، "کوئی پروا نہیں، نوکری چھوٹتی ہے تو چھوٹ جائے، مگر میں شاما کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

اور جب آخر کار اُنھوں نے شاما سے شادی کر لی، جواہر نے بطورِ سزا اُن کو بمبئی منتقل کر دیا اور ہماری صحبت کا ایک بہت بڑا رکن ہاتھ سے نکل گیا۔ اُن کے اُس بن باس سے بالعموم سب کو، اور، بالخصوص مجھ کو بے حد صدمہ ہوا اور معشوقہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد پریم نرائن کے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ایک طرف وِدّیا شنکر کی مفارقت کا داغ، دوسری طرف پریم نرائن کی سراسیمگی، میرے پہلوؤں میں، دونوں طرف آگ جلنے لگی۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد، ایک پارٹی میں جواہر لال نے مجھ سے کہا، "دیکھا آپ نے شنکر کا انجام!" میں نے کہا، "پنڈت جی، ایک عاشق پر ستم ڈھا کر آپ مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ میں آپ کو اِس گؤ ہتیا کی داد دوں گا! خدا کے لیے اُن کو دہلی بلا بھیجیے، ہماری صحبت اُن کے بغیر سُونی ہو کر رہ گئی ہے۔" اور اُس کے چند روز بعد ہی جواہر لال نے اُن کو دہلی بلا لیا اور ہمارے دلوں کے طاقوں میں، گھی کے چراغ جلنے لگے۔

لیکن اب کی ۱۹۶۷ء میں جب میں دہلی گیا تو اُن کو ایک بدلا ہوا آدمی پایا۔ اب اِس کی تفصیل کیا کروں؛ ایک پرانے دوست کی شکایت کو جی نہیں چاہتا۔

کشن لال

بڑے موٹے تازے، گنبد شکم، قبول صورت، پستہ قامت، کوتاہ گردن، اور دراز تجارت آدمی اور میرے بے حد بے تکلف پرانے دوست ہیں۔ دوست بھی کیسے کہ میں اُن کے خاندان کے ایک خاص رکن کی صورت سے، اُن کے گھریلو جھگڑے چکایا کرتا تھا، اور جب بھی پاکستان سے ہندوستان جاتا، اپنے گھر کی طرح، اُن کے گھر ٹھہرا کرتا تھا۔ اور میں نے اُنھیں کے گھر میں پنڈت جی کو مدعو کیا تھا۔
لیکن اب، جب کہ جواہر لال کا انتقال ہو چکا ہے، جن سنگھی حکومت بر سر اقتدار آ چکی ہے، اور، میرے ذریعے سے، وہ دہلی کے حکام بالا تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اپنی سیکڑوں تجارتی گتھیاں سلجھوا کر، مطمئن ہو چکے ہیں، اُنھوں نے، وِدّیا شنکر صاحب کے مانند، مجھ سے نظریں پھیر لی ہیں۔ اُن کی بیوی ' کمو' کی آنکھوں میں تو محبت و مروّت کی جھلک اب تک باقی ہے، لیکن اُن [کشن لال] کی آنکھیں بالکل سپاٹ ہو کر رہ گئی ہیں، اور محبت تو در کنار، اُن میں شناسائی کی چھینٹ تک باقی نہیں رہی ہے۔

پھری ہیں، کل سے، نگاہیں، وہ ہیل میل نہیں
میں دیکھتا ہوں کہ اب اِن تِلوں میں تیل نہیں

اعجاز الحق، قدوسی

دبتا قد، ابھرتی ذہانت، بجھا بجھا سا چہرے کا رنگ، اندر اندر، شعلہ رُویوں کے دیدار کی امنگ۔ صاحبِ تصنیف و تالیف۔ عربی و فارسی پر عبور۔ خاندانِ مشائخ کے رکن ہونے کی، چہرے پر، گھٹن، عناصرِ ترکیبی میں رندی کی لگن، ہر چند عقائد کی خامیوں پر نگاہ، ماحول کے دباو سے لب پر "اللہ اللہ" لیکن دل میں بتوں کی چاہ، صوم و صلوٰۃ گاہ گاہ، سر میں، ہمہ وقت سودائے گناہ، بظاہر مولانا، بباطن مستانہ۔ کردہ گناہوں کے سروں پر، تقوے کی دُلائی، ناکردہ گناہوں کی داد کے تمنائی۔ پیشِ نظر، حور و غلماں کے لذات، الجھی داڑھی، سلجھے خیالات۔ میرے زمانۂ دکن کے بہت ہی پرانے، خلوت و جلوت کے، رفیق، اوپر سے جامد، اندر سے رقیق۔

جگمگاتے ساغروں کی گردشیں دیکھ دیکھ کر، اُن کی آنکھیں چلایا کرتی تھیں کہ ہم بھی کاش پیتے، اور رندوں کے مانند جیتے۔ اُنھوں نے میری لیلائی نظموں کا ایک مجموعہ "شاعر کی راتیں" ☆ چھپوا کر اپنے مجلۂ آرزو کو، اپنی دلھن کے مکھڑے سے روشن کیا تھا، اور شبِ عروسی کی صبح نے اُن کے چہرے پر جو گل کاریاں کی تھیں، آج تک میں اُس رنگینی کو بھلا نہیں سکا ہوں۔ ہائے، کیا زمانہ تھا۔

وہ شاعر بھی ہیں، لیکن اُن کی غزلیں مجذوب کی بڑ نہیں ہوتیں، اُن میں حافظ کی غزلوں کا سا تسلسل پایا جاتا ہے۔ مجھ کو اُن پر بڑا ترس آتا ہے، وہ عقائد کے پول سے بخوبی واقف ہیں، مگر بول نہیں سکتے، بولیں تو بھوچن چھن جائے، بیوی طلاق لے لے اور شہر میں نکو بن کر رہ جائیں۔

☆ جوش صاحب کے تمام شعری مجموعوں میں 'شاعر کی راتیں' اُن کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے اُن کی زندگی ہی میں کسی دوسرے شخص نے ترتیب دیا۔ جوش صاحب نے اپنے دوست اعجاز الحق قدوسی کی درخواست پر اپنی بیاضوں کی اٹیچی ان کے سپرد کر دی تھی، قدوسی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: ___ میں اس اٹیچی کو گھر لے آیا رات کو میں نے ان تمام بیاضوں کا جائزہ لیا رات کے متعلق جس قدر نظمیں، رُباعیاں اور قطعات ملے انھیں ایک خاص ترتیب سے نقل کیا بعض نظمیں جو کسی دوسرے عنوان کے تحت تھیں اُن عنوانوں کو بدل کر اپنے موضوع کے مطابق بنایا پھر اس پر ایک چھوٹا سا مقدمہ لکھا اس مجموعے کا نام 'شاعر کی راتیں' رکھا۔ یہ مجموعہ غالباً ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ شائع ہوتے ہی پورے ہندستان میں اس کی دھوم مچ گئی ہر طرف سے اس کی مانگ تھی۔ تین چار مہینے میں اس کا یہ ایڈیشن چٹنی ہو گیا ___ ' (مضمون، ریش اور رندی کا رشتہ، اعجاز الحق قدوسی۔ مشمولہ: افکار جوش نمبر، اکتوبر نومبر ۱۹۶۱ء، ص: ۲۰۵)

محمد زکریا، مائل

یہ حضرت مولانا قدّوسی کے قطعی برعکس ہیں۔ یہ داڑھی منڈاتے ہیں، وہ داڑھی رکھتے ہیں، وہ، اپنے کو طعنِ حریفاں سے بچانے کے لیے، گاہ گاہ نماز پڑھ لیتے ہیں، یہ آتشِ دوزخ سے بچنے کی تمنا میں، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ اُن کو، جادۂ عقائد میں کھانچے نظر آتے ہیں، یہ اُن کھانچوں کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ گوشت پوست کے حسینوں پر نظمیں کہتے ہیں۔ یہ حمد و نعت پر طبع آزمائی کرتے اور احادیث کے منظوم ترجمے فرماتے ہیں۔ اُن کے رُو بہ رُو بوتل کھلتی ہے، وہ بشاش ہو جاتے ہیں، ان کے سامنے بوتل کھلتی ہے تو دہل جاتے ہیں۔ وہ، بازارِ حسن کی سیر کے تمنائی ہیں، یہ خیالی حوروں کے تماشائی ہیں۔ اُن کا شباب ذاتی تھا، اِن کا شباب، بیوی، کے جہیز میں آیا تھا۔ اور جب یہ گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں، تو اِن کی بیوی اِن کے جہیز میں پائے ہوئے شباب کو، ان سے چھین کر، طلے دانی میں رکھ لیتی ہیں، اور یہ سڑکوں پر ہنستے گھومتے پھرتے ہیں۔

یہ بھی، میرے زمانۂ حیدر آباد کے پُرانے دوست ہیں، اور ایسے مخلص دوست کہ اب جب کہ میں حکومتِ پاکستان کا معتوب ہو چکا ہوں، یہ میرے پاس برابر آتے رہتے ہیں۔ میں، دینی مسائل میں اکثر اُن کو چھیڑتا رہتا ہوں، پہلے، بچوں کی طرح، بگڑ جاتے تھے، لیکن اب سُدھ چکے ہیں، غصے کے بدلے ہنسنے لگتے ہیں۔

یہ اس قدر بھولے بھالے دیں دار ہیں کہ ان کی دینی باتیں سن کر، مجھ کو ملیح آباد کی وہ بوا ''خیالن'' یاد آ جاتی ہیں، جو اذان سنتے ہی، سر پر پلّو ڈال لیا کرتیں، اور، اپنے دونوں ہاتوں کی انگلیوں کو، چونچ کی شکل میں تبدیل کر کے، بیچ بیچ چومتی، اور پھر انہیں آنکھوں سے لگا لگا کر، بار بار انہیں اوپر نیچے لے جایا کرتی تھیں، اور، اسی بناء پر، میں نے اُن کو ''رومن کیتھولک مسلم پوپ'' کا خطاب دیا ہے۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود، مائل صاحب، استواریٔ محبت، شرافتِ نفس، اور استقامتِ اخلاص کے اتنے زبردست امین ہیں کہ اُن کے سے انسان اب ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے۔

۞

امجد، حیدر آبادی

مادّی نقطۂ نظر سے مفلس، ذہنی اعتبار سے منعم، جسماً کاہ، طبعاً کوہ، شہرِ انسانیت کے قطب، ربعِ مسکوں کے اکابر رباعی گویوں کے مانند فرد فرید، کھرے سونے کی طرح مخلص، دوشیزگانِ صحرائی کے سے بھولے، نسیمِ کہسار سے زیادہ فرح بخش، برسات کی چاندنی سے بڑھ کر درخشاں دامن۔
میرے اُن کے مابین زمین و آسماں کا فرق تھا، وہ تصوّف پرست تھے، میں تفکّر دوست، لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے، اِس اختلاف کے باوجود میں اُن کی بیش تر رباعیوں پر سر دھنتا تھا۔ وہ ''کیا'' کہہ رہے ہیں، اُس سے مجھے سروکار نہیں تھا، لیکن اُنھوں نے ''کیوں کر'' کہا ہے، میں اُس کا مدّاح تھا۔ ایک روز اُنھوں نے کہا، ''جوش، اچھا کیا، تم مجھ سے ملنے چلے آئے۔ بھائی، مجھ میں اب اِتنی جان نہیں کہ تم تک پہنچتا، میں تو ملنے کو ترستا ہوں۔'' میں نے کہا، ''رفیع احمد خاں نے شاید تمھارے ہی متعلق یہ شعر کہا ہے:

وصل کی کیا اُسے حسرت ہو گی
جس میں ہلنے کی نہ طاقت ہو گی

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہنے لگے، 'ہلنے' کا اِس سے بہتر محلِ صَرف ہو ہی نہیں سکتا۔''
میں نے پوچھا، ''یہ ہلنے کی طاقت کیوں باقی نہیں رہی ہے؟''
اُنھوں نے کہا، ''ارے بھائی، چوہتر پچھتر برس کا بوڑھا ہوں۔''
میں نے کہا، ''بس؟ خالی چوہتر پچھتر برس میں چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ میری طرف دیکھو، میں اٹھاتویں برس کا ہوں اور پانچ چھ میل روز ٹہلتا ہوں۔'' ہائے، کتنے بھولے تھے وہ، یقین آ گیا اُن کو، اور کہنے لگے، ''اللہ تم کو نظرِ بد سے بچائے۔''
اب ایسے لوگ کہاں ہیں، چلا گیا قافلہ اِس قسم کے لوگوں کا — اور کدھر چلا گیا، یہ معلوم نہیں۔ اب تو اُن کی گردِ کارواں رہ گئی ہے، کچھ دن کے بعد، وہ بھی باقی نہیں رہے گی۔

کہاں ہے کارواں، کس کو یہ معلوم
غبارِ کارواں ہے، اور میں ہوں!

❁

عارفؔ و قریشی

میں جب تک حیدرآباد دکن میں رہا، یہ دونوں ہمیشہ مل کر میرے پاس آتے تھے، کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ دونوں ساتھ ساتھ نہ آئے ہوں اور چوں کہ یہ دونوں تقریباً ساتھ ساتھ ہی اِس دنیا سے اٹھ گئے ہیں، اس لیے میں اِن کے نام الگ الگ لکھ کر انھیں کیونکر جدا کردوں۔
احمد عارف ''صبحِ دکن'' کے مدیر اور قریشی کسی کالج کے پروفیسر تھے۔ عارف میں بھولا پن تھا اور قریشی میں اِس قدر ژرف نگاہی تھی کہ باریک سے باریک الجھے مسئلے کو پل بھر میں سلجھا دیا کرتے تھے، لیکن سخن سنجی دونوں میں مشترک تھی۔
عارف کو، جوانی ہی میں مرجانا تھا، اِس لیے جب پی کر سرشار ہوجاتے تھے تو ہمیشہ ''ہر روش خاک اڑائے گی صبا میرے بعد'' گایا کرتے تھے، اور چوں کہ قریشی کو بھی اُن کے بعد زیادہ دن تک رہنا نہیں تھا، وہ اِس غزل پر ہمیشہ رو دیا کرتے تھے۔ کس کو معلوم تھا کہ موت عارف سے یہ غزل گوایا اور قریشی کو رلایا کرتی تھی۔ ایک رات کو عارف، قریشی اور حبیب اللہ رشدی (جن کا ذکر آگے آئے گا) میرے پاس بیٹھے پی رہے تھے کہ ڈاکٹر لطیف آگئے اور چوں کہ وہ سنکی آدمی ہیں، دو جام پی کر کھڑے ہوگئے اور عارف، قریشی اور رشدی سے کہا، ''آؤ، میں تم سب کو اپنی موٹر میں تمھارے گھروں تک پہنچا دوں۔''
اُن میں سے کوئی بھی، اٹھنا نہیں چاہتا تھا، مگر مروّت میں آکر، یہ سب اُن کی موٹر میں جب بیٹھ گئے تو میں نے عارف و رشدی سے بڑے رحم آمیز لہجے میں کہا، ''عارف و رشدی، تم دونوں کم بختوں نے کیا اِسی دن کے لیے ایم اے کیا تھا کہ تمھارا دیوانہ استاد اِس طرح آئے، اور تم کو زبردستی، منھ میں داب کر، اٹھالے جائے۔''
لطیف نے سنا تو کہنے لگے، ''یہ کیا کہہ رہے ہو، یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا میں دیوانہ ہوں؟''
میں نے کہا، ''جی ہاں۔''
اُنھوں نے گاڑی اسٹارٹ کردی اور وہ تینوں بلّی کے منھ میں دبے ہوئے چوہوں کی طرح مجھے دیکھتے ہوئے نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور میں نے اُس رات کا نام رکھ دیا: ''بن بلاؤ والی رات۔''

ایک رات کو عارف، قریشی، رشدی، علیم پاشا، ڈاکٹر لطیف، خواجہ حسن خاں اور 'پھرکی'[۱] میرے مکان میں بیٹھے شغل کر رہے تھے کہ یکا یک قریشی نے کان کھڑے کر کے پوچھا، "جوش صاحب، یہ مجھے 'سالا' کس نے کہا؟" (حالاں کہ اُن کو کسی نے 'سالا' نہیں کہا تھا اور محض اُن کے کان بجے تھے۔)
میں نے اُس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور خواجہ حسن کی طرف اشارہ کر کے کہا، "اِس نے تمھیں 'سالا' کہا ہے۔" یہ سنتے ہی قریشی نے انگلی اٹھا کر کہا، "کیوں بے سالے خواجہ حسن!"
خواجہ حسن نے بھنا کر کہا، "جب نہیں کہا تھا، اب کہتا ہوں، اَبے سالے قریشی!" اور فوراً دونوں میں گتھم گتھا ہو گئی اور 'سالے، سالے، سالے' کے نعرے لگنے لگے۔ ہم لوگوں نے دوڑ کر دونوں کو جدا کر دیا۔ دونوں بیٹھ گئے ہانپتے ہوئے اور سب کے قہقہوں نے فضا بدل کر رکھ دی اور جب ہم سب نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا، "آہا 'سالے' کی رات، دیکھو 'سالے' کی رات، دیکھو 'سالے' کی رات، خواجہ پیا 'سالے' کی رات، آہا 'سالے' کی رات" تو قریشی اور خواجہ حسن بھی تالیاں بجا بجا کر یہی گانے لگے اور محفل برخاست ہو جانے کے بعد، ایک یا دو بجے رات جب یہ لوگ مجھ سے رخصت ہو کر گلی میں پہنچے اور سَو دو سَو قدم دور نکل گئے تو میں نے پھاٹک سے آواز دی پیارے، "قریشی، کیا ہم کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" تو "آیا آیا!" کے نعرے لگاتے ہوئے قریشی دوڑ پڑے اور میرے گلے سے آ کر لگ گئے۔ گلی سے یارانِ طریقت نے پکارا، "قریشی، پلٹ آؤ!" اور وہ "آیا آیا!" کے نعرے لگاتے ہوئے، میرے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے اور جیسے ہی وہ اپنی ٹولی سے جا ملے، میں نے پھر آواز لگائی، "پیارے قریشی، کیا ہم کو اکیلا چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" اُنھوں نے پکار کر کہا، "آیا آیا!" اور پھر میرے گلے سے آ کر چمٹ گئے۔
الغرض، میں نے اِتنی بار اُنھیں پکارا اور اِتنی بار وہ "آیا آیا!" کہتے میرے پاس آئے کہ تمام ساتھیوں کا دم نکل گیا اور میری آخری پکار پر جب وہ پانچویں، یا چھٹی بار "آیا آیا" کہہ کر دوڑنے لگے تو ساتھیوں نے اُن کو پکڑ لیا۔ اور چیخ چیخ کر اُنھوں نے کہا، "بھائی جوش، مجبور ہوں، اِن مردودوں نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔"
صد حیف کہ میرے اُن محبوب دوستوں کو وقت سے بہت پیش تر، مار ڈالا نہار آشامی نے۔ میں نے ایک روز اُن دونوں کو سمجھایا تھا کہ بابا، دن کے وقت شراب پینا حرام ہے، شریعتِ اسلامی نے جس طرح دو سگی بہنوں سے وقتِ واحد میں نکاح کو ممنوع قرار دیا ہے، شریعتِ رندی نے اُسی طرح، دو سگے

---

[۱] چوں کہ وہ پی کر، بڑے گھماؤ کے ساتھ، ناچنا شروع کر دیتے تھے، اِس لیے میں نے اُن کا نام رکھ دیا تھا 'پھرکی'۔ چشم بد دور اُن کے منہ پر لانبی سی داڑھی ہے، اور بالکل مولانا عبدالمتین معلوم ہوتے ہیں۔ اللہ رے انقلاباتِ زمانہ!

دو سگی بہنوں سے وقتِ واحد میں نکاح کو ممنوع قرار دیا ہے، شریعتِ رندی نے اُسی طرح، دو سگے بھائیوں، یعنی آفتابِ مینا و آفتابِ فلک کے اجتماع کو حرام ٹھہرایا ہے، اِس لیے اجتماعِ اُختین کی طرح اجتماعِ اُخوین کی حرمت پر نگاہ کر کے دن کا پینا ترک کر دو۔" اور اُن دونوں نے قسم کھا کر وعدہ بھی کر لیا تھا کہ اب دن کو وہ کبھی نہیں پئیں گے۔

لیکن جب ایک دن، دوپہر کے وقت میں عارف کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اور قریشی، دونوں بیٹھے پی رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں بوکھلا گئے اور کہنے لگے، "آج ہمارے ایک دوست کی شادی ہے، اُس کی خوشی میں ہم پی رہے ہیں۔"

میں تو اُن گناہ گاروں کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا، دو چار دن کی جھنکائی دے کر جب پھر دوپہر کو عارف کے وہاں پہنچا تو دیکھا، وہ دونوں پھر پی رہے ہیں۔ میں نے ڈانٹ کر کہا، "اُس روز تو دوست کی شادی کا جشن منا رہے تھے، میں خون کا گھونٹ پی کر چپ ہو گیا، آج تم ملعونوں کو معاف نہیں کروں گا۔ تمھاری بوتل توڑ ڈالوں گا اور تم سے قطعِ تعلق کر لوں گا۔"

عارف و قریشی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے، "ہمارا ایک دوست کل مر گیا ہے، ہم اُس کا سوگ منا رہے ہیں۔"

میں نے کہا، "خوشی اور غم، دونوں کو تم لوگ مے کشی کا بہانہ بنا لیا کرتے ہو۔"

وہ دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اور میں روٹھ کر گھر چلا آیا۔ ہائے، وہ دونوں اب فرشِ خاک پر سو رہے ہیں اور میں فرشِ خاک پر بیٹھا اُنھیں یاد کر کے آنسو بہا رہا ہوں۔

❁

ڈاکٹر عبداللطیف

یہ بھی میرے بڑے محبوب دکنی احباب میں سے ہیں __ میرے زمانے میں یہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور ایسے لائق کہ بڑے بڑے فرنگی اساتذہ اُن کی انگریزی کا لوہا مانتے تھے۔ اُسی زمانے میں انھوں نے، قریشی کی مدد سے، غالب پر ایک کتاب بھی "دی غالب" (The ghalib) کے نام سے لکھی تھی۔

اگر وہ غالب پر نہ لکھتے تو اچھا تھا، اس لیے کہ غالب سے پیچیدہ و مشکل شاعر پر وہی لکھ سکتا ہے، جس کا دماغ شاعرانہ ہو، اور، اُس کے دوش بدوش اُس کو اردو اور فارسی میں بھی کامل دست گاہ ہو۔

یہ بڑے ہی مخلص، بھولے بھالے انسان ہیں، اور بعض اوقات ان کی سنگ، جمی ہوئی محفل کا رنگ اُڑا دیا کرتی تھی۔ وہ آخر میں زبردست مسلم لیگی بھی ہو گئے تھے، اور اپنے مضامین و تجاویز کی وساطت سے انھوں نے بڑی خدمت کی تھی۔

ایک بار انھوں نے مجھ پر زبردست احسان بھی کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ دکن میں ویسرائے آنے والا تھا، اس لیے اُس روز شراب کی دکانیں بند کر دی گئی تھیں۔ شراب پینے والے ویسرائے کی آمد پر شراب کی دکانوں کا بند کیا جانا، ایک بہت بڑا مضحکہ خیز سانحہ تھا۔

مجھ کو اس حماقت کی اطلاع نہیں تھی، کہ آج تمام بار اور دکانیں بند ہیں، جب حسبِ دستور میں نے آدمی کو بوتل لانے کے لیے بازار بھیجا، اور جب اُس نے آکر مطلع کیا کہ آج شراب کی تمام دکانیں بند ہیں، میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور عارف و قریشی کا رنگ فق ہو گیا۔

ابھی ہم اس بے کسی کے عالم میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں لطیف آ گئے، انھوں نے یہ دیکھ کر [کہ] ہم لوگ جھاڑ جھنکار، سر جھاڑ منھ پھاڑ بنے بیٹھے ہیں، پوچھا کہ "ماجرا کیا ہے" میں نے کہا "آج دکانیں بند ہیں کیا کریں"

انھوں نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور کہا "میں جانتا تھا کہ تم کو دکانوں کے بند ہونے کی خبر نہیں ہو گی" اتنا کہہ کر انھوں نے شوفر کو آواز دی، اور دو بوتلیں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ سوکھے دہانوں پانی پڑ گیا، اور ہم سب اُس الفوتی کی

طرح رقص کرنے لگے، جس کے شہر کے تمام افیون کے ٹھیکے، کسی مذہبی تقریب[1] کی بناء پر بند کر دیے گئے تھے۔ اور وہ افیون کی تلاش میں کئی میل کی مسافت طے کر کے، کسی گاؤں میں گیا تھا، وہاں بھی ٹھیکہ بند تھا، اور اس سے یہ کہا گیا تھا کہ یہاں سے تین میل پر جو گاؤں ہے، وہاں ٹھیکہ بند نہیں ہوا ہے۔ وہ مصیبت کا مارا، رینگتا رانگتا جب وہاں پہنچا، اور، دور سے ٹھیکے کا چراغ دیکھا تو اس کی روح میں بالیدگی آ گئی، قدم تیز ہو گئے، اور، ایک عجیب امید وبیم کے عالم میں، اس نے ٹھیکیدار سے پوچھا ____ افیون ہے؟

ٹھیکے دار نے کہا "ہاں ہے، آپ کو کتی (کتنی) چاہیے"

اس استصواب سے مست ہو کر وہ خوشی سے اُچھل گیا اور "تیری کتی کے قربان، تیری کتی کے قربان" کہہ کر ناچنے لگا تھا۔

اُن کی ماں، بے حد پابندِ شریعت، اور اُن کی بیوی، دکن کے کسی بڑے پیر کی بیٹی تھیں، اس لیے اُن دونوں کے ڈر سے وہ، چوروں کی طرح، چھپ چھپ کر، غسل خانے میں پیا، اور، ہم لوگوں کو، ہونٹوں پر انگلی مار مار کر، خاموش رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

ایک روز، وہ بڑے کرب کے عالم میں، میرے پاس آئے، اور، اپنے شانے کو دبا دبا کر، کراہنے لگے، میں نے پوچھا "کیا بات ہے" ____ انھوں نے، ٹھیٹ دکنی زبان میں کہا "اماں مارے" میں نے پوچھا "کیوں مارے؟" انھوں نے کہا "میں بیوی کو حرام زادی بولا تھا" یہ سن کر میرا قہقہہ نکل گیا۔ اور وہ مجھے گھورنے لگے۔

اب وہی، غسل خانے میں چھپ چھپ کر پینے اور بیوی کو "حرام زادی بولنے والے" ڈاکٹر لطیف الدین، غریق الدین ہو کر رہ گئے ہیں۔ سچ کہا ہے کسی اللہ کے بندے نے کہ:

عاقبت ، گرگ زادہ ، گرگ شود
گرچہ ، با آدمی ، بزرگ شود!

---

[1] ____ مذہبی تقاریب میں نشہ آور چیزوں کا امتناع یہ ثابت کرتا ہے کہ ان مواقع پر مسکرات کا استعمال حرام اور باقی سارے دنوں میں حلال ہے۔

حبیب اللہ، رُشدی

عارف وقریشی کے ساتھ جب یہ پہلے پہل میرے سامنے آئے تھے، ان کا چہرہ، امردیت کے دائرے سے نکل کر، بلوغ کے حدود میں آ چکا تھا۔ لیکن، کم سنی کے ڈوبے ہوئے آفتاب کی شفق اُن کے رخساروں پر اس طرح پھولی ہوئی تھی کہ ع: ارے، رے، رے، ارے، رے، رے، ارے، رے۔ لیکن کراچی آنے کے بعد، صحت کی متواتر ناسازگاری اور معاش کی مسلسل ناہمواری نے ان بے چارے کو ایسا کھنڈ بنا دیا ہے کہ اگر کہا جائے کہ کبھی اُن کا بھی خوب رویوں میں شمار تھا، تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ اور یہ بات فقط اُن کے چہرے تک محدود نہیں ہے، اُن کے مزاج میں بھی، ایسی حیرت ناک تبدیلی ہوگئی ہے کہ اور تو اور، وہ میرے پاس تک نہیں آتے ہیں۔

دکن، پونے، اور بمبئی تک اُن کا یہ عالم تھا کہ مجھ سے ملے بغیر اُن کو چین ہی نہیں آتا تھا، اور وہ اس پابندی کے ساتھ، ہر رات کو میرے پاس آتے، اور میرے ساتھ پیتے پلاتے تھے، گویا وہ اُن کا سب سے بڑا دینی فریضہ تھا۔ لیکن اب میرے قریب ہر کتے بھی نہیں، البتہ، دوسرے تیسرے مہینے اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ بھی منور عباس صاحب کی محفل میں۔

اور میں اُن کا رونا کیا روؤں، یہاں آ کر، میرے خلوص کی دھار بھی ایسی کُند ہو کر رہ گئی ہے کہ میں بھی اُن کے پاس آتا جاتا نہیں ہوں۔ لوگ کہتے ہیں یہ کراچی کی آب و ہوا کا اثر ہے جو دلوں کو پتھر بنا دیتی ہے، ممکن ہے یہ بات بھی ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ مہاجرت کے بعد ہمارے شجرِ حیات کی جڑیں ابھی تک یہاں کی زمین کے نیچے نہیں پہنچ سکی ہیں، اس لیے تھالوں میں پانی دیتے رہنے سے ہم کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ ہم ایک دوسرے سے مل سکیں۔☆

☆___ اردو نستعلیق ٹائپ پر حبیب اللہ رشدی کی دسترس اور مکمل گرفت کے جوش صاحب بہت قدرداں تھے انہوں نے پاکستان کے سابق وزیر خزانہ اور گورنر جنرل غلام محمد کو جو چند خطوط لکھے تھے (خطوط جوش ملیح آبادی، مرتبہ، راغب مرادآبادی۔ ویلکم بک پورٹ، کراچی ۱۹۹۳ء ص: ۱۳۱___۱۳۵) ان خطوط میں اس بات پر توجہ دلائی گئی تھی کہ پاکستان کا شعبہ تعلیمات اردو نستعلیق کے ذیل میں رشدی صاحب کی خدمات سے فائدہ اُٹھائے۔

بہرحال اپنے رُشدی سے، جس کو میں "بُھگا" کہا کرتا ہوں، مجھے آج بھی بہت زیادہ محبت ہے۔ یہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے ایم اے ہیں، اور ان کی ذات اس قدر جامع کمالات ہے کہ عثمانیہ یونی ورسٹی ہی نہیں، پورا دکن ان پر ناز کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں یوں تو ہزاروں ایموں، اور "پی ایچ ڈیوں" کو میں دیکھ، اور پرکھ چکا ہوں، جن کی استھیوں کے ڈھیلوں سے زیادہ وقعت نہیں ہے، لیکن رُشدی ایک ایسے ٹھوس آدمی ہیں، جنھوں نے علم کو، خوب اچھی طرح، چبا چبا کر کھایا، بخوبی ہضم کیا، اور مسلسل تفکر کی وساطت سے، اس کو اپنے دورانِ خون میں شامل کر لیا ہے۔ اور تاریخ، لسانیات، ادب اور فلسفے میں اُن کو ایسی بصیرت حاصل ہے کہ بڑے بڑے پروفیسروں کو برسوں تعلیم دے سکتے ہیں ہائے کس قدر قابلِ قدر و فاضل انسان بیماری اور مفلسی کے ہاتھوں بڑی تیزی کے ساتھ، منزلِ آخر کی طرف چلا جا رہا ہے، اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

ہم دونوں، خدا کے فضل و کرم سے موت کی بس کے انتظار میں، دوش بدوش کھڑے ہوئے ہیں۔ اور میں کہہ رہا ہوں کہ اے میرے بھگے دوست، مجھے کہنی مار کر، آگے نہ بڑھ جانا ــــ ورنہ حشر کے دن، اُٹھا کر، دے ماروں گا [1]۔

---

[1] ــــ صد حیف کہ اس کے لکھنے کے بعد، فروری ۱۹۶۹ء میں وہ بھی مجھ سے روٹھ کر وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔ رُشدی تم نے میری رفاقت سے ہات اُٹھالیا، تم، کہنی مار کر، آگے نکل گئے اور میں نامراد کھڑا رہ گیا۔ اے موت مار ڈال میرے تمام ساتھیوں کو۔ اور پھر اسی طرح میرا جنازہ اُٹھا کہ اس میں میرا ایک دوست بھی شریک نہ ہو۔

بسمل، ٹونکی

ترس آنے کی حد تک لقات وزار و نزار، لشکرِ ناتوانی کے علم دار، اپنے خانگی حالات سے فگار و شرم سار، بہر عالم و بہر موسم بیمار، میر تقی میر، آغا شاعر، اور فانی کے مانند، غم پرست و خوشی بیزار، یہودی کی ماتمی دیوار، شبِ وصل میں بھی، ہجر سے دوچار، جشنِ رامش و رنگ میں بھی، آہ برلب واشک بار، یومِ ولادت سے لے کر آج کی تاریخ تک، علی الاتصال نادار، سنتِ جاریہ کے طور پر، بہر نفس، جویائے ناصر و مددگار اپنی اُفتادِ مزاج کے ہاتوں، بہمہ وجوہ، پریشاں روزگار۔ اور اقلیمِ غزل کے، ہر چند خام معروف، لیکن پختہ مغز شہریار۔

میرے اس قدر محبوب دوست ہیں کہ جب ہندوستان جاتا ہوں، سب سے پہلے، انھیں کی زنجیرِ در کھڑکھڑاتا ہوں۔ جب تک دہلی میں رہتا ہوں، وہ، گھر بار تج کر، میرے پاس، اس طرح آجاتے ہیں، جیسے لڑکی، میکے سے سسرال چلی آتی ہے۔ اور شام کو پیتے وقت، چوں کہ وہ قنوطی ہیں، میں رجائی ہوں، میرے اُن کے مابین بڑی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، وہ جام اُٹھا کر، اس طرح کراہتے ہیں، جیسے ایک، پانی سے بھری ہوئی بہت بڑی گگری کو، سر پر رکھتے وقت، نازک کنیا، پنگھٹ پر، کراہ اُٹھتی ہے۔

اور اُن کے کراہتے ہی، میری شگفتگی ٹھُمری ٹھُمری لے کر، آغا حشر کاشمیری کے، اسٹیجی لہجے میں اُن سے پوچھتی ہے "اے جانِ جہاں، اے آرامِ دلِ عاشقاں، تم پر کو والم ٹوٹا کہ ملک و دیار چھوٹا، کیوں ہوئی یہ شکل، جانی آپ کی، حالِ دل سنتے زبانی آپ کی" تو وہ، جھینپ کر، مہین مہین مسکرانے لگتے ہیں۔

یہ صرف بسمل ہی نہیں، جو مرغِ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے ہیں، ہماری پوری برادری بالعموم اور ہمارے تمام غزل گو بالخصوص۔ تاریخی انعطافات کے پیدا کردہ تاثرات و روایات کی بناء پر، صدیوں سے غم خیفتگی (morbidity) کے مرض میں گرفتار ہیں، اور، خود آزاری و دل شکستگی کے مزے لوٹ لوٹ کر، یہ نعرے لگا رہے ہیں کہ:

نہ جاگنے میں یہ لذت، نہ شب کے سونے میں
اگر مزا ہے، تو، پچھلے پہر کے رونے میں

ایک بار وہ ایک شاہد بازاری پر، جو دہلی کلاتھ مل کے مالک لالہ شنکر لال کی، سول لائن والی خفیہ جشن گاہ میں ناچا کرتی تھی، بُری طرح عاشق ہو کر، اپنے رقیب جگن ناتھ آزاد سے دست و گریباں ہو گئے تھے، اور، آخر کار، ایک دن انھوں نے خودکشی کی بھی طیاری کر لی تھی۔ اب کی ۱۹۶۷ء میں، جب میں نے اُن سے اُس محبوبہ کا حال پوچھا تو، کان پکڑ کر انھوں نے تین بار، توبہ توبہ کہا، اور بیان کیا کہ پرسوں ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک بھتنی چلی جا رہی ہے، اُسے دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ دہلی پر کوئی خوفناک وبا حملہ آور ہونے والی ہے، اور یہ چڑیل اُسی کی ایک مکروہ علامت ہے، لیکن جب قریب جا کر دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی عورت ہے، میں، جس کی محبت میں جان دینے پر تل گیا تھا۔

اللہ اللہ اس دنیا میں بھی کیا کیا تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اور کتنی پریاں ہیں جو چڑیلوں کی شکل اختیار کر لیا کرتی ہیں۔ اور کتنی کبوتریاں ہیں، جو بجو بن کر، قبرستانوں میں رینگتی نظر آتی ہیں...... الامان والحذر!

مولانا ابوالکلام آزاد

گورا رنگ، فرنچ داڑھی، بلند قامت، کشادہ پیشانی، درخشاں چشم، شاعر مزاج، عاشق طبع، شعر شناس، ادب نقاد، سیاست مولا، علم امام، دجلۂ تقریر، قلزم تحریر، ارسطو چہرہ، سقراط لہجہ۔ آزادی کے طلب گار، چشمۂ برجستہ اشعار، جلوت میں شراب بیزار، خلوت میں شراب پرستار، قبلِ وزارت، شیفتۂ انکسار، بعدِ وزارت، مائل بانتکبار، آغاز میں، تیقن مدار، انجام کار تشکک شعار، جوانی میں، وجود باری کے مجسم اقرار، بڑھاپے میں، از سرتاپا، انکار۔

اس میں شک نہیں کہ وہ بہت ذی علم تھے، لیکن اُن کی ذہانت، اُن کے علم سے وسیع تر تھی۔ میں غالباً ۱۹۲۲ء میں، اپنے بھانجے (مولانا) عبدالرزاق ملیح آباد [ملیح آبادی] کی وساطت سے، جو انھیں کے ساتھ رہتے تھے، کلکتے میں، پہلی بار اُن سے ملا، اور اُن کی بے پناہ ادبیت وذہانت سے متاثر ہوا تھا۔

اُس ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا "____ میں نے آپ کی "روحِ ادب" سے یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ آپ بڑے ہونہار آدمی ہیں۔ آپ نے قدیم اور جدید شاعری کو اس تکلف سے ممزوج کیا ہے کہ آگے چل کر اُس سے ایک ایسا آمیزہ وجود میں آجائے گا کہ آپ ایک دورِنو کے بانی ٹھہرائے جائیں گے ____"

میرا نوجوان دل، اُن کی تعریف کا ابھی مزا لے رہا تھا کہ، انھوں نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ باتیں کرتے کرتے، انھوں نے میرے چہرے کو غور سے دیکھ کر، کہا "ارے آپ کا چہرہ تو عشق گزیدہ معلوم ہو رہا ہے" میں نے آنکھیں جھکا لیں اور سوچنے لگا کہ اُنھیں اس کا پتا کیوں کر چل گیا۔

وہ نہایت بزدل بادہ خوار تھے، سات پردوں میں چھپ کر، پیا کرتے تھے۔ اور جب، اس رنگ کو دیکھ کر، ایک روز میں نے اُن سے یہ کہا تھا کہ "اس طرح چھپ چھپ کر پینے سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ آپ کھلم کھلا تسبیح گھونٹا شروع فرما دیں" تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اور کہا "میرے بھائی میں خدا سے نہیں بندوں سے ڈرتا ہوں، اس لیے کہ پیروں کے خاندان سے ہوں، اور کانگریس کا رکن، لوگوں کو معلوم ہو گیا تو میں ملک کی خدمت نہیں کر سکوں گا"

وزارت کے بعد، ایک روز میں نے اُن سے کہا تھا کہ "مولانا آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں کہ آپ

مولانا آزاد اب بہت کم، اور وزیرِ تعلیم بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں"
انھوں نے جواب دیا" کیا کروں، بے حد مشغول رہتا ہوں" میں نے کہا" زیادہ نہیں، کم سے کم، ہفتے میں ایک دن تو ایسا ہونا چاہیے کہ آپ کے دولت کدے پر ایک علمی صحبت کا انعقاد ہو جایا کرے" انھوں نے میری بات مان لی، اور کہا" آپ اربابِ علم و فکر کی ایک فہرست لکھ کر، مجھے دے دیں، لیکن اُس انجمن کے ارکان دس سے زیادہ نہ ہوں"
اس کے بعد اُن کے وہاں ہر ہفتے اجتماع ہونے لگا۔ پہلے سے ایک موضوع دے دیا جاتا تھا، اور لوگ اس پر مضمون پڑھتے اور مباحثہ کرتے تھے۔
میری مہاجرت سے کچھ قبل جو اجتماع ہوا تھا، میں نے اُس میں یہ موضوع دیا کہ آیا اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہر آن، ہر دقیقہ اور ہر نفس بدل جانے والے انسان کے واسطے کوئی ایسا اٹل، ابدی، جامد اور تغیر ناقبول قانون بنایا جائے جس کو قیامت تک بدلا ہی نہ جاسکتا ہو۔
وہ آخری اجتماع نہایت دل چسپ اور عمیق تھا، اور، ڈاکٹر سکینہ کے مقالے کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک پیہم متحرک و انقلاب پذیر معاشرے کے واسطے کوئی ایسا ضابطہ بنایا ہی نہیں جاسکتا جو غیر متحرک و پابگل ہو۔ مولانا آزاد نے بھی اس سے اتفاق کر لیا تھا، اور تمام حاضرین نے، ہم آہنگ ہو کر، سکینہ کے خیال کی تائید کی تھی۔ اور، اس سلسلے میں جب قانونِ الٰہی اور وجودِ باری کا ایک رُکن نے سوال اُٹھایا، تو آزاد نے کہا تھا، بات دراصل یہ ہے کہ وجودِ باری ایک ایسی ذوقی چیز ہے کہ اگر کسی کا ذوق اُسے، بے دلیل تسلیم کر لینے پر مُصر ہے، تو وہ تسلیم کر لے، ورنہ وجودِ باری کی کوئی منطقی دلیل موجود نہیں ہے۔
ایک بار بہت ہی لطف آیا، میں اُن سے ملنے گیا، معلوم ہوا کہ پنڈت جی اُن کے پاس آئے ہوئے ہیں، میں نے اپنے نام کا پرچہ بھیج دیا، لیکن جب انتظار طویل ہو گیا تو میں نے، یہ شعر لکھ کر اندر بھیج دیا:

نامناسب ہے، خون کھولانا
پھر کسی اور وقت، مولانا

اس پرچے کے پہنچتے ہی، اندر سے، قہقہے کی آواز بلند ہوئی، مولانا، اور پنڈت جی دونوں ہنستے ہوئے، باہر آگئے، مولانا نے، بڑھ کر، مجھے گلے لگا لیا، اور کہا آپ نے "مولانا" کا ایسا اچھا قافیہ نکالا ہے کہ جی خوش ہو گیا، اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کا قافیہ قبلہ قبلی اور "شبلی" یاد آگیا۔

۞

لطیف الدین احمد

اکبر آباد کے باشندے، اعلےٰ پائے کے افسانہ نگار، انتہا درجے کے لطیف الطبع، بے حد وسیع المطالعہ، نہایت، باریک بیں سخن سنج، پیرس کی راتوں کے لذت چشیدہ، ارباب علم وادب کا مرکز، اور ۱۹۱۸ء سے، میرے بے تکلف دوست ہیں۔ آگرے کے تمام ارباب علم وادب، اُن کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے، اور جب کوئی ادیب یا شاعر، آگرے آتا تھا، ان کے مکان کا طواف کیے بغیر نہیں جاتا تھا۔
اب وہ تجارت کے سلسلے میں کلکتے چلے گئے ہیں، اور آگرہ سونا ہو کر رہ گیا ہے۔
میں جب بھی آگرے جاتا تھا، اپنے نانا کے محل میں نہیں، انہیں کی "من ٹولے" والی کوٹھی میں قیام کیا کرتا تھا۔ اُن کی کوٹھی کی دو راتیں اب تک یاد ہیں، ایک رات، انتہائی بھیانک تھی، اور ایک رات انتہائی جمیل۔ بھیانک رات کا واقعہ پہلے قلم بند کروں گا۔ ایک شام کو میرے ایک دوست شفیق الدین نے، جو صورت کے اعتبار سے مجھ کو بہت عزیز تھے، ہم سب کو تاج محل کے سامنے کے ٹیلے پر مے خواری کی دعوت دی، اُس دعوت میں شریک تھے لطیف، رئیس، جگر مراد آبادی، مخمور، اور ایک نوجوان جن کا غالباً خواجہ مسعود علی نام، اور ذوقی تخلص تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، ہم سب ٹیلے سے سرشار ہو کر آئے اور میدان میں چار پائیوں پر دراز ہو گئے۔ کہ اتنے میں میری موٹر پر ایک زبردست ضرب کا دھاکہ ہوا، اور دیکھا کہ چار پانچ گنڈے لٹھوں سے حملہ کرنے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ کر، میرے تمام ساتھی، بھاگ کھڑے ہوئے، میں تنہا رہ گیا۔ اور وہ گنڈے مجھ پر لاٹھیاں برسانے لگے۔

وہ گنڈے دراصل مارنے آئے تھے ایک پیشاوری پٹھان کو، جو لطیف ہی کی کوٹھی میں رہتا تھا، مگر چوں کہ وہ نشے میں دُھت تھے اس لیے مجھ کو پیشاوری پٹھان سمجھ کر انھوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں ایک تھا، وہ تین چار، میں نہتا تھا، وہ لٹھ بند، وہ لٹھ مارتے تھے اور میں گھونسے، الغرض میرا سر پھٹ اور ہات ٹوٹ گیا۔ میرے ساتھی، جھاڑیوں میں دبکے تماشہ دیکھ رہے تھے، لیکن کسی نے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ لطیف، جھاڑی سے نکل کر، پھاٹک کی طرف بھاگے کہ پولیس کو خبر کر دیں، ایک گنڈے نے اُن کو بھاگتے دیکھ لیا، اُس نے ان کا گریبان پکڑ لیا، لطیف نے بڑے زور سے جھٹکا دیا، وہ گریبان گنڈے کے ہات میں رہ گیا، اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اُس کے بعد، سڑک پر سیٹیاں بجنے لگیں، پولیس [1] آ گئی، اور گنڈوں کو گرفتار کر لیا گیا۔
اب دوسری رات کا حال سُنیے جو بے حد جمیل تھی۔
میرے باپ کی ننہیال کی طرف سے میرے ایک قرابت دار تھے سید مقدس حسین، ایڈووکیٹ، وہ آگرے کی ایک نہایت خوب رو، طوائف، جھمّو جان پر بُری طرح عاشق تھے۔ ایک رات اس کو لطیف کی کوٹھی پر مدعو کیا گیا۔ اس دعوتِ رقص و سرود میں شریک ہوئے تھے، مے کش، سیماب، اخضر، مخمور، حافظ امام الدین، مانی، فانی اور شاہ دلگیر وغیرہ۔ کیا بتاؤں جھمّو کس بلا کی حسین تھی، اور مقدس کس طرح اُس پر مٹے ہوئے تھے۔
جھمّو کے مکھڑے میں حسنِ راجپوتانہ کی ملاحت آمیز صباحت اور، اس جادو بھری شفق کا امتزاج پایا جاتا تھا، جو، برکھا رُت میں، جمنا کے کنارے، اُس وقت پھولتی ہے، جب دونوں وقت گلے ملنے لگتے ہیں اور اُس کی تانوں سے مقدس کے چہرے کے رنگ میں اُس دریا کا سا مدوجزر پیدا ہو رہا تھا، جس کی سطح پر نکھری ہوئی چاندنی مچلنے لگتی ہے۔
جب ساز مل گئے اور گانا شروع ہوا تو اُس کے پنچم اور مدھم سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کبھی زمین آسمان کی طرف اُڑتی چلی جا رہی ہے، اور کبھی آسمان، زمین پر اُترتا چلا آ رہا ہے
اللہ اللہ اُس فتنۂ روزگار کے گانے کی لپک، اس کے مکھڑے کی دمک، اُس کے بھاؤ بتانے کی لٹک، سارنگیوں کی جھنک، جوڑی کی گمک، اور اُس کے جوان انفاس کی مہک نے، ہم سب پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ ساری کائنات اندر سبھا اور الف لیلیٰ میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔
اُس محفل کے شرکاء میں سے اب لطیف، مخمور اور مے کش باقی ہیں، باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ جھمّو کے متعلق معلوم نہیں کہ اب تک جی رہی ہے کہ سدھار گئی۔ جیتی بھی ہو گی تو اب بُڑھیا ہو چکی ہو گی۔ ہائے کتنے چاندوں کو یہ ظالم وقت گہنا چکا ہے، اور کیسے کیسے ہنستے بولتے زندہ دل انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا ہے۔
ہائے جھمّو کی موہنی صورت، اور یاروں کی وہ صحبت اب یاد کرتا ہوں تو سینے میں دم اُلجھنے لگتا ہے۔ کاش میں نے اُس رات کا مزا نہ لوٹا ہوتا۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ رات، عمر بھر خون کے آنسو رلائے گی!!

---

[1] صبح ہوتے ہی، اُن حملہ آوروں کو تھانے دارنے کرآیا، اور مجھ سے کہا آپ انہیں پہچان لیں، تا کہ پریڈ کے وقت آپ دھوکا نہ کھائیں، اُس کے بعد پولیس ڈاکٹر نے میرے ہات کا معائنہ کر کے کہا، ہڈی ٹوٹ گئی ہے، میں نے کہا، ڈاکٹر صاحب، وہ لوگ نشے میں دھت تھے، اس لیے میں اُن کو معصوم سمجھتا ہوں، آپ میری ضربِ شدید کو ضربِ خفیف میں بدل دیں، تا کہ حملہ آوروں کو لمبی سزا نہ ہونے پائے، ڈاکٹر نے میری بات نہیں مانی۔ اور جب عدالت میں مقدمہ پیش ہوا، میں نے یوروپین جج سے کہا "چوں کہ ملزموں کو پہلے ہی سے پہچوا دیا گیا تھا، اس لیے میری شناخت کو قابلِ اعتبار نہ سمجھا جائے" لیکن وہ جج اس قدر سخت تھا کہ اس قانونی سقم، پیدا ہو جانے کے باوجود، اُس نے ان لوگوں کو آٹھ آٹھ برس کی سزا دے دی۔

لطیف اس بات پر مجھ سے بے حد ناخوش ہیں کہ میں پاکستان [1] کیوں چلا آیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جوش، بحیثیت شاعر، سب کچھ ہے، لیکن بحیثیت انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ بھائی لطیف، لاکھ بار تم مجھ کو دائرۂ انسانیت سے خارج کردو، میں اپنے دل سے تمھیں نکلنے نہیں دوں گا۔

[1] صرف لطیف ہی نہیں، میری مہاجرت سے میرے بہت سے احباب ناخوش ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کے ہدایت اللہ انصاری، دہلی کے راجندر ناتھ شیدا، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ساغر نظامی، اور شمیم کرہانی۔ آج تک کراہ رہے ہیں۔ اُن میں سے ہر فرد، بڑی سختی کے ساتھ "بھارت ماتا" بنا ہوا ہے، میں ان احباب کو کس طرح سمجھاؤں کہ اے بھارت ماتاؤ، میں انسان کی آفاقی اخوت کا پرستار ہوں ـــــ یہ پورا کرۂ ارض ایک وسیع حویلی ہے، اور اس حویلی کے تمام رہنے والے ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، تم لوگ "لسان، اوطان اور ادیان" کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں دبکے ہوئے، کب تک غٹرغوں، غٹرغوں، کرتے رہوگے۔ آؤ، کھلی ہوا میں سانس لو۔

بے شک اس خطۂ ارض سے محبت، اور جی بھر کر محبت کرو، جہاں تم پیدا ہوئے تھے، اور جہاں تمہاری نال اور تمھارے بزرگوں کی ہڈیاں، گڑی ہوئی ہیں، اور اگر تمہارے محدود مخصوص وطن پر کوئی ظالم حملہ آور ہو جائے تو ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرو کہ اس نوعیت کی حب وطن، فطرت کا فرمان اور انسان کا ایمان ہے، لیکن اس حب وطن سے دور رہو جو ایک دوسرے کی نفرت پر ابھارتی ہے۔ اور زمین کو خون پلاتی ہے۔

اے بھارت ماتاؤ، تم مجھ سے اس لیے ناخوش ہو کہ میں حویلی کے ایک کمرے سے اٹھ کر، دوسرے کمرے میں آ گیا ہوں۔ حالانکہ میں تمہارا ویسا ہی دوست ہوں، جیسا کہ میں تھا، البتہ اس قدر فرق ضرور ہو گیا ہے کہ اگر تم کبھی پاکستان پر حملہ کروگے تو میں اس کے دفاع میں تم سے برسر پیکار ہو جاؤں گا۔ اور اگر پاکستان، ہندوستان پر غاصبانہ حملہ کرے گا تو میں پاکستان کا ساتھ نہیں دوں گا۔ اور جب یہ دونوں روٹھے ہوئے خطے، ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں گے، میں خوشی کے مارے ناچنے لگوں گا:

شکرِ ایزد کہ میانِ من و او، صلح فتاد
حوریاں رقص کناں، ساغر و پیمانہ زدند!

مے کش، اکبرآبادی

گورے چٹے، کھڑا ناک نقشہ۔ شگفتہ چہرہ، شائستہ گفتار، ذی علم، شاعر، صوفی صافی، اور اس ادھیڑ عمر میں بھی ایسے شرمیلے کہ جب کوئی خوب رو عورت سامنے آجاتی ہے تو اُن کی آنکھیں جھک کر کہنے لگتی ہیں، "ہائے میرے اللہ کدھر جا کر چھپ جاؤں"

اُن کے چہرے پر، پاکیزگیٔ اخلاق، اور طہارتِ نفس کی اس قدر شیرینی ہے کہ جب اُن کی طرف نگاہ اُٹھاتا ہوں، تو میرے منھ میں قند کی ڈلیاں گھلنے لگتی ہیں۔☆

وہ مشائخ آگرہ میں سے ہیں، لیکن، نہ کسی کو مرید بناتے ہیں، نہ کسی کی نذر قبول کرتے ہیں۔

دنیا کی دو تاریخی ہکلاہٹیں ہیں، ایک تو موسیٰ کی ہکلاہٹ تھی، جس پر اللہ میاں کو پیار آتا تھا۔ ایک مسیح مزاج مے کش کی ہکلاہٹ ہے، جس پر، مجھ اللہ میاں کے نمائندۂ خصوصی کو پیار آتا ہے۔ میوہ کٹرے میں اُن کا مکان ہے، بالاخانے پر رہتے ہیں، زینہ دن کے وقت بھی گھپ رہتا ہے، کیوں نہ ہو کہ ظلمات طے کر کے ہی چشمۂ حیواں تک رسائی ہوتی ہے۔ ان کے بالائی کمرے کے عین مقابل اک پٹا خاسی طوائف رہتی تھی، میں نے ایک دن پوچھا کہیے مے کش صاحب، کبھی اس سے بھی یاد اللہ کی نوبت آئی کہ نہیں، انھوں نے کنواری کی طرح

☆ ـــــ جوش صاحب نے اپنے ایک خط میں مے کش اکبرآبادی کو برادرِ ذہنی اور رفیقِ روحانی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ بنارسی باغ لکھنؤ سے ۷ رمئی ۱۹۴۱ کو لکھے جانے والے ایک خط میں جوش صاحب کہتے ہیں ـــــ

"مے کش صاحب! ہمارے اور آپ کے راستے کس قدر ایک دوسرے سے جدا اور ہماری زندگیاں کس درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف کھنچنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور ایک دوسرے کو عالمِ تصور کے روحانی دھندلکے میں محوِ خرام دیکھا کرتے ہیں میں دل میں آپ کے خط آنے سے دو تین روز پیشتر یہ کہہ رہا تھا کہ یہ مے کش بھی عجیب شخصیت کا مالک ہے جو فرصت کے لمحوں میں مدت سے میرا تعاقب کرتا رہتا ہے شاید آپ اس وقت مجھے خط لکھ رہے ہوں گے اور اسی کی لہریں میرے دل سے مس ہو رہی ہوں گی" (جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۵)

آنکھیں جُھکا لیں، اور چہرے سے آواز آئی، ہم، بہو بیٹیاں، یہ کیا جانیں۔ اور مجھ کو اس قدر مزا آیا کہ اگر باوضو ہوتا، تو وضو ٹوٹ جاتا۔
اُن کا نام ہے محمد علی شاہ، اور تخلص ہے مے کش، لیکن مے کو ہات لگانے کی توفیق انھیں آج تک نہیں ہوئی ہے۔
میں نے اُن پر جو رُباعی کہی تھی، آپ بھی سُن لیں:

حضرت کا ہے، دنیا سے نرالا دستور
باطن میں تہی دست، بظاہر فغفور
مے کش ہے تخلص، اور مے سے ہے گریز
برعکس نہند، نامِ زنگی، کافور

ان کا بیٹا فلسفے کا ایم اے ہے، لیکن، صد حیف کہ باپ کا تصوف، بیٹے کے تفلسف کو نگل چکا ہے۔ تنسیخ زمیں داری نے، لاکھوں زمیں داروں کے مانند، اُن کے دل کو بھی بجھا کر رکھ دیا ہے، مگر منھ سے اُف تک نہیں کرتے ہیں۔ اور اپنی قدیم وضع داری کو نباہے چلے جا رہے ہیں۔
۱۹۶۷ء میں، اُن سے ملنے آگرے گیا تھا۔ اب رہ کیا گیا ہے آگرے میں تاج محل اور مے کش کے علاوہ۔ دونوں کو جی بھر کے دیکھا، اور اس طرح دیکھا کہ شاید یہ آخری دیدار ہو۔ دیکھئے اب بھی اُن سے ملاقات ہوتی بھی ہے کہ نہیں، میں، پابہ رکاب ہوں، اور اُن کی زندگی بھی ڈھال پر آچکی ہے۔

کمر باندھے ہوئے، چلنے کو، یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں!

میری تمنا ہے کہ مے کش میرا داغ کھائیں، مجھے اپنے داغ سے بچائیں۔

❁

مخمور اکبر آبادی

خوش خلق، خوش فکر اور خوش مزاج انسان ہیں، آگرے میں وکالت کرتے تھے، اور جوانی میں نہایت خوب رو انسان تھے۔ اب کراچی میں رہتے ہیں، اور اس قدر بجھ گئے ہیں کہ کبھی ملتے ہی نہیں، اور جب کبھی کسی محفل میں نظر آتے ہیں، تو بیگانہ وار نگاہ اُٹھاتے ہیں۔ نہ جانے اُن کی ذہانت اور اُن کے خلوص کو کس کی نظر کھا گئی ہے۔ اور وہ اب،

جب کہا میں نے، کہاں شب کی مدارات گئی
ہنس کے وہ کہنے لگے رات گئی، بات گئی

کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں۔ اللہ، کراچی آکر، کیسے کیسے مخلص دوست اجنبی کے روپ میں آچکے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی پر اُن کا مطالعہ نہایت وسیع ہے، اُن کا مجموعہ شایع کر چکے ہیں۔ اور کچھ اور بھی شاید لکھ رہے ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ میں فقط اُن کی شادی میں شریک ہونے کی خاطر، حیدرآباد کا طویل سفر کر کے آگرے گیا تھا، اور ایک یہ زمانہ ہے کہ خود میرے جذبات بھی اس قدر مضمحل ہو چکے ہیں کہ آج تک اُن کے گھر نہیں جا سکا ہوں، اور، کراچی کی بدولت، بے اعتنائی کی تالی دونوں طرف سے بج رہی ہے۔

آج تک یاد ہے، مجھ کو وہ طوائف جو اُن کی شادی میں گا رہی تھی۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ جب اس کا فرا دانے، بڑی لٹک کے ساتھ: ''تامے کے پُرزے کرکے، قلم داں میں رکھ لیے'' پر بھاؤ بتایا تھا تو شاہ دل گیر نے کہنیاں مار مار کر، میری پسلیاں پھوڑا کر دی تھیں، اور مانی جائسی کے منھ سے رال ٹپکنے لگی تھی۔

مخمور کو قدرت نے، ادب و شعر میں، درجۂ اوّل کا آدمی بن جانے کی تمام صلاحیتیں عطا کی تھیں، لیکن افسوس کہ اُن کی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ لیکن اس کے باوجود، وہ آج بھی لاکھوں پر بھاری ہیں۔ جی میں ٹھان چکا ہوں کہ کسی دن، بے غیرتی لاد کر، اپنے اس بجھے ہوئے دوست کے پاس جاؤں گا، اور گلے لگاؤں گا۔

❁

اسرائیل احمد خاں

ہیں تو میرے ہم قوم پٹھان، مگر اس قدر رودھان کہ "میرزا" معلوم ہوتے ہیں، جسم ہی نہیں، انھوں نے مزاج بھی میرزایانہ پایا ہے ___ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیوی اگر چاقو یا چھری کو، باورچی خانے کے فرش پر رکھ کر بھول جاتی تھیں تو وہ دو دو دن تک اس بات پر بھوک ہڑتال کر دیا کرتے تھے کہ انھوں نے کام لینے کے بعد، چاقو یا چھری کو مچان پر کیوں نہ رکھ دیا، اور انہیں اس بات کا خیال کیوں نہ آیا کہ کوئی بچہ اُن آلات سے اپنی ناک یا گردن کاٹ کے رکھ سکتا ہے لیکن وہ احتیاط اور وہ سنک اب بہت کم ہو گئی ہے۔

ہر چند اُن کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے، لیکن مطالعہ و تفکر، اور اُن کی دماغی ساخت نے اُن کو وہاں پہنچا دیا ہے، جہاں بڑے بڑے ڈگری داروں کے پَر جلتے ہیں۔ اُس کے ساتھ ساتھ، وہ ایک خاص طرزِ تحریر کے بھی مالک ہیں، اُن کے مضامین و مقالات میں، لفظی و معنوی اعتبار سے اس قدر دل آویزی اور ژرف نگاہی پائی جاتی ہے کہ بڑے بڑے انشا پرداز اُن کے روبرو ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ "کلیم" میں لکھا کرتے تھے، اور جو حضرات "کلیم" پڑھتے رہے ہیں، وہ میرے اس دعوے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ افسوس کہ ان کو شہرت نصیب نہیں ہو سکی، اور ہوتی بھی تو کیوں کر کہ وہ ایسے خاموش اور خلوت نشیں انسان ہیں کہ جب تک، شدت کے ساتھ، مجبور نہ کر دیا جائے وہ گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے، اور برسوں قلم نہیں اُٹھاتے ہیں۔

جب وہ مسائلِ علمی پر گفتگو کرتے ہیں تو اُن کی باریک بینی کا لوہا ماننا پڑتا ہے، مگر، بدقسمتی سے، چونکہ اُن کی تربیت دین دارانہ ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے ان کی درایت پر روایت چڑھ بیٹھتی ہے۔

وہ پہلے مولانا ابوالکلام کے شیدائیوں میں سے تھے، اب سید ابوالاعلیٰ مودودی کے پرستاروں میں سے ہیں، اور یہ بیان کر کے خوش ہوا کرتے ہیں کہ میری بیوی مودودی کی کتابیں، اور نماز پڑھتی ہیں۔ اور جب اُن سے پوچھتا ہوں کہ آپ خود کیوں نماز نہیں پڑھتے، تو لاجواب ہو کر، مسکرانے لگتے ہیں۔

میرے، تقریباً نصف صدی کے پُرانے دوست ہیں، پہلے جس وضع پر دوستی قائم ہوئی تھی، اس وضع میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے۔ اور اُس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ باشندۂ کراچی ہونے کے باوجود، برابر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ جب میری سب سے پہلی تصنیف "روحِ ادب" چھپی تھی، انھوں نے اُس پر سب سے پہلے تبصرہ کیا تھا، حالاں کہ اُس زمانے میں وہ رنگون میں رہتے تھے، اور میری صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ ان کے تینوں بیٹے پائیلٹ ہیں۔ بیٹے آسمان پر اُڑتے ہیں، اور باپ، گھر کی زمین کو بڑے زور سے پکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں:

تو، کارِ زمیں را نکو ساختی؟ کہ بر آسماں نیز پرداختی

آغا حشر کاشمیری

وہ آسمان پر تھگلی لگانے والی ذہانت رکھتے تھے۔ اُن کی طبع رسا میں اس قدر زبردست تموج تھا گویا سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ اور، اُسی طرح، وہ اس بلا کے گھبدرے بھی تھے، کہ بڑے بڑے پھکڑ باز اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے۔

جن حضرات کی نظر سے اُن کا مسدس ''شکریۂ یوروپ'' گزرا ہے، وہ میرے اس خیال کی تائید کریں گے کہ اگر وہ ڈرامے میں نہ پھنس جاتے، اور شعر کہتے رہتے تو درجۂ اوّل کے شاعروں سے بھی آگے نکل جاتے۔ ان کی تھیٹریکل کمپنی جب لکھنؤ میں آئی تھی، میری مسیں بھیگ چکی تھیں، اور، پہلی ہی ملاقات میں وہ میرے بے تکلف دوست بن گئے تھے۔ میں اُس زمانے میں پیتا نہیں تھا، اور وہ میرا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ ایک روز، میں نے اُن کو اپنی ایک غزل سنائی، انھوں نے اُسے بے حد پسند کیا اور کہا اپنا تخلص ''شبیر'' بدل دیں، اور آپ کی غزل میں جو ولولہ پایا جاتا ہے، اُس پر نگاہ کر کے ''جوش'' تخلص رکھ لیں۔ میں نے اُن کا مشورہ قبول کر لیا۔

یہ کلکتے کا واقعہ ہے کہ ایک شام کو جب میں اُن کے وہاں پہنچا تو دیکھا وہ ساغر و مینا سے شغل کر رہے ہیں، اور اُن کے دو دوست بھی اُن کا ساتھ دے رہے ہیں۔ آغا نے یہ کہہ کر اپنے ان دوستوں کا مجھ سے تعارف کیا کہ ''دیکھیے جوش صاحب یہ میرے بائیں جو بارلیش دوست بیٹھے ہیں، یہ بنگال کے بہت بڑے سیاسی لیڈر ہیں، اور یہ میرے داہنے ہات پر جو بے ریش صاحب بیٹھے ہیں، یہ پنجاب کے بہت بڑے اسلامی شاعر ہیں، اس وقت تو یہ میرے ساتھ بیٹھے پی رہے ہیں، اور کل، صبح ہوتے ہی، یہ سالے ''اسلام اسلام'' کے نعرے لگانے لگیں گے۔

ایک بار ہم دونوں، لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات گئے اُن کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں، میں نے جا کر پوچھا تو وہ کہنے لگے ''یہ طوائف پینے سے انکار کر رہی ہے، میں ابھی اس کو رخصت کر دوں گا۔'' میں نے کہا ''اُس کے نہ پینے سے آپ کو کیا سروکار، انھوں نے کہا کیا میں اس قدر بدعقل ہوں کہ اس برف کی سل کو سینے سے لگا لوں۔ اور مر جاؤں''۔

۞

سیماب، اکبرآبادی

بڑے، جگت گرو قسم کے، استاد، اور نہایت مشہور و مشاق شاعر تھے، انھیں غزل، اور نظم، دونوں پر عبور حاصل تھا، اور اُن کے شاگرد، تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔
اپنے محبوب شاگرد، ساغر سے، اُن کو بے حد محبت تھی، وہ اُن کو لے کر ایک بار ملیح آباد آئے تھے، کئی روز تک بڑی دلچسپ صحبتیں رہی تھیں۔ اور اُس کے بعد، جب میں حیدرآباد میں تھا، وہ ساغر کے ساتھ، کوئی ڈیڑھ دو مہینے میرے یہاں ٹھہرے تھے، اور، اکابر دکن کی وساطت سے، میں نے اُن کے رسالے کی ترقی میں ہات بٹایا تھا۔ آگرے کی ''تائی کی منڈی'' کے نکڑ پر اُن کا دفتر تھا ''قصرِ ادب''۔ وہاں سے وہ ''شاعر'' نام کا ایک ماہ نامہ نکالا کرتے تھے۔ شاعری ''آؤ پیرو کچھ گھر سے لے جاؤ'' کی طرح آدمی کو برباد کر دیتی ہے، لیکن اُن کی شاعری اچھا خاصہ ذریعہ تھی معاش کا۔ وہ شاگردوں سے نذریں لیتے، اور سیکڑوں آدمیوں کو غزلیں اور نظمیں کہہ کہہ کر دیا کرتے اور اُن کا معقول معاوضہ لیا کرتے تھے۔ ہرچند وہ پیتے تھے، مگر، کانگریس کو خوش کرنے کی خاطر، جب انھوں نے کانگریس کی امتناعِ شراب کی احمقانہ تحریک میں شریک ہو کر، اپنے رسالے ''شاعر'' میں شراب کے خلاف لکھنا شروع کر دیا، اور میری بادہ خواری پر بھی چوٹیں کرنے لگے تو میں نے ''کلیم'' میں اُن کی اس روش کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اور وہ کھلم کھلا میری مخالفت پر اُتر آئے تھے۔[۱]

---

[۱] اس سلسلے میں سیماب صاحب کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ بلکہ یہ سب دشنام، اور اصطبل کا یہ لیتا دو ہم ''شعرائے'' ہند کی آبائی میراث، اور ہمارا قومی شعار اور دینی فریضہ ہے۔ ہمارے علاوہ، تمام روئے زمین کے شعراء، ایک دوسرے کی قدر اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، لیکن ایک ہم بدبخت ہیں کہ ہمارے یہاں برابر جوتم پیزار ہوتی، اور جوتیوں میں دال بٹا کرتی ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاعروں کے سینوں میں تو پیمبروں کا دل دھڑکتا رہتا ہے، لیکن یہ پیمبر کس قسم کے ہیں جو آپس میں دولتیاں چلاتے، اور ایک دوسرے پر دو خیاتے رہتے ہیں۔ شاید یہ تمام لوگ فقط قوافی کے چڑی مار، اور، شاعر ہونے کے عوض، نرے تگیے ہیں۔ لیکن جب میں پنجاب اور بنگال پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اس نوعیت کی کمینگی نہیں پاتا، ان دونوں صوبوں کے شعراء، ایک دوسرے کو بڑھاتے، اور بعض اوقات، اپنے کسی محبوب شاگرد کو فروغ دینے کی خاطر، پوری قوم ایک متحدہ پلیٹ فارم پر آکر، اس کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتی ہے۔ ہم اس قدر گھٹیا اور اہل بنگال و پنجاب اس قدر گمبھیر کیوں ہیں، یہ ایک بڑی طولانی بات ہے، اور اس سوال کا جواب مل سکتا ہے اُن تہذیبی، نفسیاتی اور تاریخی اسباب و علل میں، جو اس فٹ نوٹ میں سما نہیں سکتے ہیں، اور سردست تو: ''اے روشنیِ طبع تو برمن بلا شدی'' کے علاوہ، اور کچھ عرض نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن وہ ساری نوک جھونک عارضی تھی، اور، تھوڑے دن کی کشیدگی کے بعد، ہم دونوں میں پھر وہی اگلا سا خلا ملا پیدا ہو گیا تھا۔☆

وہ جب پاکستان جا رہے تھے تو دہلی آکر غریب خانے ہی میں ٹھہرے تھے، اُن کا خیال تھا کہ وہ قرآن کا منظوم ترجمہ فروخت کر کے، پھر ہندوستان آ جائیں گے، لیکن اسباب کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ پھر وہ پاکستان ہی میں رہ پڑے۔

میں اُن کی زندگی میں جب دہلی سے، کچھ دن کے لیے، پاکستان آیا تھا، اُس وقت وہ سخت بیمار اور بے حد پریشاں روزگار تھے۔ اور، دور دور تک یہاں کوئی ان کا پوچھنے والا نہیں تھا۔ انھوں نے، بسترِ مرض سے، جس طرح میری طرف نگاہ اُٹھائی تھی، وہ نگاہ، مجھ نامراد کے سینے میں، آج تک برچھی کی طرح چبھی ہوئی ہے۔ اور جب اُن کی نگاہوں نے کہا تھا کہ: "نہ مونسے، نہ رقیبے، نہ ہم دمے دارم" تو اُن کی اُس بے کسی پر میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ اب وہ اسی کراچی میں ابدی نیند سو رہے ہیں اور دنیا اُن کو بھلا چکی ہے:

بر مزارِ ما غریباں، نے چراغ، نے گُلے!

اُن غریب کا فرزند، منظر، دق میں مبتلا، اور کروڑ پتیوں کے اس غدار شہر میں، بے یار و ناصر پڑا ہوا، ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اُس بے چارے کے سامنے موت منھ کھولے کھڑی ہے، اور پشت پر کوئی مددگار نہیں ہے۔ وہ جس کسی نے کہا تھا:

بیٹھ جاتا ہوں، جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

اس شعر کا دوسرا مصرعہ تو منظر کے حسبِ حال ہے، لیکن وہ پہلے مصرعے سے محروم ہے، اس لیے کہ اُس غریب کو "گھنی چھاؤں" بھی میسر نہیں۔

☆ یہ جوش صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اسے تھوڑے دن کی کشیدگی قرار دے رہے ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کے رسالے 'شاعر' اور جوش کے ادبی جریدے 'کلیم' میں ان تلخ مباحث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ کلیم کی ۱۹۳۸ء کی پرانی فائل میں شمارہ ۷، ۸، اور ۹ میں اسی معرکہ آرائی کے نشانات موجود ہیں۔

ساغر نظامی

ہائے کیا بتاؤں ساغر کیا تھے:

اُن کا مکھڑا تھا، رشکِ ماہِ تمام
یا مئے ناب کا چھلکتا جام
سر پہ ، راتوں کے شامیانے تھے
انکھڑیوں میں، شراب خانے تھے
لب تھے ، پچھلے پہر کی شہنائی
لوچ میں ، بھیرویں کی انگڑائی
جب صبا ، عارضوں کو دھوتی تھی
صبح نرما ، طلوع ہوتی تھی

میں، اُن پر ایک پوری نظم کہہ دیتا، مگر کیا کروں، دسمبر کا پچھلا پہر ہے، اور، سردی ہڈیوں میں چبھ رہی ہے۔ اس لیے اس قدر عرض کروں گا کہ اُن کے چہرے میں، ایسی مقناطیسی جاذبیت تھی کہ:

جس نے ، نظر اُٹھائی ، نظر ، رُخ پہ ، گڑ گئی
گویا ، ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

وہ، میرے ہم قوم، یعنی پٹھان ہیں، نام ہے ان کا بڑا خوف ناک، یعنی صمد یار خاں۔ ذرا سوچیے تو ایک گل اندام، اور صمد یار خاں نام۔ یہ اضداد کا انضمام، یا رب ذوالجلال والاکرام۔ ہائے رام، ہائے رام!

ہم دونوں برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہ چکے ہیں، میں آج سے نہیں، ایک لاکھ برس سے اُن کا ناز بردار ہوں، اور کہہ سکتا ہوں کہ:

حریفِ بزم تو بودم ، چو ماہِ نو بودی
کنوں کہ ماہِ تمامی ، نظر دریغ مدار

وہ، بے حد محبت کے آدمی ہیں۔ لیکن، چوں کہ پٹھان ہیں، اس لیے اُن میں دو بڑے عیب بھی ہیں۔ یعنی شدید

بدگمانی، اور غصے کی فراوانی۔ اس لیے وہ کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے۔
میرے پاکستان آجانے کے بعد، اُن کے دل میں، میری طرف سے یہ بدگمانی پیدا ہوگئی تھی کہ مہاجرت کے وقت جوش نے اپنی جانشینی کے لیے عرش ملسیانی کا نام پیش کیا، اور، جان بوجھ کر مولانا ابوالکلام کے سامنے میرا نام نہیں لیا۔
انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ عرش میرے نائب تھے، میں مولانا سے نہ بھی کہتا، پھر بھی، ازروئے قواعد، انھیں کو میرا جانشین بنایا جاتا۔ اور اس بدگمانی کی بناء پر، انھوں نے، میرے خلاف ہندوستان میں ایک زبردست تحریک چلادی، اور، مجھ کو بُرا بھلا، اور غدار تک کہنے لگے۔ لیکن میں نے اُس کی مطلق پروا نہیں کی، جب بھی ہندوستان گیا، دوستوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا کہ میں اُن سے نہ ملوں، میں نے کسی کی بات نہیں مانی، اور ہر بار اُن سے جا کر ملا۔ اور بار بار ملتا رہا۔ لیکن۔ میرے اس خلوص کا اُن پر اثر نہیں ہوا، اور اپنے گھر بلانا تو درکنار وہ ایک بار بھی بازدید کے لیے نہیں آئے۔ لوگوں نے اس بات کے مجھ کو طعنے بھی دیے، مگر میں ہر سفر میں اُن سے ملتا رہا۔
آخر کار میری بے لوث محبت نے اُن کے دل پر اثر کیا، اور اس بار ۱۹۶۷ء میں جب ہندوستان گیا، تو انھوں نے رات کو اپنے گھر مجھ کو بلایا، شراب پلائی اور کھانا کھلایا، اور مرا دل اس قدر کھل گیا کہ میں، کانوں پر ہات رکھ کر قوالی سنانے لگا:

قیامت میں، تجھے شرمندہ کافر کون دیکھے گا
وہ محشر تو بھگت لیں گے، یہ محشر کون دیکھے گا

ارے ہاں ''کون دیکھے گا، یہ محشر کون دیکھے گا، ارے خواجہ۔ قیامت میں تجھے شرمندہ کافر کون دیکھے گا، آ ہے وا ''کون دیکھے گا'' ''کون دیکھے گا'' ۔ ہائے خواجہ۔ کون دیکھے گا۔''
میری اس چار بیت نما قوالی سے وہ اور ان کا سارا گھر لوٹ پوٹ ہوگیا۔
''ساغر تم میرے سب سے زیادہ بے تکلف دوست ہو، آئندہ ایسی بدگمانی کروگے تو اُلٹا لٹکا دوں گا۔
ارے ہاں کون دیکھے گا''

جمیل مظہری

اس قدر جھانکڑ سے ہیں کہ اُنھیں دیکھ کر، یہ پوچھنے کو دل چاہتا ہے کہ ارے بھائی یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر چند، وہ ہیں تو بالکل جوا مرج، مگر اس قدر تیز کہ خدا کی پناہ۔ شاید "بقامت کہتر و بہ قیمت بہتر" انھیں کے لیے کہا گیا ہے۔ بڑے بڑے ذہین آدمیوں کی ذہانت اُن کی ذہانت کے مقابلے میں ایسی معلوم ہوتی ہے، جیسے چاکو کی باڑھ، جیلٹ بلیڈ کی دھار کے سامنے۔

وہ نہایت اچھے شاعر، اور نہایت گہرے مفکر بھی ہیں، اور کردار میں اس قدر استقامت ہے کہ پہاڑ جگہ چھوڑ سکتے ہیں، مگر وہ اپنے موقف سے جنبش نہیں کر سکتے۔☆ وہ پٹنے کے رہنے والے ہیں، اور وہیں کسی کالج میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ معاش کے معاملے میں تو متعدد قناعت شعاروں کو دیکھ چکا ہوں، لیکن شعر سنانے کے معاملے میں قناعت شعار، اُن کے سوا اب تک کوئی میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ وہ، دوسروں کے شعر سننے میں حاتم، لیکن اپنے شعر سنانے میں قارون، بلکہ قارون کے بھی ابا جانے جاتے ہیں، اور جب تک اُنھیں اس کا یقین نہیں ہو جاتا کہ اُن سے شعر سنانے کی فرمائش کرنے والے ایسے بکٹ ہیں کہ اگر میں نے سنانے میں تامل کیا تو وہ سب لوگ مل جل کر مجھ کو مارنے پیٹنے پر طیار ہو جائیں گے۔ اُس وقت تک شعر سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے......................

☆___ جوش صاحب اپنے معاصرین میں گنتی کے جن شعراء کو بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اُن میں جمیل مظہری کے نام کو ہم صفِ اوّل میں رکھ سکتے ہیں۔ جوش صاحب اُنھیں عموماً علامہ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے اُن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ----- 'میرے خطوط کے جوابات ہضم کرنے والے علامہ، آپ کا یہ نسلاً پٹھان اور طبعاً سید عاشق آپ کے خط کا جواب دے، اور شبِ وصلِ غیر کاٹ رہا ہے___' (سہ ماہی، کائنات، ہدایت گڑھ کلکتہ، جمیل مظہری نمبر، ۱۹۸۲ء ص:۵۰۳) جمیل مظہری کو اس بات کا گلہ تھا، جس کا تذکرہ مقدمے میں کیا جا چکا ہے کہ جوش نے انھیں یادوں کی برات میں بقول اُن کے نظر انداز کر دیا لیکن اب ان گمشدہ اوراق کی دریافت و دستیابی کے بعد ان کا شکوہ درست نہیں رہا۔

مولوی غیاث الدین

گورے چٹے، موٹے تازے، لکھنؤ کے باشندے، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کے غالباً چچا، حیدرآباد دکن کے صاحب جائے داد و متمول وکیل، اور ستر بہتر کی عمر کے باوجود ہر شب کو، طوائف کے مجرے کے بغیر، تکیے پر سر رکھنے کو حرام سمجھنے والے بزرگ تھے۔
وہ کہتے تھے کہ تماش بینی، ہم سے مردانِ خدا کا کام ہے، آپ لوگ طوائف کو دل دے بیٹھتے ہیں، اور تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں، میں اُس کو فقط جسم دیتا ہوں، دل اُس کے حوالے نہیں کرتا۔
آپ دل سمیت، اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں فقط اپنے جسم کو لے کر اُس کے مکان میں داخل ہوتا ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ جب پہلے پہل وکالت کرنے حیدرآباد آیا تھا، تو صحنِ عدالت میں، ٹاٹ بچھا کر، بیٹھا کرتا تھا، اور آج لاکھوں وکیلوں سے بہتر ہوں۔
ہر رات کو اُن کے وہاں جشن ہوا کرتا تھا۔ اور ہفتے میں تین چار روز ہم لوگ، یعنی سید امین الحسن صاحب بسمل، نواب اصغر یار جنگ بہادر بیرسٹر، مفتی نور الضیا والدین اور حکیم آزاد انصاری وغیرہ، اُن کے وہاں جاتے، اور آدھی رات تک لطف اُٹھاتے تھے۔
اُن کی مخصوص طوائف کو، پیار سے "نھو" کہا جاتا تھا[1] اُس کی صورت بھی دل فریب تھی، اور گانا بھی لاجواب تھا۔ ایک روز میں اُن کے وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ، بڑی سراسیمگی کے ساتھ، اپنے صحن میں ٹہل رہے ہیں، میں نے پوچھا

---

[1] ایک بار، اُس پری جمال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے اپنی بُراں نگاہیں اُس کے سینے میں اُتار دی تھیں، اور وہ، کانٹا کھائی ہوئی مچھلی کے مانند، تڑپ کر رہ گئی تھی، اور اُس نے مجھے اپنے گھر بلا کر مجھ سے کہا تھا، جوش صاحب اپنا پیشہ ترک کر کے اب آپ کی ہو جانا چاہتی ہوں، اماں کو بھی میں نے راضی کر لیا ہے۔ میرے پاس اس قدر روپیہ اور زیور ہے کہ میرا بار آپ پر نہیں پڑے گا۔ صد حیف کہ اب یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اس دنیا میں ہے بھی کہ نہیں، ہائے کتنے قرب ایسے بُعد میں بدل جاتے ہیں کہ فریقین کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ اگر وہ زندہ ہے تو کوئی اللہ کا بندہ، اُس تک میرا سلام پہنچا دے۔

''خیر تو ہے مولوی صاحب''
انہوں نے کہا
''خیر نہیں، نھنو کو بخار آ گیا ہے، وہ آج نہیں آسکے گی مجھ پر ایسا بُرا وقت پڑ گیا ہے کہ ایک دوسری طوائف کو بلایا ہے''
میں نے کہا
''یہ تو نھنو سے بے وفائی کر رہے ہیں آپ''
انہوں نے جواب دیا،
''لیکن کیا کروں، مجرا سنے بغیر تو میں جی ہی نہیں سکتا''۔
اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مولوی صاحب گانے بجانے کے کس قدر رسیا تھے۔ اور اُن کے نزدیک مجرا ایک ایسا فریضۂ حیات تھا، جس سے روگردانی کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔

ترا، عہد یست با جاناں، کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا دارائے کویش را، جو جانِ خویشتن دارم

ایک رات کو اُن کے غسل صحت کا جشن ہو رہا تھا، اور جب نھنو نے یہ غزل،
''رسیلی کٹیلی اداؤں نے مارا''
چھیڑی تو اُنھوں نے، اُس کی آواز میں آواز ملا کر، خود بھی، لہک لہک کر یہ شعر گانا شروع کر دیا:

ابھی اور جیتا، مریضِ محبت
طبیبو، تمہاری دواؤں نے مارا

گاتے گاتے اُن کو ذرا سی کھانسی آئی، اور، نہ جانے کیوں، اُن کے کھانستے ہی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ اُن کی آخری رات ہے۔
اس خیال کے آتے ہی، میں نے اپنے پر، دل ہی دل میں، سخت ملامت کی کہ یہ کیسی بدشگونی کی بات ہے کہ اُن کے گھر میں اُن کے غسل صحت کا جشن ہو رہا ہے اور ایک بڑے جشن کی طیاری ہو رہی ہے، اور میرے دل میں اس قدر ہولناک خیال پیدا ہو رہا ہے۔ ہو نہ ہو، یہ ضرور کوئی شیطانی وسوسہ ہے۔
اور جب آدھی رات کو محفل برخواست ہوئی تو میں، اُن کو گلے لگا کر، رخصت ہوا، اور اپنے گھر آ کر سو رہا۔
ابھی صبح طالع نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے میرا پھاٹک کھٹکھٹایا،
میری آنکھ کھل گئی،
دل دھڑ دھڑ کرنے لگا، ''میں نے کہا سخاوت دیکھ کون آیا ہے''۔

سخاوت نے آ کر بیان کیا:

''وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ رات کے تین بجے مولوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔[1] ''اور یہ سنتے ہی میں، کلیجہ پکڑ کر رہ گیا۔ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

[1] — کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض اوقات، وہ کیا ہوتا ہے کہ انسانی دماغ کو مستقبل کے واقعات کا، خود بخود علم ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس واقعے کو محض ایک امرِ اتفاقی سمجھ لوں، تو اُس کے بعد بھی جو اس نوعیت کے چند واقعات گزرے ہیں، اُن پر کیا رائے قائم کروں، ایک بار حیدرآباد دکن میں ایک نہایت خوبصورت مکان تعمیر ہوا تھا، اور جب کبھی، دفتر آتے جاتے، میری نگاہ اُس کے زینے پر پڑتی تھی میرا تصور دیکھنے لگتا تھا کہ ایک جنازہ اُس زینے سے اُتارا جا رہا ہے، اور ایک مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد، جب میں اُس مکان کے سامنے سے گزرنے لگا تو دیکھا کہ سچ مچ کا ایک جنازہ اُسی زینے سے اُتارا جا رہا ہے اسی طرح زیبا [ردولوی] صاحب مرحوم کی بیوی جب بیمار پڑیں تو میرزا عالم گیر قدر نے مجھ سے کہا چلیے زیبا صاحب کے وہاں جا کر یہ پوچھیں کہ اب اُن کی بیوی کیسی ہیں، میں نے کہا چلیے، لیکن پرسوں اُن کا انتقال ہو جائے گا، میرزا صاحب نے کہا آپ کو ایسا نہ کہنا چاہیے، میں نے کہا سب اُن کی بیوی کے مر جانے کے تمنائی ہیں، میں تو چاہتا ہوں کہ وہ سو سال جئیں، مگر ہاتفِ غیب کہہ رہا ہے کہ وہ پرسوں انتقال کر جائیں گی، اور یہی ہوا کہ وہ ''پرسوں'' انتقال کر گئیں۔ اور خود زیبا، مرنے سے ایک دن پہلے میرے وہاں آئے تھے، انھوں نے جب میری بیوی سے یہ کہا تھا کہ بھابی آپ میرے حق میں دعا کریں۔ اسی وقت میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا کہ وہ کل تک زندہ نہیں رہیں گے۔ یہ ساری باتیں کیا ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔

حکیم خواجہ شمس الدین

لکھنؤ کے، کشمیری النسل، باشندے، عربی و فارسی اور طب کے عدیم النظیر، شہرہ عالم، "نامی پریس" کے مالک، دراز گفتار، بُرودت مآب، بشاشت بُریدہ، اور، تا حدِ ماتم، تقشف گزیدہ۔ اور پھر بھی،، اعلیٰ درجے کے سخن سنج۔ اس قدر دُبلے کہ گالوں میں گڑھے، اور، آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے۔ پنج وقتہ وضو کے چھینٹوں کے باوجود، بے رنگ و بے آب داڑھی، مزاج، مئی جون کی دوپہر، اور شیشم کے، دھوپ کھائے ہوئے، بُرادے کے مانند خشک اور کھڑ نک۔

۱۹۰۸ء سے میرے جگری دوست ہیں اُس وقت، میں حسین آباد ہائی اسکول اور وہ فرنگی محلی کے مکتب میں پڑھتے تھے۔ میرا قیام تھا نخاس میں، اور وہ، میرے پچھواڑے، کٹرۂ ابوتراب خاں میں رہتے تھے۔ اور ہر روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ بے حد کٹر سُنّی تھے اور آج بھی ہیں، اور میں بے حد کٹر شیعہ تھا۔ میری اُن کی، گھنٹوں، بڑی گرما گرم، بحثیں ہوا کرتی تھیں، لیکن اُس کے باوجود، جب میری شیعیت یا یوں کہیے کہ میری رافضیت کی بناء پر، میری بیوی کے تنسیخ نکاح کا "مقدمہ" چلا تھا، انھوں نے میری موافقت میں گواہی دی تھی۔ اور اُس کا، عدالت پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔

اگر میں سر پر چودہ قرآن رکھ کر یہ کہوں کہ ایک زمانے میں وہ بے حد حسین تھے، تو اُن کی موجودہ ہیئت و صورت دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ میں کیسے بتاؤں کہ اُن کی صورت کا کیا عالم تھا۔ اُن کے چہرے کے رنگ کی وہ کیفیت تھی کہ جب میں ان کو دیکھ کر، اُن کے کمرے کی چھت میں لگی ہوئی رنگین ہانڈی کی طرف نگاہ اُٹھاتا تھا، تو وہ پھیکی پھیکی سی نظر آنے لگتی تھی۔

اے میرے، خوفِ خدا سے پریدہ رنگ دوست، اب تم سے زیادہ پُرانا میرا کوئی یار نہیں ہے ____ جیو، اور، کم سے کم، مجھے مار کر، مرو۔

مولوی سید اختر علی، تلہری

عربی، فارسی اور دینیات کے ایسے متبحر وجید عالم کہ بڑے بڑے علما و مجتہدین اُن کے سامنے بونے معلوم ہوتے ہیں۔ ہر چند بڑے راسخ العقیدہ مومن ہیں، مگر نماز، روزے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دین کے صدہا اصول کو تسلیم نہیں کرتے اور جب اُن کی فکر اُن کو بغاوت پر اُبھارتی ہے تو وہ دین کے بڑے بڑے حاکموں، بڑے بڑے مجسٹریٹوں، بڑے بڑے سیشن ججوں، اور بڑے بڑے ہائی کورٹ کے ججوں کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن چوں کہ دین گھٹی میں پڑا ہوا ہے، اس لیے جیسے ہی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی عدالت میں بار پاتے ہیں، بھڑ بھڑا کر، سجدے میں گر جاتے ہیں۔

میں اپنے تمام دین دار دوستوں کے چہروں کا مطالعہ کر چکا ہوں، اور میرے سامنے اپنے دوست حکیم شمس الدین کا چہرہ بھی ہے، جس کو دیکھ کر، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دہشتِ عذابِ قبر، ہیبتِ شورِ صور، وحشتِ میزانِ حشر، خوفِ نارِ دوزخ، اور جاں گسل خشیتِ الٰہی کی بناء پر، اربابِ یقین کا خون خشک ہو جاتا ہے، اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، اور چہروں پر، تپتا ہوا ریگستان بولتا رہتا ہے۔ اور، اُسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ یہ لوگ، دَر پردہ بے حد عیاش ولذت پرست بھی ہوتے ہیں، اس لیے، تھر تھر کانپتے رہتے ہیں اس ڈر سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جنت میں نہ جانے پائیں، اور حور و قصور و نور و انگور و طہور سے محروم ہو کر رہ جائیں، اور اس بناء پر اُن کے تمام نشاطی ولولے بھدرا کر رہ جاتے ہیں۔

لیکن مولوی تلہری کی شگفتہ روئی اور شادابیِ مزاج کو دیکھ کر، حیرت ہوتی ہے، اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ صورتِ حال نتیجہ ہو اُن کی ناتوانائی ایمان وتوانائی فکر کا۔ وہ فقط ہشاش بشاش ہی نہیں، اُن کی شعرفہمی کا بھی یہ عالم ہے کہ شعر سنتے ہیں، اس شعر کے تمام تاثرات ونکات، اُن کی آنکھوں کے رنگ میں گردش کرنے لگتے ہیں، اور شعر سنانے والے کا دل، اُن کی پلکوں کی چھاؤں میں دھڑکنے لگتا ہے۔

مولانا اختر علی، صد حیف کہ ۱۹۶۷ء کے آخری سفر میں آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی، آپ کی ہستی کا تاج محل، اپنے وطن شاہ جہاں پور گیا ہوا تھا۔ اگر، بخت جانی کی بدولت زندہ رہا، اور ہندوستان جانے بھی دیا گیا تو، جی بھر کر، آپ کو سینے سے لگاؤں گا۔ ورنہ، آپ کے دیدار کی تمنا لیے ہوئے مر جاؤں گا۔ احتیاطاً سلام آخر کر رہا ہوں۔

سید علی عباس، حسینی [1]

بہار کے باشندے، لکھنؤ میں مقیم، دراز قامت، شگفتہ جبیں، جامعِ ادب، بے نظیر افسانہ نگار، بے حد مخلص انسان اور بڑے پیارے دوست ہیں۔ متعدد کالجوں کی پروفیسری کے بعد، اب پنشن خوار ہو کر بڑی خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جتنا جتنا سن ڈھل رہا ہے، اتنی اتنی ان کی لیاقت پھبکتی چلی جا رہی ہے۔ اور علم و حلم میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے، اب لکھنؤ میں رہ کون گیا ہے، بس یہی چند آخری نفوس، یعنی میرزا جعفر حسین، مولوی محمد رضا فرنگی محلی، پروفیسر مسعود حسن، مولوی اختر علی، آنند نرائن ملا، اور علی عباس حسینی رہ گئے ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

یادش بخیر، وہ ایک زمانے میں بڑے انجمن آرا، صاحب مدارات اور بشاش آدمی تھے، کم بخت بڑھاپے نے اُن کے یہ اوصاف اُن سے چھین لیے ہیں۔ اب نہ انجمن آرائی ہے، نہ مدارات، نہ بشاشت۔ رہے نام اللہ کا۔

اللہ، عمر کے پھیلاؤ، معاش کے بچاؤ اور اعضاء کے ٹھہراؤ سے بچائے۔ ہائے کیا بلبلِ ہزار داستاں، خاموش ہو کر رہ گیا ہے۔

[1] افسوس کئی مہینے ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔

سید احتشام حسین

کھلتا رنگ، اوسط قامت، ارغنوں لہجہ، وسیع المعلومات، روشن دماغ، صاحب طرز، اور دراک نقاد۔☆ قدرت نے اُن کو شاعری کا جوہر بھی عطا کیا ہے، لیکن ذوقِ رندی اور حوصلۂ گناہ کا فقدان، اُسے اُبھرنے کا موقع نہیں دے رہا ہے۔ اس لیے اپنے جوہرِ شاعری کی نکاسی کے لیے وہ انتقاد کے میدان میں آگئے ہیں۔ اس میدان میں، کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، دو ایک کے سوا، اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، اور دو ایک بھی کیا؟ ____ غلط قسم کے قارئین کو، بیرونی ممالک کے ادیبوں کا نام لے لے کر، خالی مرعوب کیا کرتے ہیں۔ اور بس۔ میرے زمانے میں وہ لکھنؤ یونی ورسٹی کے اردو پروفیسر تھے، اب الٰہ آباد یونی ورسٹی میں ہیں۔ میں، جب، یادش بخیر جنتِ لکھنؤ میں رہتا تھا، وہ تقریباً روز میری صحبتِ شبانہ میں شریک ہوتے، لیکن، شرمائی کنواریوں کے مانند، ساغر و مینا سے دور بیٹھ کر، لطف اُٹھایا کرتے تھے۔ اور، جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں، اُسی لڑکیوں کی سی شرماہٹ نے، اُن کی شاعری کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔

انھوں نے، خیر سے، کبھی، جوان عورت کو دیکھا ہی نہیں تھا، اور دیکھا بھی ہوگا، تو، دوبارہ نظر اُٹھانے کی ہمت ہی نہیں پڑی ہوگی۔ اور اس زن بیگانگی کے عالم میں، جب نکاح کے بعد، انھوں نے ایک جوان عورت کو اپنے حجلۂ عروسی میں دیکھا، تو اُس کو دیکھتے ہی، اُس پر لٹو ہوگئے، اور، اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ اُس جوان عورت کا باپ دروازے پر ڈنڈا لیے نہیں کھڑا ہوا ہے، اُن کی زبوں ہمتی، مرغوں کی طرح، بانگ دینے لگی ایک بار ایسا ہوا کہ تقریباً چار پانچ روز تک وہ میرے پاس نہیں آئے، میرا ماتھا ٹھنک گیا کہ ہو نہ ہو، میکے سے اُن کی بیوی لکھنؤ آگئی ہیں، میں نے اُسی وقت چند شعر کہے اور جب وہ، طویل غیر حاضری کے بعد، ستے ہوئے منہ، اور ملگجی آنکھوں کے ساتھ آئے، تو میں نے وہ شعر اُن کو سنا دیے، جن کا ایک شعر یاد ہے:

☆ ____ اس سوال کے جواب میں کہ اردو شعر و ادب کے ناقدین میں سب سے افضل آپ کے قرار دیتے ہیں جوش صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کا نام لیا (مکالماتِ جوش و راغب، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، کینیڈا، ص ۴۲)

ہو نہ ہو، لکھنؤ میں اے ہم راز   زوجۂ احتشام آ دھمکیں ☆

میرے اشعار سن کر، وہ حیران ہو گئے، اور کہا "یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہو گئی" میں نے کہا "وہ کون ایسی بات ہے جو مردانِ خدا کو معلوم نہیں"۔ وہ، بڑی محبت اور، بڑے خلوص کے آدمی ہیں، اور اُن میں اس قدر قوتِ انتقاد ہے کہ آگے چل کر، وہ لاکھوں مشہور شعراء کا پول کھول کر رکھ دیں گے، اور ہزاروں گم نام شاعروں کے سر پر شہرت کا تاج رکھ دیں گے۔ لیکن جب وارداتِ عشق کی شاعری کے میدان میں آئیں گے، تو اُن کے قدم ڈگمگا جائیں گے، اس لیے کہ وہ اس کوچے سے، بہو بیٹیوں کی طرح، ناواقف ہیں۔

شاعری کے لیے نہیں، نقاد کے واسطے بھی یہ ایک لازمی شرط ہے کہ وہ میدانِ چہار کافی، یعنی "کتاب"، "کیف"، "کاکل" اور "کائنات" سے گزر چکا ہو۔ میاں احتشام اس منزل میں ادھورے سے ہیں، کتاب کائنات کا مطالعہ تو انھوں نے ضرور کیا ہے، لیکن "کیف و کاکل"، سے آگاہ نہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ خیر، کیف کا تو نہیں، لیکن اپنی بیوی کی وساطت سے "کاکل" کا مطالعہ کر چکا ہوں، تو میں یہ کہہ کر ان کو حیرت میں ڈال دوں گا کہ صاحب زادے، بیوی، خواہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو، اُس کے پاس "کاکل" کی دولت ہوتی ہی نہیں، اُس کے سر پر تو صرف جھونٹے ہوتے ہیں۔

☆ جوش صاحب کو صرف یہی ایک شعر یاد رہا جبکہ یہ گیارہ اشعار کی نظم تھی اور بہت ہی شکستہ خط میں پنسل سے لکھی ہوئی پرچے پر، احتشام حسین کے پاس موجود تھی۔ اس نظم کو احتشام صاحب نے ماہنامہ افکار جوش نمبر (۱۹۶۱ء) میں اشاعت کے لیے صہبا لکھنوی صاحب کو روانہ کیا تھا۔ نظم کے گیارہ اشعار یہ ہیں:

کل نہ آئے جو احتشام حسین   دل میں غصے کی بدلیاں گرجیں
اُن کے اس اوّلیں تمرّد پر   ہو گئی روحِ شعر چیں بہ جبیں
میرے فرمان پر نہ حاضر ہو   روحِ عالم کی یہ مجال نہیں
لیکن انسان، نا سزا انساں   کتنی شدت سے ہے شریر و لعیں
یہ خیال آتے ہی مرے سر میں   زلزلے آئے، بجلیاں کڑکیں
بسترِ غیظ و فرشِ حسرت پر   دل نے رو رو کے کروٹیں بدلیں
سازِ شیریں میں آ گئی تلخی   بادۂ تلخ بن گیا شیریں
اُڑ گیا رنگِ ساغر و مینا   بجھ گئی آتشِ مہ و پرویں
تھا یہ عالم کہ دفعتاً اے جوش   آئی ہاتف کی یہ صدائے حزیں
کہ نہ ہو احتشام سے ناخوش   اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں
ہو نہ ہو لکھنؤ شریف میں آج   زوجۂ احتشام آ پہنچیں

نظم کے آخر میں ۱۰ر مارچ ۱۹۴۰ء، صبح ۳ بجے کا وقت و تاریخ درج ہے۔ جوش صاحب کو جو شعر یاد رہ گیا تھا اور جسے انہوں نے نقل کیا وہ اس نظم کا آخری شعر ہے، جس میں قافیہ بدلا ہوا ہے۔

یونس سلیم

رہنے والے ہیں "یوپی" کے، تعلیم پائی ہے حیدرآباد دکن میں ۔ جہاں وکالت کے پیشے میں اس قدر نام پیدا کیا کہ اب سرکار ہند میں نائب وزیر قانون کے عہدے پر فائز ہیں۔
اُن کی تعلیم کا زمانہ اس قدر شدید عسرت میں گزرا کہ اُن کی جگہ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو آوارگی اختیار کر کے، ٹیکسی بن جاتا، لیکن داد دینا پڑتی ہے اُن کے ذوقِ علم، اُن کی بلند حوصلگی اور اُن کی عقلِ سلیم کی کہ انھوں نے اُن نامساعد حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور، بی اے، ال ال بی کر کے چھوڑا۔
جب وکالت کے توسط سے دولت ہات آئی تو رنگ رلیاں کرنے لگے، اور سیکڑوں پری جمالوں کو اپنی دولت، اپنی صورت، اور اپنی جوانی کے دام میں پھنسالیا۔
یادش بخیر جب دہلی میں آتے، حسینوں کو بلاتے، پہلو میں بٹھاتے، اور، راتیں جگاتے تھے۔ شراب کو انھوں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا، لیکن رندی سے کبھی ہات نہیں اُٹھایا۔
لیکن جب جوانی ڈھلی تو آبائی عقائد، اور گھر کے ماحول نے، بُری طرح دبوچ لیا، اور اس زور سے دبوچا کہ میاں چیں چیں کرنے لگے۔ "معاصی" یعنی جینے کے حوصلے، اور آدم کی سُنت سے توبہ کر لی، گلووؤں پر حاجی بخش اللہ کی سی داڑھی اُگالی۔ کوئے بتاں کی اچھل کود چھوڑ کر، سجادے پر، اوندھے منھ گر پڑے، پائے خوبان سے جبیں ہٹا کر، مصلے پر رکھ دی، خوبانِ شہر کی گھنیری زلفوں کے چھاؤں سے، جست کر کے، تقوے کی کڑی دھوپ میں آبیٹھے، بیچوں سے منھ پھیر کر، پیش نمازوں کے پیچھے آن کھڑے ہوئے، اور، مجھ رندِ جہاں سوز کی بارگاہ میں آ کر، اور چھوٹی سی داڑھی کھجا کھجا کر، تلقینِ اسلام فرمانے لگے۔
اُن کی اس تمسخر انگیز ہیئت وقلب ماہیت پر میں نے، قلم برداشتہ جو شعر، گزشتہ سال کہے تھے، وہ بھی سن لیجئے:

کل ، شبستاں میں تھا ' ہا ہا ہا '
اب ہے چولھے پہ سر بسر 'کھد بد'

یوں ، وظائف نے کر دیا گم سُم
بھول بیٹھا 'بہاگ ' اور 'دُھرپد'

کل تھی ، فرشِ حرم پہ 'تا تا دھن'
اب ، لبوں پہ ہے مستقل 'ہُو ہُو'

آج وہ مرغِ شیخ سدّو ہے
کل ، سلیمان کا جو تھا ہُد ہُد

کل ، دیارِ صنم میں تھا مدہوش
اب ، حریمِ صمد میں ہے بیخود

یوں ہوا غرق دیں کہ آخرِ کار
یونس، اندر دہانِ ماہی خُود!

لیکن اس قدر مُلّا بن جانے کے باوجود، اس شخص کی شرافت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے، وہی محبت ہے، اور وہی اخلاص ۔اور مجھ رندِ نامہ سیاہ کا تو یہ رندِ ماضی وملائے حال اس قدر پکا دوست ہے کہ جب میں ۱۹۶۷ء میں ہندوستان گیا تھا، تو یہ اللہ کا بندہ، اپنے سارے کام چھوڑ کر، میرے ساتھ بھی گیا، اور کسٹوڈین سے مل کر، میرے باغوں کا مسئلہ سلجھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جب سے میرا یہ دیرینہ حبیب، نائب وزیر بن چکا ہے، مجھ سے مراسلت بند کردی ہے۔اور میں کہہ رہا ہوں

پھیری نگاہ ، طور سے ، بے طور ہو گئے
تم تو ، جوان ہوتے ہی ، کچھ اور ہو گئے

مولوی محمد رضا، فرنگی محلی

اگر اُس شیفتگی کو، جو محمد رضا صاحب کو مجھ سے کبھی تھی، میں فراموش کر چکا ہوتا تو اس بیگانگی کا مجھے قطعی کوئی قلق نہ ہوتا، جو اب انہیں میری ذات سے پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی طرح، اگر یہ امر بھی میرے حافظے سے محو ہو چکا ہوتا کہ، خیر سے، کبھی اُن کا وہ دور بھی تھا کہ، ہر چند، فرنگی محل کے اندر قدم رکھنے کی خاطر، داخلے کے ٹکٹ کے طور پر، وہ داڑھی رکھے ہوئے تھے، لیکن تھے وہ اندر سے پکے ترقی پسند ادیب، اور مُشکّک و متفکّر انسان۔ تو مجھے آج یہ دیکھ کر قلق نہ ہوتا کہ وہ تشکّک و تفکّر کے میدان سے بھاگ کر، مسندِ قضا پر بیٹھ گئے ہیں، اور اُن کے دروازے پر ''مفتی'' کا بورڈ لٹکا ہوا ہے۔

اب میں اُن کے باب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ مادرِ دہر نے روایت کی کال کوٹھری میں ایک درایت پسند بچہ جنا تھا، جو، بڑی درخشاں امیدوں کے ساتھ، پروان چڑھ رہا تھا۔ لیکن اُس کی مَسیں بھیگنے لگیں، تو اُس بے چارے کو فکرِ فردا کا بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا۔ اور جب، ایک سال کے بعد وہ بچہ، پھر شہر آ گیا تو یہ دیکھ کر دنیا دنگ ہو گئی کہ وہ طفلِ سبزہ آغاز، کسی کیمیاوی تبدیلی کی بنا پر، کچھ اوپر اسّی برس کا پیرِ فرتوت بن چکا ہے۔ اس کو بھی میں بساغنیمت سمجھتا ہوں کہ جب کبھی میرا اُن کا سامنا ہو جاتا ہے، اب بھی وہ مسکرانے لگتے ہیں، اور اُن کی آنکھوں میں، اپنی اس قلبِ ماہیت کا خیال چبھنے لگتا ہے۔

لیکن یہ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اُن کے ذوقِ شعری کو ابھی تک کوئی آزار نہیں لگ سکا ہے، شاعری کے آج بھی وہ پرستار ہیں، اور اچھا شعر سن کر، سر دھننے لگتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی نہ رہتا تو ہم اُن کا بگاڑ ہی کیا سکتے تھے۔ اے مُشکّکِ ماضی، اور آج کے قاضی، اس خاک سار کا، معنی خیز، سلام قبول ہو جائے۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!!

اجمل خاں

مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری تھے۔ اب ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رُکن ہیں۔ اُن کا دینی مطالعہ، اور اُن کی علمی قابلیت نہایت ٹھوس ہے۔ عربی، فارسی، اور انگریزی، تینوں زبانوں پر اُنھیں کامل عبور حاصل ہے۔ اور معلومات کا ایک بحرِ ذخار ہیں۔

اُن کے نزدیک قرآن کی ترتیب، ناقابلِ فہم حد تک مجروح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی آج تک ہزاروں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں، اور آج بھی لکھی جا رہی ہیں، اور مفسرین کے مابین سخت اختلافات پائے جاتے ہیں، جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ قرآن، اپنی ترتیب مجروح کی بنا پر، اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ انھوں نے بیس برس کی، مسلسل عرق ریزی کے بعد قرآن کو، حسبِ نزول، از سرِ نو، مرتب کیا ہے، لیکن انھیں اس بات کی شکایت ہے کہ ہندوستان کا کوئی ناشر اُس کی طباعت پر آمادہ نہیں ہے۔

اس قدر ٹھوس علمیت کے باوجود وہ بلا کے ظریف اور بے حد ہنسوڑ بھی ہیں، اور جب کبھی لطائف سنانے پر آ جاتے ہیں، تو، روتوں کو بھی، جی بھر کے، ہنساتے ہیں۔

وہ میرے بڑے پُرانے یار ہیں۔ جب دہلی جاتا ہوں، وہ، تقریباً ہر رات کو میرے پاس آتے ہیں، اور، ساغر و مینا سے پرہیز کے باوجود، دو دو، ایک ایک بجے رات تک، لطف اُٹھاتے اور لطف اُٹھواتے ہیں۔

پیری اور پیرانہ سری کی تنہائی اُن کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے، اور باتیں کرتے کرتے وہ کبھی کبھی کھو سے جاتے ہیں۔ اللہ اُن کو تا دیر سلامت رکھے کہ اُن کے سے آدمی، کہیں صدیوں میں جا کر، پیدا ہوتے ہیں۔

احسان بن دانش

سیاہ فام، پستہ قد، سنگین بدن، آہن عزم، لشکر شکن، زلزلہ کوب۔ شدائد آغاز، لذائذ انجام۔ زبردست شاہد پرست، بے شیشہ و جام مست، پہلے مزدور، پھر شاعر مشہور۔ کوئلہ اور کتب فروش، اور، ہر بیچ شئے کو قبرستان درآغوش۔ یہ ہیں میاں احسان، اور لاہور میں، مان نہ مان، میں تیرا مہمان۔ پاکستان بننے سے بہت پیش وہ لاہور میں آ کر بس گئے تھے۔ شاید کشف کے ذریعے سے اُن کو پتہ چل گیا تھا کہ پاکستان بن جائے گا۔ اور مسلمانوں کی اکثریت وہاں آ جائے گی۔

وہ اپنا وطن ''کاندھلہ'' چھوڑ کر، جب لاہور آئے تھے، اُن کے خلاف، ایک لشکر صف آرا ہو گیا تھا کہ انھیں وہاں جمنے نہ دیا جائے، اور میرے پاکستان آنے کی طرح، اُن کی مخالفت میں بھی اس قدر شور وغل ہوا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ دوڑو، پکڑلو، بچ کر جانے نہ دو، مار ڈالو۔

اگر وہ اُن استثنائی افراد میں نہ ہوتے جو تنہا ایک پوری فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو وہ اس مہا بھارت میں یا تو شہید کر ڈالے جاتے، یا پھر ''یو پی'' کے کسی شہر کی جانب بھاگ کھڑے ہوتے [1]۔

---

[1] دراصل وہ اُن کی نہیں، صوبۂ یو پی کی مخالفت تھی۔ ''یو پی'' اور پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان، ایک مدت دراز سے نفرت کی درآمد و برآمد کا بیوپار جاری ہے۔ اور، دونوں صوبوں کے اہلِ قلم، ایک دوسرے پر بھالا تانے کھڑے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی ندامت اور نہایت افسوس کے ساتھ، اس امر کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ اس شدید نفرت کی پہل کی تھی یو پی والوں نے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان پر متواتر حملہ آوروں کی وحشی فوجوں نے، اُس دور فرصت و فراغت سے پنجاب کو، صدیوں محروم رکھا، جس سے تہذیب کی بنیاد پڑتی، اور ذکاوت کے دریچے کھلتے ہیں، اور اُس کے بالمقابل، تاریخی اسباب کی بنا پر، بالعموم یو پی، اور بالخصوص اودھ کو فرصت و فراغت کے تسلسل نے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بنا دیا۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اہلِ یو پی کو اس بات کا حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اُن کا منھ چڑھانے لگتے۔ میرے نزدیک تو یو پی والوں کا یہ انسانی فریضہ تھا کہ وہ پنجاب والوں کو، اُبھار کر، اپنی سطح پر لانے کی سعی کرتے، اور خصوصیت کے ساتھ جب، انھوں نے یہ دیکھا تھا کہ پنجابیوں نے، اپنی زبان کو چھوڑ کر اردو کو اپنا لیا ہے، اس وقت تو شرافت اس بات میں تھی کہ یو پی والے، اپنے پنجابی بھائیوں کی پیٹ ٹھوکتے، اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے۔ لیکن انھوں نے اس شریفانہ روش سے منھ موڑ لیا اور چھچھورا پن اختیار کر کے، گلے آوازیں کسنے اہلِ پنجاب کی زبان پر، اور مارنے لگے قہقہے اُن کے لہجوں پر، اور کہنے لگے اُن کو ''ڈگا'' ہمارے احساسِ برتری نے، ایک طرف تو ''بوئے گھوڑس می آید'' کے طنز سے، ہندوؤں کو اردو کی دشمنی پر آمادہ کر لیا، اور دوسری طرف پنجابیوں کو ''ڈگا'' کہہ کہہ کر، اپنی مخالفت پر اُبھار دیا۔ جو ہم نے بویا تھا اب اُسے کاٹ رہے ہیں۔ اور۔ سعدی از دست خویشتن فریاد'' کے عذاب میں گرفتار ہیں۔

میں نے سب سے پہلے دکن کے اخباروں میں اُن کا سیاسی کلام پڑھا تھا، اور یہ خیال کر کے خوشی ہوئی تھی کہ وہ فرنگی حکومت کے خلاف، میری ہم آہنگی کر رہے ہیں۔ اور جب لاہور میں، لالہ چندی داس کے مکان میں سب سے پہلے میں نے اُن کو دیکھا تھا، تو اُن کو گلے لگا لیا تھا۔

اُن کی ابتدائی زندگی، ایک زمین کھودنے والے مزدور کی حیثیت سے گزری تھی۔ اور آج زمینِ شعر پر گُل باری کر رہے ہیں۔ وہ پہلے، بڑی خوش الحانی سے کلام سناتے تھے، اب تحت اللفظ پڑھتے ہیں، اور غزل گوئی تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

مجھ کو بڑی ہنسی آتی ہے کہ وہ ''روحوں'' سے رابطہ پیدا کرنے کی غرض سے۔ جمعرات کو قبرستان جاتے، اور اپنے پر اربابِ عقل کو ہنسواتے ہیں۔ جب ہماری قوم کے خواص ان اوہام میں گرفتار ہیں، تو ہمارے عوام کیا ہوں گے، ارے میں کس قوم میں پیدا ہو گیا ہوں۔

بہر حال، مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ادھیڑ ہو جانے کے بعد بھی، احسان کا دل اب تک جوان ہے، اور ''روحوں'' کی جانب مائل ہو جانے کے باوصف، اُن کا اب تک حسینوں کے جسم سے رابطہ قائم ہے۔ اے دائرے والے، گت چلی جائے!

❁

پنڈت کیلاش نرائن، ہاکسر

سرو قامت، شگفتہ مزاج، بڑھاپے میں بھی ماہ رو، شاعری اور موسیقی کے شیدائی، نفیس مزاج، بلند خیال، فارسی داں اور اردو نواز، کشمیری پنڈت ہیں۔ دہلی میں رہتے ہوئے پشتیں گزر چکی ہیں، اور شرفائے دہلی کے آداب اُن کے خون میں شامل ہو چکے ہیں۔
۱۹۳۴ء سے بھی کچھ آگے، میرا اُن کا یارانہ ہے۔ پہلے اپنی چاندنی چوک والی دکان میں، جو گھنٹہ گھر کے سامنے ہے، بیٹھتے تھے، اب اپنی نئی دہلی کی دکان "پنڈت برادرز" میں بیٹھتے ہیں۔
اُن کی عمر، ستر کے لگ بھگ ہے، لیکن چہرہ گلاب کا سا، اور صحت، ماشاءاللہ، جوانوں کی سی ہے، اور یہ ساری برکت ہے اُن کی اس دانائی کی کہ وہ اب تک کنوارے ہیں، اگر شادی کا ارتکاب کر لیتے تو لترا ہو کر رہ جاتے۔
وہ، خوب جی بھر کے کما چکے ہیں، اور اگر وہ دکان بند کر کے بیٹھ جائیں اور دو سو برس تک جئیں، پھر بھی اُن کی دولت میں کمی نہیں آسکتی۔ لیکن آج تک وہ برابر کمائے جاتے ہیں، اور تھکنے کا نام نہیں لیتے۔
میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ جب اُن کی آل ہے، نہ اولاد، نہ جورو، نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ تو اس پیرانہ سالی میں وہ اکتسابِ زر سے تائب کیوں نہیں ہو جاتے ہیں۔ اور ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ و دانا بینا کی حیثیت سے یہ بات اُن کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ زندگی کے لمحۂ آخر تک کمانا، کما کما کر روپیوں کے پہاڑ کھڑے کر دینا، اللہ کے کسی بندے کے کام نہ آنا، اور، ساری کمائی کو ناشکرے قرابت داروں کے سپرد کر کے، خالی ہات اس دنیا سے اُٹھ جانا، کون سی دانشمندی کی بات ہے۔
لیکن اس انداز سے غور کرنا، اُن کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ جب کوئی مشغلہ، ذہنی عادت بن جاتا ہے، تو اُس سے عمر بھر نجات نہیں ملتی۔
بات میں بات نکل آئی، مجھے دہلی کلاتھ مل کے ارب پتی مالک سر لالہ سری رام یاد آ گئے، ایک دن اُن کے پاس گیا تو انھیں بے حد اُداس اور گھبرایا ہوا پایا، سبب دریافت کیا، تو انھوں نے، اپنے چاندی کے سے سفید بال نوچ نوچ کر کہا جوش صاحب آپ شاعر ہیں، سنتا ہوں شاعروں پر چالیس دیوتاؤں کا سایہ ہوتا ہے، آپ دعا کریں کہ میں مر جاؤں، میں نے کہا لالہ جی کروروں آدمی اس تمنا میں مرے جاتے ہیں کہ آپ کی دولت کا

آٹھواں حصہ ہی اُن کو مل جائے، آپ اس قدر خوش قسمت ہو کر، مرنے کی تمنا کر رہے ہیں، آخر یہ ماجرا کیا ہے، انھوں نے کہا کیسے بتاؤں، بڑی شرم آتی ہے، یہ ٹانگ کھولوں تو لاج، وہ ٹانگ کھولوں تو لاج۔ میں نے کہا آخر کچھ تو کہئے، تاکہ میں آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں، انھوں نے کہا، اور بڑی رہانسی آواز میں کہا جوش صاحب، آپ دیکھتے ہیں کہ میرے چاروں طرف سونے چاندی کی ٹھیکیاں لگی ہوئی ہیں، مگر اس دل میں مفلسی کی آگ جل رہی ہے، جب صبح کو جاگتا ہوں تو پہلی آواز، دل سے، یہ آتی ہے کہ لالہ جی آج دو پیسے اور کما لو۔ العظمۃ للہ، دیکھا آپ نے فراوانئ دولت کا عذاب شدید؟ اور ملاحظہ فرمائی آپ نے روپیہ کمانے کی، کبھی نہ بجھ سکنے والی، آگ؟

بس اسی عذاب میں میرے دوست ہاکسر صاحب بھی گرفتار ہیں۔ اس موضوع پر میری ایک رُباعی سن لیجے:

زردار کا خنّاس نہیں جاتا ہے
ہر آن کا وسواس نہیں جاتا ہے
ہوتا ہے جو شدتِ ہوس پر قائم
تا عمر وہ افلاس نہیں جاتا ہے!!

جب دہلی جاتا ہوں، تو اُن سے ملے بغیر، کبھی واپس نہیں آتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی، بڑی مٹھاس کے ساتھ، مسکراتے، اور، لپک کر، سینے سے لگا لیتے ہیں۔

ایک زمانے میں ہندوستان کے بڑے بڑے موسیقار اُن کے وہاں مہینوں ٹھہرا کرتے تھے، اور جامع مسجد کی پشت پر وہ ایک خوش گلو مطربہ کے گھر، مجھے لے کر جایا کرتے، اور جی بھر کے گانا سنتے تھے۔

لیکن بڑھاپے نے اُن کا دل اب اس قدر بجھا دیا ہے کہ اُن کے گھر اور ان کے سینے، دونوں میں وہ پہلی سے گہما گہمی باقی نہیں رہی ہے۔ اب نہ گاتا ہے نہ بجاتا۔ اور تو اور، اُن کے دل میں دوستوں کی محبت بھی کم ہو گئی ہے، اگر اُن کے پاس چلے جایئے تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، نہ جایئے تو ٹھینگے پر مارتے ہیں۔

اے بڑھاپے، اے خبیث بڑھاپے تو انسان کے دل کا سارا پریم رس چوس لیتا ہے، اور اچھے خاصے ہنستے بولتے انسانوں کو گھگّو بنا کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن تیری زد سے شاعر بچے رہتے ہیں، وہ اپنے دل میں جوان ہوتے، اور لپٹنے سینے کے پھولوں کی سیج پر سوتے اور نعرہ لگاتے ہیں:

ہر سانس میں، جواں ہی نہیں، نوجواں ہوں میں
شکرِ خدا کہ بندۂ پیرِ مُغاں ہوں میں

❁

حکیم اشعر، دہلوی

خانوادۂ حکیم شریف خاں کے چشم و چراغ، عربی و فارسی کے منتہی، بلند پایہ مصنف، قابلِ رشک مترجم، شایانِ قدر صحافی، مطب گم کردہ طبیب، ماضی۔ فراغت چشیدہ، حال۔ صعوبت گزیدہ، پہلے، یوسف جمال، اب افسردہ خط و خال، کل کے رندِ صہبا گسار، آج کے متقی تہجد گزار۔ سراپا اخلاص، حیرت ناک سخن شناس، بالقوت، شاعرِ بزرگ، حوادث کے ہاتوں، بالعمل ایک، از یاد رفتہ، خوش فکر غزل گو۔

کل، دہلی میں سب کچھ حاصل تھا، اب لاہور میں کچھ نہیں ہے، اور حیات و مرگ کے دوراہے پر کھڑے، ادبھی ادبھی سانسیں لے رہے ہیں۔ ان کے، رندِ لاأبالی و خوباں در آغوش بڑے بھائی حضرتِ کیف، غربت کے شدائد کی تاب نہ کر لاہور ہی میں دم توڑ چکے ہیں۔ کون جی سکتا ہے اس ہجومِ ناقدر شناسی میں۔ اللہ اُن کو بچائے، اور، غیب سے ان کی ناؤ ترائے جب کبھی ان کے منھ کو، جو کبھی دمکتا رہتا تھا، اُترا، اور کمہنایا دیکھتا ہوں، دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ہائے، یہ سفلہ پرور توسنِ روزگار کیسے کیسے عالی خاندانوں کو، ٹاپوں سے روندتا رہا ہے اور، کیسے کیسے امیروں غیر وں، نتھو خیروں کا مرکب بنا ہوا ہے۔

ائمہ قلم پر عرصۂ حیات تنگ ہے، اور صفیہانِ درم کے وہاں رامش و رنگ ہے۔ یہ کون ہے، جس نے "طوقِ زرّیں" کو "گردنِ خر" کے واسطے مختص کر دیا ہے، اور "اسپ تازی" کو "زیرِ پالاں" مجروح رکھنے کی قسم کھائی ہے۔

کفن بیاور و تابوت و جامہ، نیلی کن
کہ روزگار طبیب است و عافیت بیمار!

۞

شیوراج بہادر

میں، اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں، جنھوں نے، دہلی کے شیوراج بہادر کی ذات میں، نفس کی طہارت، اور، خاندانی شرافت کو، سانس لیتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، اور اللہ کے سیکڑوں دردمند بندوں کے کام آتے دیکھا ہے۔ اور میں وہی بدبخت آدمی ہوں، جو اُن کی ناگہانی موت پر، آج آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہے:

رفتی و مرا خبر نہ کردی
بر بیکسم نظر نہ کردی

انھوں نے میرے کراچی آ جانے کے بعد، میرے اہل و عیال کی سہولت و آسایش کے واسطے، دو ڈھائی مہینے تک، کیا کیا ہفت خواں طے کر کے، انھیں یہاں روانہ کیا تھا، اُس کو میرا ہی دل جانتا ہے۔ اور میں اُن کے اُس احسان کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ہائے اب وہ نہیں ہیں، پھر بھی جب دہلی جاتا ہوں، اُن کی گلی کے سامنے کھڑے ہو کر سلام کرتا، اور خون کے آنسو بہاتا ہوں۔ معلوم نہیں اُن کی بیٹی اب کہاں ہے، کوئی اُس تک میری دُعا پہنچا دے کہ بیٹی سلامت رہو۔

اسلم خاں

جو کہتے ہیں لانبا آدمی احمق ہوتا ہے، وہ رام پور جائیں، اور اسلم خاں کو دیکھ کر، یہ بات مان لیں کہ کبھی کبھی لانبا آدمی سقراط بھی ہوتا ہے۔

جس طرح ٹین کے چھوٹے سے ڈبے میں، بہت سی مچھلیوں کو، خوب دبا دبا کر، بند کیا جاتا ہے، اسی طرح، قدرت نے، علم و فکر کی پہنائیوں کو، لوہے کی تھاپیوں سے کوٹ کوٹ کر، اُن کے سر میں بھر دیا ہے۔

وہ اسمبلی کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اب رام پور کے ایک کامیاب وکیل ہیں۔ اُن کے سے بڑے آدمی کے لیے، رام پور ایک بہت چھوٹا مقام ہے، اُن کو وہاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک باون گز کے لنکا والے کو، بالشتیوں کی چھت کے نیچے، توڑ مڑور کر، قید کر دیا گیا ہے،

وہ اپنے وطن میں، جھکے جھکے چلتے ہیں، اس لیے کہ اگر کھڑے ہو جائیں تو وہاں کے آسمان سے اُن کا سر ٹکرا جائے گا۔ صد حیف کہ حالات کی مجبوریوں نے سومنات کے سب سے بڑے بُت کو، گاؤں کے ایک سب سے چھوٹے مندر میں ——— (نامکمل) ☆ ———

۞

☆ ——— قلمی نسخے میں اسلم خاں کا تذکرہ صفحہ نمبر ۱۰۷ سے شروع ہوا ہے اس کے بعد صفحہ نمبر ۱۰۸ خالی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب کسی وقت اس میں اضافہ کرتے۔

گوپی ناتھ، امن، لکھنوی

سُرے کی سلائی کی طرح پتلے، اور لانبے۔ لکھنؤ، کے شائستہ دشتہ کایستھ، فارسی داں، اردو استاد، گاندھی جی کے چیلے، کانگریس کے فعال و سرگرم رُکن، دہلی کے سابق صوبائی وزیر، لذائذِ حیات کے شدید دشمن، لحم و شکر بیزار، خرابات نشین و آزادہ منش باپ کے زیرِ مقید اور پابہ زنجیر دھرمی بیٹے، دین کے مباحث میں، بیاروں کے مانند، چڑچڑے، لطیفہ سنج، وضع دار، خوش مزاج، خوش فکر غزل گو، لیکن شاعر سے زیادہ سیاست آشنا، اور ''شہر کے اندیشے'' سے ''دُبلے قاضی'' ہیں۔

میرے بہت پُرانے دوست ہیں، ایک بار وہ مجھ سے بگڑ گئے تھے، اور، انھوں نے، شاہ جہاں پور کے ایک پرنسپل کو ابھار کر، میرے خلاف چند اُلٹے سیدھے شعر بھی، مشاعرے میں پڑھوا دیے تھے۔ اُس سے بگڑ کر، میں نے اُن پر ایک سخت نظم بھی کہہ ڈالی تھی۔ جس کا مجھے آج تک، شرمندگی کے ساتھ، ملال ہے۔ مجھ کو چاہیے تھا کہ میں اُس ناخوشگوار واقع کو، ہنس کر ٹال دیتا، لیکن اُس موقع پر میں اپنی پھٹولی کی رگ دبا نہیں سکا اور اب پچھتا رہا ہوں۔ لیکن تھوڑے دن کی ان بن کے بعد، ہم دونوں پھر شیر و شکر ہو گئے۔

اب جب کبھی ہندوستان جاتا ہوں، اُن سے ضرور ملتا، اور اُن کی مذہبیت پر پھبتیاں کستا ہوں۔ اور وہ مسکراتے رہتے ہیں۔ اگر سیاست اور دھرم کا بخار اُن پر نہ چڑھ جاتا، تو وہ شعر و ادب میں ایک نہایت بلند مرتبہ حاصل کر لیتے:

دھرم نے ان کو نکما کر دیا
ورنہ یہ بھی آدمی تھے کام کے

وشیو ر پرشاد، منور لکھنوی

یہ حضرت بھی، اَمن صاحب کی طرح، ہمارے لکھنؤ کے کائستھ، اور خراباتی باپ حضرت افق کے پرہیزگار بیٹے ہیں۔ اور ان دونوں نے، کائستوں کی قوم کو بٹا لگا دیا ہے۔ اور حافظ کے اس شعر کے مصداق ہیں:

پدرم ، روضۂ رضواں ، بدو گندم بفروخت
نا خلف بودم ، اگر من بجوے نفروشم

لکھنؤ کے مستند و قدیم شعراء میں آنند نرائن مُلا اور ان کے سوا اب رہ کون گیا ہے۔
ان میں یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے امن کے برخلاف، سیاست کو منھ نہیں لگایا۔ اور تصانیف و تراجم کا انبار لگا دیا، ایسا انبار کے اردو اُن کی ذات پر ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔
وہ، پیار آنے کی حد تک معصوم اور بھولے بھالے آدمی ہیں۔ اس بار جب دہلی گیا، تاروں کی چھاؤں میں اُن کا دروازہ کھٹکھٹایا، بڑی دیر کے بعد ایک لڑکا اوپر سے آیا، اُس نے میرا نام پوچھا،
میں نے کہا "منور صاحب سے جا کر کہہ دو آپ کے ایک بہت پُرانے دوست آئے ہیں"
زینے میں روشنی ہوگئی، زینے کی آخری سیڑھی پر میں نے اپنا ڈنڈا اس زور سے کھٹکھٹایا کہ وہ سمجھے کوئی ڈاکو آ گیا ہے، وہ اُچھل پڑے، اور زینے کے دروازے سے ہٹ کر، کھڑے ہو گئے، لیکن مجھے دیکھتے ہی انھوں نے قہقہہ مارا، اور، دوڑ کر، لپٹ گئے۔
انھوں نے، جرمنی کے سب سے بڑے شاعر "گیٹے" کے "فاؤسٹ" کا اردو نظم میں، ایسا شگفتہ و رواں دواں ترجمہ کیا ہے کہ اُسے دیکھ کر اُن کی قادر الکلامی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔
اللہ اُن کو تا دیر جلائے، اور اُن کو اپنے نام ور باپ کے راستے پر لے آئے۔ خدانخواستہ جیتا رہا، اور سفر کی اجازت بھی مل گئی، تو اب دہلی جاؤں گا، تو اُنھیں پھر تاروں کی چھاؤں میں جا کر ڈراؤں گا۔

❁

آنند نرائن، مُلا

لکھنؤ کے، مایۂ ناز کشمیری خاندان کے، قابلِ فخر رُکن، فوج داری کے سب سے بڑے وکیل، پنڈت جگت نرائن کے نام ور فرزند، ہائی کورٹ کے سابق چیف جج، لشکرِ اردو کے سپاہ سالار، لکھنؤ کی محرابِ سخن کے آخری چراغ، اور تاج شاعری کے کوہِ نور۔

جب وہ جوبلی ہاؤس اسکول میں پڑھتے تھے، جس گلی سے بھی گزر جاتے تھے، دزروں سے لو نکلنے لگتی تھی، اور، بڑے بڑے زاہدانِ خشک مزاج، اُن کی موہنی صورت کو، گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے، اور اب بڑھاپے نے اُن کے چہرے پر ایسا جال سا بن دیا اور اس قدر نشیب و فراز پیدا کر دیا ہے کہ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کبھی خوب رو بھی رہے ہوں گے۔ میری طرح، اُن کی شاخِ حیات کے سارے پنچھی پرواز کر چکے ہیں، اور اُن کی زندگی بھی شدید تنہائی کے کرب میں گزر رہی ہے۔ اور، قیامت تو یہ ہے کہ اس کم بخت بڑھاپے نے اُن کے خلوص کی دھار بھی کُند کر کے، رکھ دی ہے۔ اللہ اس چراغ کو روشن رکھے۔

سراج وقدیر

لکھنؤ کے یہ دونوں غزل گو شاعر، ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے، اس لیے میں کون ہوں کہ اُن کو جُدا کر کے، اُن پر علحدہ علحدہ لکھوں۔ میرے ابتدائی دور میں یہ دونوں نوعمر ایسے تھے کہ اُن کے بغیر کوئی مشاعرہ کام یاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں بڑے خوش فکر و خوش لحن غزل گو اور غزل خواں تھے، اور سراج کے وہاں تو بعض اوقات ایسے چٹیلے شعر نکل آتے تھے کہ بڑے بڑے اساتذہ کو وجد آجاتا تھا۔
سراج کا کام بیماریٔ دل نے تمام کر کے، اُن کی حیات کا چراغ بجھا دیا، اور قدیر کو تسلسلِ افلاس نے، دیوانہ بنا کر، مار ڈالا۔ ہائے وہ دونوں جب یاد آتے ہیں، سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں، صد حیف کہ خود لکھنؤ نے اُن کو فراموش کر دیا ہے۔ لیکن میں فراموش نہیں کر سکتا۔
اے سراج وقدیر کی قبرو، میرے آنسوؤں کی لڑیاں قبول کرو۔

۞

ہوش، بلگرامی

لکھے پڑھے بہت کم، ترشے کڑھے بہت زیادہ، 'یک من علم و دہ من عقل' کے بجائے "یک تولہ علم و ہزار من عقل" رکھنے والے، نہایت اچھے موزوں طبع، بلا کے چٹکیلے، قیامت کے فقرہ باز، مصلحت آمیز دعوتیں کرنے، اور نئی نئی قسم کے لذیذ کھانے پکوانے میں شہرۂ آفاق، دوسروں پر اپنی درباررسی کا اور وجاہت کا رعب ڈالنے میں نہایت کام یاب، قرض لینے، اور بڑی بڑی دکانوں میں کھانے کھلانے اور پھر عمر بھر قرض ادا نہ کرنے، اور بلوں کی رقم نہ چکانے میں جگت استاد، باتوں کے طوطے اُڑانے، اور لکھنئے باندھنے میں بے نظیر، ذہانت و ظرافت کے بادشاہ، امراء کے پیدائشی اور مادر زاد مصاحب، اور میر عثمان علی خاں، نظام دکن پر، اپنے چٹکلوں، فقروں، چہرے کے اُتار چڑھاؤ، لہجے کے زیر و بم اور اپنی سلطان شکار ظرافت و ذہانت کی بدولت اس قدر حاوی کہ جس امیر کو چاہیں، دربار سے پٹوا کر نکلوا دیں، اور جس فقیر کو چاہیں، اُس کو مالا مال کرا دیں۔ اور پھر سقوطِ حیدرآباد کے بعد، نظام سے گریزاں، اور اُن کی ہجو میں ایک ضخیم کتاب کے مصنف ___ یہ تھے ہوش بلگرامی ___ اللہ مغفرت کرے۔

۞

ساحل بلگرامی

جسم کے لحاظ سے کاہ، خلوص کے اعتبار سے کوہ، کثرتِ اخلاص وشدتِ جذبات کی بناء پر، ذرا ذرا سی بات میں روٹھ، اور روٹھ کر بآسانی من جانے والے، علم وادب میں صاحب نگاہ، سخن سنجی میں بے عدیل، ہوش بلگرامی کے حقیقی چھوٹے بھائی، لیکن اُن سے قطعی مختلف، تاریخ اسلام سے، بدرجۂ اتم آگاہ، دین کی گرفت سے آزاد، ساغر ومینا کے شیفتہ، موسیقی کے رسیا، عقلِ معاش سے محروم، افلاس سے دوچار، پھر بھی خوددار۔
میں، ایک مشاعرے کے سلسلے میں جب دہلی سے کراچی آیا، اُن کو ایک ذلیل سی جھونپڑی میں رہتے پایا۔ اور، اُس سے متاثر ہو کر، دہلی سے نقوی صاحب چیف کمشنر کراچی کو، یہ منظوم خط فروری ۱۹۵۵ء میں روانہ کیا تھا:

اے شہرِ کرم کے بابِ نقوی — اے پرتوِ بوتراب نقوی
اے ماہ فروز و مہر پرور — اے پورِ بتول و ابنِ حیدر
ہاں، خلقِ حسن کے اے طلب گار — اے صبرِ حسین کے خریدار
اے جود فروش و فیض گستر — اے وارثِ رافتِ پیمبر
اے نورِ جبینِ خوش ادائی — اے حلقۂ زلفِ دل رُبائی
خوش طبع و وجیہہ و خوب صورت — اے لالہ مزاج و شیشہ طینت
اے جود و کرم کے بحرِ ذخّار — ساحلؔ، طوفاں میں ہے گرفتار
یہ شاعرِ عالم و خرد مند — تاریک سی جھونپڑی میں تا چند؟
یہ فکرِ بلند و طبع عالی — تاچند، رہینِ خستہ حالی؟
کب تک، یہ مرغِ خوش ترانہ — خاشاک کا تنگ آشیانہ
اے خسروِ باغ۔ بہر بلبل — کانٹے ہیں، بجائے بسترِ گل
اے مشعلِ فیض و نجم خوش آب — تاریک ہے، جھونپڑی کا گرداب
تا، عہدہ براہو، خیر، شر سے — ساحلؔ کو نکال، اس بھنور سے
تا، بحرِ سخن میں ہو روانی — ساحلؔ میں ہو موجِ زندگانی

قصر و ایواں ، نہ سیم و زر دے　　　صرف ایک مکانِ مختصر دے

اُف عقدۂ ظلمتِ غریباں　　　اے ناخنِ آفتابِ رخشاں ☆

وہ، بڑی تحقیق وکاوش سے تاریخِ اسلام لکھ رہے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ وہ ہر جمعرات کو میرے پاس آتے، چہکتے چلاتے، ہنستے بولتے اور گاتے تھے، ایک بار جب وہ رخصت ہونے لگے، کہا مجھ سے گلے مل لیجیے کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اور آخری گانا ہے۔ اور وہ آئندہ جمعرات سے پہلے ہی سدھار گئے۔ بعض اوقات زندگی کی زبان سے موت بولتی ہے۔ صد حیف ایک بڑا پیارا دوست چلا گیا۔

☆ ـــــ کراچی کے چیف کمشنر اے ٹی نقوی کے نام یہ منظوم سفارشی خط جوش صاحب نے اولڈ سیکریٹریٹ دہلی کے لیٹر پیڈ پر ۱۸ فروری ۱۹۵۵ء کو قلم بند کیا تھا۔ پیشِ نظر تذکرے کے حاشیے پر جوش صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ’ـــــ ساحل نے بربنائے خودداری یہ خط اُن تک پہنچایا ہی نہیں تھا اور جھونپڑے ہی میں پڑے رہے ـــــ‘ جبکہ راغب مرادآبادی یہ کہتے ہیں کہ وہ جوش صاحب سے ملاقات کے لیے ۱۹۵۵ء میں دہلی گئے تھے تو انہوں نے ساحل بلگرامی کے لیے جوش صاحب سے فرمائش کر کے یہ منظوم سفارشی خط لکھوایا تھا اور جب کراچی میں اے ٹی نقوی صاحب کو پہنچایا تو انہوں نے ساحل بلگرامی کے لیے کراچی کی ایک بستی سعودآباد میں دو کوارٹر الاٹ کردیے تھے۔ مکالماتِ جوش و راغب، جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اُس کے دیباچے میں، دہلی میں، جوش صاحب سے اپنی ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے راغب صاحب لکھتے ہیں:

ـــــ ایک دن مجھ سے اپنے احباب کے بارے میں دریافت فرمایا خصوصاً جناب ساحل بلگرامی کے متعلق جو حیدرآباد دکن کے آخری تاجدار میر عثمان علی خان کے مصاحبِ خاص، نواب ہوشیار جنگ بلگرامی کے برادرِ خورد تھے۔ میں نے بتایا کہ ساحل صاحب سخت مصائب کے نرغے میں ہیں۔ رہنے کے لیے مکان نہیں۔ ایک جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ اگر آپ نقوی صاحب کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تو سعودآباد یا کسی اور بستی میں کوارٹر الاٹ ہو جائے گا۔ فرمایا کل صبح یاد دلا دیجیے گا۔ حسبِ ارشاد میں نے اگلے روز علی الصبح کہا کہ نقوی صاحب کے نام خط لکھ دیجیے لیکن نثری نہیں منظوم۔ فرمایا، ہم نے کسی

کے لیے منظوم سفارشی خط بھی لکھا ہی نہیں۔ میں نے کہا آج اس کا بھی ارتکاب فرمالیجئے، چنانچہ منظوم خط لکھ دیا۔ کراچی واپس آنے کے بعد میں نے یہ خط نقوی صاحب کی خدمت میں خود پہنچایا اور جوش صاحب کی آمد کا مژدہ بھی سنایا۔ نقوی صاحب نے جوش صاحب کے نامہ منظوم کے بعد سعود آباد (کراچی کی نواحی بستی) میں ساحل صاحب کو ایک کے بجائے دو کوارٹر الاٹ کر دیے۔ نقوی صاحب کی اجازت سے میں نے اس مکتوب منظوم کی فوٹو کاپی رکھ لی۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ جوش صاحب کی پہلی اور آخری نظم ہے ____' (ص: ۱۱)

راغب صاحب سے مجھے جوش صاحب کے جو چند ادبی نوادرات ملے ہیں اُن میں اس خط کی فوٹو اسٹیٹ نقل بھی شامل ہے بعد میں انہوں نے مکالمات جوش و راغب میں اس خط کا عکس صفحہ ۱۴۰ پر شائع کر دیا۔ اس منظوم خط کے اشعار کی تعداد ۲۰ ہے جبکہ جوش صاحب نے ساحل بلگرامی کے تذکرے میں ۱۶ را اشعار لکھے ہیں منظوم خط کے چار اضافی شعر، پانچواں، آٹھواں، سترواں اور انیسواں درج ذیل ہیں:

اے مصحفِ دینِ حق پناہی — اے آیۂ رحمتِ الٰہی
اے محسنِ صباحِ کوہساراں — اے نازِ ہوائے نو بہاراں
گو روح ہے جھونپڑوں میں بیتاب — محلوں کے یہ دیکھتا نہیں خواب
صرفِ اک تجلّیٔ ترحّم — اے لعلِ کریم کے تبسّم

ایک مصرعے میں ذرا سی ردوبدل بھی کی ہے
خوش طبع و خلیق و خوبصورت / خوش طبع و وجیہہ و خوبصورت

۞

سیدآلِ رضا

ہمارے مابین اُس وقت سے ملاقات ہے جب ہم دونوں چشمِ بددور، بڑے کٹیلے قسم کے گبھرو تھے۔
اور ایسے گبھرو کہ حسین عورتیں، اور حسن پرست اسکول کے اساتذہ، دونوں ہمیں، گھور گھور کر، دیکھا کرتے تھے۔
اُن کی زبان، اُن کی چال ڈھال، اُن کا لہجہ، اور اُن کی غزل کا مزاج خالص لکھنوی ہے۔ جب وہ جامہ وار کی شیروانی یا ململ کا انگرکھا پہن کر، مشاعروں میں آتے، تو اپنے وجود کی رنگینی، اپنی غزل کی دل ربائی اور اپنے لہجے کی گداختگی کے باعث، تمام مشاعرے پر چھاجایا کرتے تھے۔
ہیں تو وہ بلا کے عاشق مزاج، مگر ہمت میں اس قدر شرمیلا پن، اور مزاج میں اس قدر احتیاط کہ بڑھ کر کسی کا فرادا کا دامن تھام لینے کی جرأت کبھی نہیں کرسکتے۔ بس دور سے دیکھتے، خلوت میں آہیں بھرتے اور اُن بجھی ہوئی آہوں کو غزل کے سانچے میں ڈھال لیا کرتے ہیں۔
مجھے یقین ہے کہ اگر، جوانی میں بھی، کوئی شوخ حسین، آغوش وا کر کے، ان کی چوکھٹ پر پہنچتی، تو فرطِ "احتیاط" سے وہ کانپنے لگتے اور اُس سے کہتے کہ آپ اس قدر توقف فرمائیں کہ میں استخارہ دیکھ لوں۔ اب رہے اُن کے مرثیے، سو مختصراً یہ عرض کروں گا کہ اس دور میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ انھوں نے مراثی کو، جدید آب و رنگ بخش کر ایک ایسے منارۂ بلند و مستحکم میں تبدیل کردیا ہے، کہ وہ دعویٰ کرسکتے ہیں کہ:

پے افگندم، از نظم کاخِ بلند ـــــ کہ از باد و باراں، نیابد گزند!

اور غمِ حسین میں ڈوب جانے ہی کا یہ معجزہ ہے کہ، ابھی ایک ہفتہ ہوا کہ جب انھوں نے اپنے جوان بیٹے کے جنازے کو:۔ میت، جواں پسر کی اُٹھاتا ہوں، یاعلی،۔ کہہ کر، اُٹھایا تھا، تو اُن کے ٹوٹے ہوئے دل کے ثبات کو دیکھ کر، ہماری استقامت، نے، فرطِ شرم سے، منھ ڈھانک لیا تھا۔☆

☆ سید آلِ رضا (۱۸۹۶ء ـ ۱۹۷۸ء) قصبہ نبوتنی ضلع اناؤ یو۔پی میں پیدا ہوئے کراچی میں اُن کی وفات ہوئی اُن کی غزلوں کے دو مجموعے "نوائے رضا" ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے اور "غزل معلیٰ" ۱۹۵۹ء میں کراچی شائع ہوچکے ہیں۔ اُن کے ۲۰ مرثیوں کا مجموعہ "مراثیِ رضا" ۱۹۸۱ء میں خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی نے شائع کیا جوش صاحب نے جو مصرعہ نقل کیا ہے وہ آلِ رضا کے اُس مرثیے کا مصرعہ ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کی ناگہانی موت پر کہا تھا۔

نواب سید محمد مہدی، عرف ''میاں''

پٹنے کے امرائے کبیر کے خاندان سے ہیں، اُن کے ظاہر و باطن میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔ جس طرح چہرہ تاباں ہے، ویسا ہی دل بھی درخشاں ہے، مہر و محبت میں یکتائے روزگار، علم وادب کی قدر شناسی میں بے مثال، اور بے حد متین و بردبار ہیں، اور چہرے پر شریفانہ انکسار کے ساتھ، رئیسانہ وقار پایا جاتا ہے۔
ایک زمانے میں بہت بڑے جاگیردار تھے۔ تنسیخ زمیں داری کے بعد، بجھ کر رہ گئے ہیں، اپنی عالی شان کوٹھی 'باؤلی ہاؤس' کو کرائے پر اُٹھا کر، ایک اوسط درجے کے مکان میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مزاج رئیسانہ ہے، حالات نا مساعد ہیں، اپنے کو سمیٹے گوشے میں بیٹھے ہیں، کریں تو کیا کریں، جو ہات ہمیشہ اونچا رہا ہے، اُسے نیچا نہیں کیا جا سکتا:

سخت است، پس از جاہ، تحکم بُردن

میاں میرے، اُن احباب میں سے ہیں، جن کی شرافت کے آستانے پر سجدہ کرنے کو جی چاہتا ہے، اُن کے تصور سے شیرینی محسوس ہوتی ہے، لیکن اُس شیرینی میں اب غم کی کسک بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس غم میں، ڈوبتے سورج کی اُداسی جھلک رہی ہے۔

خورشید فرید آبادی

لاہور کے قلعہ، پھمن سنگھ میں رہتے اور بامسلماں اللہ اللہ، بابرہمن رام رام، قسم کے آدمی ہیں۔ خوش فکر غزل گو ہیں، بلا شبہ اچھے شعر کہتے ہیں، لیکن پڑھتے ہیں بُرا، اور ہر شعر کو دو دو چار چار بار دہرا کر، سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں۔ آدمی بڑی محبت کے ہیں، جب کبھی کراچی آجاتے ہیں، تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی اور صبا اکبر آبادی کے وہاں پھڑ جما کرتی ہے۔ بوتل کھلتے ہی چہکنے اور بہکنے لگتے ہیں، مگر بگڑتے کبھی نہیں۔
آدمی بڑے باغ و بہار ہیں، مگر دو تلخ یادیں بھی اُن سے وابستہ ہیں، وہ میری صحبت میں ایک بار بڑے کم ظرف آدمی کو لاہور سے اپنے ساتھ لائے تھے، جس نے ساری محفل کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا، اور ایک مرتبہ لاہور میں جب میں اُن کے وہاں ٹھہرا ہوا تھا، رات کو اُن کے وہاں لاہور کے ایک نہایت مشہور شاعر، جھومتے جھامتے آئے تھے، اور، دو ایک پیگ کے بعد، انھوں نے اُن سے گالم گلوچ شروع کر دی تھی ___ میں پریشان ہو کر اُٹھ گیا، اور بالا خانے پر جا کر سو گیا تھا، اور صبح چار بجے آنکھ کھلی تو اُس وقت بھی وہ شاعر صاحب، برابر گالیاں دے رہے تھے، میں داد دیتا ہوں خورشید کے اس ظرف کی کہ انھوں نے گالیاں سنیں، لیکن میہمان کو، پلٹ کر جواب نہیں دیا۔
میں کہتا ہوں جن کو شراب پچتی نہیں، اور جن کی طاقتِ برداشت "چپاں" سی ہے، وہ "ہاتیوں کو بیعانہ" کیوں دیتے ہیں۔؟ ایسے لوگوں کو تو میرا مشورہ ہے کہ وہ شراب سے توبہ کر کے، نچائیں بندر، بجائیں، اسکولوں کی گھنٹیاں، اور بتائیں ہات کسی مویشی ڈاکٹر صاحب کا، مجھ کو اس کا بہت افسوس ہے کہ بے چارے خورشید کی بصارت خراب ہو گئی ہے، لیکن اس کی خوشی ہے کہ اُن کی بصیرت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، اور مہاجرت کے باوجود اُن کی شرافت و انسانیت میں وہی اگلا سا دم خم باقی ہے۔

۞

پنڈت بدری ناتھ، شگفتگو

قدرت بے حد بخیل ہے، دل کھول کر، کسی کو انعام نہیں دیتی وہ لاکھوں آدمیوں کو ٹھکرا کر، صرف دو ایک آدمیوں کو نوازتی ہے، اور اُن آدمیوں کو بھی صرف ایک عدد جوہر عطا کرتی ہے، اُس کو یہ بات، ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی کہ کسی فرد کو دو آنکھیں بخش دے اس لیے، اُس کے نوازے ہوئے، بالعموم کانے ہوتے ہیں، جن کو ''صاحب کمال'' تو کہا جا سکتا ہے، لیکن ''مجموعۂ کمالات'' کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔
مثلاً جب وہ کسی کو شاعری بخشتی ہے تو اُس کو نثر نگاری کا جوہر عطا نہیں کرتی، اسی طرح جس کو موسیقی کی دولت دیتی ہے، اُس کو نور کا گلا بخش کر، اُس کے گالوں کو بیچ کھا دیتی ہے، اور جس کو پھول سے گال مرحمت فرماتی ہے، اُس کے گلے میں کوّے لٹکا دیا کرتی ہے۔
لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ اُس بخیل قدرت نے، شگفتگو کو، وقتِ واحد میں، شاعری، موسیقی اور مصوری کے تین جوہر عطا فرما دیے ہیں۔ اور یہ وہ کھیل ہے، جو قدرت کی سرکار میں صدیوں کے بعد کھیلا جاتا ہے۔ اس بناء پر، وہ اس قابل ہیں کہ اُن کو مبارک باد دی جائے۔.......... ☆ حیات پر نگاہ کر کے، یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر اُن کو صرف ایک ہی فن کا جوہر عطا کیا جاتا تو اُن کو اُس فن میں حیاتِ جاوداں حاصل ہو سکتی تھی ___ انہیں ایک صدی قبل پیدا ہونا چاہئے تھا ___ اس لیے کہ اُن کی ذات میں جو عہدِ قدیم کی وضع داری، شرافت اور انسانیت پائی جاتی ہے، یہ دور اُس کی قدر نہیں کر سکتا ___ قدر کرنا تو بڑی بات ہے، یہ دور انہیں سمجھ ہی نہیں سکتا ہے ___ ، بڑے اچھے صوفی بھی ہیں، تمام دنیا سے محبت کرنا اُن کا شعار ہے، وہ کسی مذہب کے پیرو نہیں، اور اُس خدا کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، جو انہیں محسوس تو ہوتا ہے، لیکن وہ اُس کو ثابت نہیں کر سکتے، اور جب وہ اُس کے وجود پر دلائل، لاتے ہیں، تو اُن کے منہ سے دودھ کی خوش بو آنے لگتی ہے، اور بے ساختہ، جی میں آتا ہے کہ اپنی چھاتی سے لگا کر، اُن کا منہ چوم لوں۔

☆ ___ یہاں جو لفظ لکھا ہے وہ پڑھا نہیں جاتا

دیانرائن نگم[1]

کان پور کے ذی علم کائستھ، ماہ نامہ "زمانہ" کے لائق مدیر، وضع کے پابند، ہندو مسلم اتحاد کے حامی، ادب و شعر کے قدر رواں، اردو کے شیدائی، محبت و مروت کے پُتلے، کام کے پکّے اور دُھن کے پورے انسان تھے۔
کتنے کتنے ہندو منافرت کے جھکّڑ چلے، وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے، کیا کیا اردو کے خلاف آوازیں بلند کی گئیں، اُن کے کان پر جوں، تک نہ رینگی ___ اور بے انتہائی موانع و شدائد کے باوجود، وہ تقریباً نصف صدی تک اپنا پرچہ نکالتے رہے۔
انہوں نے، تیج بہادر سپرو، جسٹس سلیمان اور دیگر اکابرِ شہر کی دعوت کی تھی اور وصل بلگرامی کے توسط سے مجھے بھی کان پور پکڑ بلوایا تھا، وہ عجیب رات تھی، اور جب میں نے اپنی نظم بغاوت سنائی تھی تو سپرو صاحب خوف زدہ ہو گئے تھے، جسٹس سلیمان جھوم اُٹھے تھے، نگم صاحب کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی، اور میرے بہترین رُباعی گو، استاد بھائی جگت موہن رواں نے اپنی شیروانی کا گریبان، چرسے، پھاڑ ڈالا تھا۔
کدھر چلے گئے وہ تمام لوگ جو شعر سمجھتے تھے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے، اور فرنگی سے آمادۂ بغاوت!!

---

[1] ___ اُن پر ایک نظم کہہ چکا ہوں، جو میرے کسی مجموعہ میں شائع ہو چکی ہے۔ جی چاہے تو اُسے بھی دیکھ لیجئے۔
(جوش صاحب کی یہ نظم متصل صفحے پر ملاحظہ کیجئے)

نوٹ ______ گذشتہ صفحے میں زمانہ کانپور کے مدیر دیا نرائن نگم کے تذکرے کے حاشیے میں جوش صاحب نے لکھا کہ: ____ اُن پر ایک نظم کہہ چکا ہوں جو میرے کسی مجموعے میں شائع ہو چکی ہے۔ جی چاہے تو اسے بھی دیکھ لیجئے ____ '۱۱۵ اشعار پر مشتمل یہ نظم 'نگاہِ خلوص بیں' کے عنوان سے آیات و نغمات میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ مکتبۂ اردو لاہور سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ جوش صاحب نے فٹ نوٹ میں بہ انکسار یہ کہا ہے کہ' ____ جی چاہے تو اسے بھی دیکھ لیجئے ____ 'تو قارئین کے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے ہم اسے یہاں محفوظ کر رہے ہیں۔ دیا نرائن نگم کے نام کا شعری وزن بتا رہا ہے کہ جوش صاحب نے اسی نسبت سے بحر کا انتخاب کیا پہلے مقطع کو تخلیقی صورت عطا کی پھر باقی اشعار رنظم کیے:

نہ پوچھ ذوقِ سفر کو میرے، کہ اکثر اِس بزمِ آب و گِل میں
کبھی بیابانِ غم میں پہونچا، کبھی شبستانِ جم کو دیکھا

کبھی برہمن کا روپ بھر کر، کبھی حق آگاہ شیخ بن کر
ضیائے شمع و حرم کو جانچا، فروغِ بیت الصنم کو دیکھا

کبھی تفکر کی روشنی میں، فلک کو کھولا، زمیں کو پلٹا
کبھی صحافت کے آئینے میں، عرب کو پرکھا، عجم کو دیکھا

کبھی لیا درسِ زندگانی، کبھی سنی موت کی کہانی
کبھی کتابِ وجود کھولی، کبھی نصابِ عدم کو دیکھا

کبھی حوادث کے عُقدہ ہائے فساد انگیز پر نظر کی
کبھی زمانے کی کاکلوں کے جنوں فزا پیچ و خم کو دیکھا

کبھی دماغِ گرہ کشا نے، اساسِ علم و عمل کو تولا
کبھی نگاہِ کرشمہ بیں نے، بطونِ دیر و حرم کو دیکھا

کبھی جنوں خیز چھٹپٹے میں، ترنمِ آہ پُر فغاں کی
کبھی طلوعِ سحر کی رو میں، تبسمِ چشمِ نم کو دیکھا

کبھی طرب میں نگہ اُٹھا کر، کبھی تفکر میں سر جھکا کر
فلک کی رفعت نظر میں تولی، زمیں کے جاہ و حشم کو دیکھا

کبھی تمدن کے فرشِ گل پر، ٹھہر کے وحشت سے کی لگاوٹ
کبھی مصیبت کے راستے سے، پلٹ کے ناز و نعم کو دیکھا

کبھی یمِ بیکراں کے اندر، فقط ملا اک حقیر قطرہ
کبھی ہر اک قطرۂ سبک میں، خروشِ صد موج یم کو دیکھا

کبھی کلاہِ شہنشہی میں نظر پڑا کاسۂ گدائی
کبھی سرِ کاسۂ گدائی، شکوہ و طبل و علم کو دیکھا

کبھی لگاتار ارتقاء کی تلاشِ پیہم کے سلسلے میں
سراغ جہل و جنوں لگایا، بنائے سیف و قلم کو دیکھا

کبھی عداوت کے حاملوں کی، ہر اک ادا پر نگاہ ڈالی
کبھی محبت کے رہرؤوں کے، ہر ایک نقشِ قدم کو دیکھا

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے، کہ اِس پراگندہ زندگی میں
خیال ہر خیر و شر میں ڈوبا، مآل ہر بیش و کم کو دیکھا

مگر مجھے یہ بڑی خوشی ہے، کہ اس تماشائے نو بہ نو میں
مری نگاہِ خلوص بیں نے "دیا نرائن نگم" کو دیکھا

اُمید، امیٹھوی

فارسی میں اس قدر دستگاہ تھی کہ لاکھوں میں فرد تھے، اردو و فارسی زبانوں میں، اوسط درجے کے، اچھے شعر کہتے تھے، تحقیقِ الفاظ پر عبور حاصل تھا، اور نہایت اچھے سخن سنج تھے۔ لیکن چڑچڑے اس قدر کہ اللہ کی پناہ ہر چند میں اُن کا نیاز مند، ناز بردار اور خدمت گزار تھا، لیکن تصوف کی ایک بات پہ انھوں نے مجھ تک کو، ایک دن، بگڑ "دنیا کا کتّا" کہہ دیا تھا۔ اور جب میں نے یہ سن کر، گردن جھکا لی تھی تو وہ، آب دیدہ ہو کر، معافی مانگنے لگے، اُسی طرح، وہ قیامت کے بھولے بھی تھے، اور جب میرے ساتھ، وہ بمبئی گئے اور، زندگی میں پہلی بار انھوں نے سمندر پر نگاہ ڈالی تو، رو رو کر، مجھ سے کہنے لگے ارے اس بحرِ ذخار کو دیکھ کر اب تو خدا پر ایمان لے آیئے۔
اور جب ہم لوگ بمبئی کے محلّے "تاردیو" سے گزر رہے تھے اور میں نے [انہیں بتایا کہ] آپ جانتے ہیں، اس محلّے کا نام ہے تاردیو، آپ یہاں سے جہاں چاہیں، مفت تار دے سکتے ہیں، تو اپنے گھر تار دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور جب آگے چل کر، میں نے...... ☆ کے، بڑے بڑے آہنی ظروف دکھا کر یہ کہا دیکھئے امید صاحب، یہ جرمنی کے بم ہیں، انھوں نے انھیں، بڑے غور سے دیکھا اور مجھ سے، بڑے تشکر کے ساتھ، کہا، اللہ آپ کو سلامت رکھے، اگر آپ مجھ کو بمبئی ساتھ نہ لاتے تو ہٹلر کے یہ پھینکے ہوئے بم کیسے دیکھ سکتا۔
وہ لکھنؤ آ کر بس گئے تھے، اور، پے بہ پے حوادث کی بناء پر اس قدر مقروض ہو گئے تھے، کہ اُن کا مکان تک گروی ہو چکا تھا، اور قرض اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اُس کے ادا ہونے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہی تھی ایک روز بنارس باغ میں جب انھوں نے، آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھ سے یہ کہا تھا کہ جوش صاحب، خدارا کسی تعلقہ دار سے کہہ کر میرا قرض ادا کرا دیجئے، اور اسے کہیے کہ مجھ سے پٹہ لکھا لیں کہ میں جب تک جیوں گا، گرمیوں بھر اُن کا پنکھا قلی بنا رہوں گا، اور جاڑے میں اُن کی انگیٹھیاں دہکایا کروں گا تو ٹپ ٹپ میرے آنسو گرنے لگے تھے اور یہ سوچ کر، میرا دل بیٹھنے لگا تھا کہ اگر میری حالت پر زوال نہ آ جاتا تو میں امید صاحب کا تمام قرض ادا کر دیتا میں نے تین چار تعلقہ داروں سے کہا، سب ٹال گئے۔ صد حیف وہ قرض کا بار اُتارے بغیر، بصد حسرت و یاس مر گئے۔ آج وہ منوں مٹی میں دبے سو رہے ہیں اور میں زمانے کی شقاوت اور ناقدری کا ماتم کر رہا ہوں اے نامردم شناس ہندوستان، تجھ پر ہزار آفریں! ___ ☆۱

☆ ___ لفظ واضح نہیں ہے کہ کیا لکھا ہے۔

☆۱ ___ جوش صاحب نے اپنی نظم "آ لکھنؤ" (عرش و فرش، ۱۹۴۱ء بمبئی) میں امید امیٹھوی کا بھی ذکر کیا ہے (ص ۱۰۱)

کرشن چندر

ہندوستان کے افسانہ نگاروں کے بادشاہ، محبت واخلاص کے اوتار، قلم کے دھنی، درم سے محروم۔
جب زر سے پاک، رندی اور سرشاری میں بے باک، اور کسی نہ کسی گیسوئے خم دار میں ہمیشہ گرفتار ہونے میں،
ایک زمانہ دراز تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہ اور "شالی مار" میں کام کر چکے ہیں ☆۔ اُس کے بعد، انھوں نے،
خود پروڈیوسر بن کر، یہ چاہا کہ کم سے کم، یہ ہو جائے کہ زندگی آرام سے گزرنے لگے، لیکن ناکام رہے۔ ناکام
کیوں نہ رہتے، ہندوستان و پاکستان، بلکہ سارے ایشیا میں ابھی تک یہ عالم ہے کہ قلم خستہ حال تو بنا دیتا ہے،
مگر کبھی ٹکسال نہیں بنتا۔
ہندوستان نے، ابھی تک، پہچاننے کی طرح ان کو نہیں پہچانا ہے، جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، وہ
اُن کو پہچان جائے گا، اور جب وہ خاموش ہو جائیں گے، ہندوستان اُن کے غلغلوں سے گونجنے لگے گا۔ اُن کا نام
آبِ زر سے لکھا جائے گا، اور اُن کا ناشر دریائے زر میں پیرے گا، لیکن انھیں اُس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

☆ ____ جوش صاحب اپنی ایسی صحبتوں میں جہاں ان کے احباب کی یادیں اور باتیں اُن کا موضوع سخن ہوتیں، اُن میں وہ
کرشن چندر کو ضرور یاد کیا کرتے تھے۔ خود کرشن چندر کے دل میں بھی اُن کا بڑا احترام تھا۔ صہبا لکھنوی کے مرتبہ افکار جوش نمبر
(۱۹۶۱ء) میں جوش صاحب کے متعلق اپنی پیغام میں انہوں نے کہا ____ 'وہ میرے بزرگ رفیق اور شفیق دوست ہیں اور میں
اُن کے لاکھوں پرستاروں میں سے ایک ہوں اور ہر لحظہ اُن کی درازئ عمر کے لیے دعاگو ہوں...... اس برصغیر میں انہوں نے اس
وقت حریت، صداقت اور آزادی کا علم بلند کیا جب دوسرے لوگ انگریزوں کی شان میں قصیدے کہتے تھے ____' (ص: ۶۳۵)

مالک رام

عربی فارسی، اور تاریخِ اسلام سے، بخوبی واقف، تاریخ ادب کے زبردست ماہر، دریائے اخلاص و انسانیت کے شناور، اوپر سے ہندو، اندر سے مسلمان، اور غالب کے ایسے عظیم محقق ہیں کہ اُن کے انفاس کی آمد وشد اُن کے نبضوں کی رفتار اور اُن کے دل کی ضربات کو، اس دقیقہ سنجی کے ساتھ، گن چکے ہیں، کہ اس میدان میں کوئی اُن کے مقابلے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

۱۹۳۵ء میں جب میں دہلی کے محلّہ قرول باغ میں رہتا تھا، وہ بڑے پیارے پڑوسی اور، تقریباً روز آنے جانے والوں میں سے تھے۔ اگر ہندوستان کے حالات و مزاج میں زبردست تبدیلی نہ آچکی ہوتی، تو وہ ڈنکے کی چوٹ پر ''مشرف باسلام'' ہو چکے ہوتے، اور صرف وہی نہیں، میرے دہلی کے بیرسٹر دوست بالیشور پرشاد مصرا بھی، آغوشِ اسلام میں آجاتے، دونوں، میں صرف اس قدر فرق ہوتا کہ مالک رام وہابی، اور مصرا شیعہ ہو جاتے، اور گوپی ناتھ امن، رہتے تو ہندو، مگر محرم میں کالے کپڑے پہن کر مجالسِ عزاء میں ذاکری کرتے نظر آتے۔

ڈاکٹر صفدر، آہ سیتاپوری

جسم کے اعتبار سے، بسترِ حیات کی شکن۔ آدمی نہیں، آبگینہ، لیکن اخلاص و محبت کے اعتبار سے ایک سنگین حصار، بلکہ ہمالیہ پہاڑ ہیں۔ بمبئی میں رہتے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہیں پہلے "وال کیشر" میں قیام تھا، اب "اندھیری" کی تاریکیوں میں گم ہیں۔ اپنے مزاج کی نازکی کے باعث وہ فلم لائن میں پنپ نہیں سکے، اور غیر آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب کی ۱۹۶۷ء میں جب بمبئی گیا، لوگوں سے، گڑگڑا، گڑگڑا کر، کہا کوئی مجھ کو اُن تک پہنچا دے، یا اُن کو میری آمد کی خبر کر دے، لیکن کسی اللہ کے بندے نے دست گیری نہیں کی، اور مجھ کو، اُس پیارے دوست سے ملے بغیر ہی واپس ہو جانا پڑا۔

میرے زمانے میں اُن کا بچہ زیرِ تعلیم تھا، اب، ماشاءاللہ جوان ہو چکا ہوگا، معلوم نہیں اب کیا کر رہا ہے، مجھے اُس کی خاندانی شرافت سے اس کا یقین ہے کہ وہ اپنے قابلِ قدر وخوددار باپ کی ضرور خدمت کر رہا ہوگا۔

صد حیف کہ اس بار اُن کو نہیں دیکھ سکا، اور آہ آہ کرتا پاکستان آگیا۔ کون سی رات، آن ملیے گا؟

آغا جانی، کاشمیری

لکھنؤ کے باشندے، بمبئی کے ساکن، فلم لائن کے کام یاب اسٹوری رائیٹر، محبت کے پتلے، شرافت کے مجسمے، اور، اس وقت بھی صورت ایسی کے دُرود پڑھنے کو جی چاہے۔

جب کبھی بمبئی جاتا ہوں، وہ، صبح شام میرے پاس آتے، اور روز بالائی کھلاتے ہیں اُن کی بیوی بھی بڑی شائستہ و مہمان نواز ہیں۔ ایسی دعوت کرتی اور ایسے اچھے لوگوں کو بلاتی ہیں کہ کام ودہن کے ساتھ ساتھ، دماغ بھی شکم سیر ہو جاتا ہے۔ افسوس کہ آہ کے مانند، اس یار جانی سے بھی اب کی سفر میں ملاقات نہیں ہو سکی، میری بدقسمتی سے، وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے، اور اُن کی صورت اور بالائی کی لذت سے ترستا ہوا یہاں آگیا۔

اور یہ خدا ہی جانتا ہے کہ اب کبھی اُن کا دیدار ہو سکے گا کہ نہیں۔ صد حیف قریب کے لوگ دور ہو گئے اور دور کے لوگ قریب آگئے اور جب مروں گا تو گھر والوں کے سوا، کوئی پرانا دوست، بالیں پر موجود نہیں ہوگا۔

❁

ہری چند، اختر

اُن کا سا، تواترِ مصائب کا، خم ٹھونک کر، مقابلہ کرنے والا، کوئی انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ عمر بھر پریشان رہے اور عمر بھر ہنستے رہے۔ اُن کی بدبختی کی یہ انتہا تھی کہ جب اُن کے احباب کی دوڑ دھوپ کے بعد اُن کو نوکری مل جاتی تھی، تو چند روز کے بعد، وہ محکمہ ہی ٹوٹ جایا کرتا تھا اور وہ کہا کرتے تھے:

مرے چمن کی خزاں ، مطمئن رہے کہ یہاں
خدا کے فضل سے ، اندیشۂ بہار نہیں

وہ زیادہ تر ظرافت اور طنز کے شاعر تھے۔ دو شعر یاد ہیں، آپ بھی سن لیں:

نزاعِ خیر و شر کا یہ نتیجہ کون سمجھا تھا
خدا مغرور ، انساں جاں بلب ، شیطان باقی ہے

خدا تو خیر مسلماں تھا ، اس سے کیا شکوہ
مرے لیے مرے بھگوان سے بھی کچھ نہ ہوا

☆ جوش صاحب نے صفحہ ۱۱۱۴ پر پہلے غلام مصطفےٰ تبسم کی ذیلی سرخی قائم کی، لیکن اسے قلم زد کر دیا، پھر ہری چند اختر کا نام لکھ کر اُن پر یہ سطریں لکھیں جو پیشِ نظر ہیں۔ اس سے ۵ صفحات پہلے بھی پنڈت ہری چند اختر کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ نامکمل بھی ہے اور اس پر صفحہ نمبر بھی درج نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صفحہ نمبر ۱۱۱۴ پر ہری چند کے متعلق جو تعارفی حصہ لکھا وہی ایک حتمی تحریر ہے۔ بغیر نمبر کے صفحے پر اُن کی جو تحریر ہے وہ ادھوری ہے، حتمی تحریر کے مقابلے میں اس ادھوری تحریر میں جملوں کی ساخت مختلف ہے اور کوئی شعر بھی نقل نہیں کیا گیا۔ ملاحظہ کیجیے:

"____ اُن کا سا بد قسمت، اور تواترِ آفات کا خم ٹھونک کر، مقابلہ کرنے والا، کوئی انسان آج تک میری نظر سے نہیں گزرا، اُن کی بدبختی کی یہ انتہا تھی [کہ] وہ جس محکمے میں بھی ملازمت کرتے تھے، وہ محکمہ ہی ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ زندگی کے شدائد اس بات پر کمر باندھ باندھ کر، آیا کرتے تھے کہ ہم اختر کو رلا کر دم لیں گے، لیکن وہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، اس طرح قہقہہ مارتے تھے کہ اُن شدائد کا منہ اُتر جایا کرتا تھا۔ اسی طرح اُن کی شاعری میں بھی بڑی جان، اور بلا کی ظرافت تھی ____"

سید علی اختر

نام تھا سید علی، فرزند تھے سید کاظم علی صاحب باغ کے۔ آبائی وطن تھا حیدر آباد، مگر لڑکپن سے لے کر تقسیم ہندوستان تک، چوں کہ وہ دکن ہی میں رہے، اس بناء پر لوگ اُن کو حیدر آبادی کہنے لگے تھے۔

مولانا قدوس نے اُن کے باب میں ایک مضمون لکھا، اور سید ابوالخیر کو سنایا تھا۔ اُس مضمون میں قدوس نے یہ ثابت کیا تھا کہ اختر صاحب میری نظموں کے چربے اُتارتے ہیں، ابوالخیر نے، مزاح کے طور پر یہ بات اُن تک پہنچا دی، اور اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ، ہر چند وہ مضمون میں نے طبع نہیں ہونے دیا، لیکن وہ مجھ سے روٹھ گئے اور نیاز فتح پوری نے اُس بگاڑ سے فائدہ اُٹھا کر، میری قدح، اور اُن کی مدح میں ''نگار'' کے صفحے سیاہ کرنا شروع کر دیے۔

لیکن میں نے دیر تک یہ صورتِ حال قائم نہیں رہنے دی اور میرے اور علی اختر کے مابین مکمل صفائی ہو گئی، اور تا دمِ آخر قائم رہی۔

وہ بے حد پاک نفس اور بے پناہ مخلص انسان تھے۔ قدرت نے شاعری کا جوہر بھی، دل کھول کر، اُنھیں مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن زہد واتقا نے اُس جوہر کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔

وہ اُن بھولے بھالے جذباتی انسانوں میں سے تھے، جو، آنکھیں بند کر کے، خدا پر بے دلیل ایمان لے آتے۔ اور اپنی ساری زندگی اُس کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف کر دیا کرتے ہیں۔

وہ پیدائشی کم زور قواء کے انسان تھے، کراچی آکر، بیماریوں، زبوں حالیوں اور زار نالیوں نے اُن بے چارے کو اس طرح گھیر لیا کہ بالآخر انھوں نے دم توڑ دیا۔

اُن کا بیٹا نظر حیدر آبادی بڑا ہونہار شاعر تھا، وہ بے چارہ اُن کے بعد جوانی ہی میں سدھار گیا۔ اور وہ اس کے داغ سے بچ گئے۔ اب بھی جب اُن کے مکان کی سڑک سے گزرتا ہوں، دل پر بڑی چوٹ لگتی ہے، ضبط کرتا ہوں، پھر بھی آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔

❁

رزی، جے پوری

جہاں تک کہ شاعری اور انجمن آرائی کا تعلق ہے، وہ جے پور کی جان تھے۔ جے پور کی نبضیں اُن کے انفاس سے چلتی تھیں، اب جب کہ وہ پاکستان آ گئے ہیں، اُس شہر نے رنڈ سالہ پہن لیا ہے۔

ساری بہار تھی، اُسی دولھا کے دم کے ساتھ

آج کل حیدر آباد سندھ میں مدرّسی کرتے، اور، بڑی خاموشی کے ساتھ، زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔
وہ نہایت ذی علم، وسیع المطالعہ، اخلاص مند، تصوف پرست، اور اپنے عقائد میں اس قدر مضبوط انسان ہیں کہ جب اپنے خیالات منوانے پر اُتر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح، پہاڑ پر کھڑے، اعلانِ حق فرما رہے ہیں اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اُس کا ابطال ممکن ہی نہیں ہے۔
میرے دو ٹھنٹھنے دوست میرا ز عالم گیر قدر، اور میرزا جعفر حسین، اس قدر بلند آواز سے گفتگو کرتے ہیں کہ مکان کے درودیوار ہلنے لگتے ہیں۔ مگر رزی جے پوری، جن کو میں رعد الشعراء کہتا ہوں، جب بات کرتے ہیں تو ہمالہ تھر تھرانے لگتا ہے
ایک بار عالم گیر قدر بیٹھے تھے کہ رزی آ گئے۔ اور جب انھوں نے بولنا شروع کر دیا تو میں نے عالم گیر سے کہا اونٹ آج پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ اب اپنا ٹھنٹھناپن دکھاؤ تو جانوں۔ بس رہ گئے میاں تھجو۔
ایک مرتبہ وہ جے پور کے ہوٹل کے سہ منزلے پر بیٹھے، مجھ سے باتیں کر رہے تھے کہ نیچے سے منیجر گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا رزی صاحب خدا کے لیے آہستہ بولیے، مسافر، یہ سمجھ کر، اپنے اپنے بستر باندھ رہے ہیں کہ بالائی منزل میں بڑے قیامت کا بلوہ ہو رہا ہے۔
اب رہی اُن کی شاعری، سو میں، بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ وہ ہندوستان و پاکستان کے ہزاروں معروف شاعروں سے، بمراحل بلند شاعر ہیں لیکن گوشہ نشینی کے باعث وہ آج تک منظرِ عام پر نہیں آ سکے، ورنہ سیکڑوں کے چراغ بجھ جاتے، اُن کے بڑے آدمی ہونے کی یہ بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ وہ دوسروں کے اعتراف کمال میں بخل نہیں کرتے، اور ایسے الفاظ میں داد دیتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ شعر کے ہر لفظ کے سینے میں اُتر کر داد دے رہے ہیں، اور سنانے والے کا یہ سوچ کر جی خوش ہو جاتا ہے کہ حق، بحق دار رسید۔

۞

میرے خورد احباب[۱]

جن سے، میں، اپنے چھوٹے بھائیوں اور اپنے بچوں کی طرح محبت کرتا ہوں۔
اور جن میں،
اختر شیرانی، اور مجاز کے علاوہ، سب، ماشاءاللہ، بقیدِ حیات ہیں۔
اللہ ان سب کو شاد و بامراد اور، تا دیر، سلامت رکھے،
کہ اب انھیں کے دم سے اردو ادب آگے بڑھے گا۔

❁

---

[۱] تمام نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

فہرست بہ اعتبارِ حروفِ تہجی

☆ ___ جوش صاحب کے عکسی تحریر میں جو فہرست بہ اعتبارِ حروفِ تہجی ہمارے پیشِ نظر تھی اس میں مجتبیٰ حسین کا نام لکھنا اُن سے سہواً رہ گیا ہے جبکہ انہوں نے مجاز کے بعد مجتبیٰ حسین کا تذکرہ لکھا ہے ہم یہاں فہرست میں ان کا نام شامل کر رہے ہیں۔ مصطفےٰ زیدی کا تذکرہ کیونکہ یادوں کی برات میں آ گیا ہے اس لیے ان غیر مطبوعہ تحریروں میں ان کے تذکرے کو شامل نہیں کیا جا رہا۔

اختر شیرانی

رومانی شاعری میں یکتائے روزگار، دن رات کے بادہ خوار، ہمہ وقت سرشار، رندِ حیات سوز، پروانۂ خوبانِ شب افروز، فردا سے بیگانے، امروز کے پروانے۔

لاہور سے ایک ماہ نامہ نکالتے تھے، اُس کے چندے کا جو روپیہ آتا تھا، وہ پی جاتے، اور، دوسرے پرچے کی اشاعت کے لیے دوستوں کے دروازے کھٹکھٹاتے تھے۔

لاہور کا ذکر ہے، ایک بار وہ میرے ساتھ، موٹر میں بیٹھے، مال روڈ سے گزر رہے تھے، حرماں نصیب، حرماں خیر آبادی بھی ساتھ تھے کہ انھوں نے، فٹ پاتھ، اور سواریوں سے گزرتی ہوئی عورتوں، کو دیکھ دیکھ کر "ہائے مار ڈالا" کے نعرے لگانا شروع کر دیے ہر شخص ہم کو دیکھنے لگا، اور، موٹر رکوا کر، میں بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک بار دہلی میں میرے مکان پر ٹھہرے تھے، میں دن کے وقت شراب نہیں دیتا تھا۔ وہ پتھر بنے بیٹھے رہتے تھے، اور شام کو پی کر، بلبلا اُٹھتے تھے یہ کیفیت دیکھ کر میں نے اُن سے کہا تھا، اختر تم دن بھر کرۂ زمہریر اور رات ہوتے ہی کوہِ آتش فشاں بن جاتے ہو، میں تم سے کب ملاقات کروں۔

اُس زمانے میں دہلی کے ایک، بہت بڑے رئیس نے ہماری دعوت کی، اور انھوں نے خوب چھک کر پی تھی، اور جب کلام سنانے کا وقت آیا تو وہ اُٹھے، میزبان کے پاس گئے، اور، بڑی متانت سے کہنے لگے، جنابِ والا دعوت کا بے حد شکریہ، مگر اب ہم لوگ کلام سنائیں گے، مناسب یہ ہے کہ اب آپ زنانے میں چلے جائیں، میزبان اُن کا منھ دیکھنے لگے، تمام حاضرین پانی پانی ہو گئے۔ اور محفل بھیانک ہو کر رہ گئی۔

خدا بخشے بڑے ہونہار آدمی تھے، لیکن شراب کی تلوار سے انھوں نے اپنا گلا کاٹ لیا۔ اور، وقت سے بہت پہلے دنیا سے اُٹھ گئے۔☆

☆ ___ جوش صاحب اختر شیرانی کی شاعری کے بڑے قدر داں تھے اختر کی وفات پر انہوں نے لکھا تھا کہ ___ مرحوم اختر کی شاعری ایسی شاعری نہیں کہ اس پر چند سطروں میں خامہ فرسائی کی جا سکے۔ وہ کیا تھا، اور کیا کچھ ہو سکتا تھا اسے ایک دفتر درکار ہے۔ اختر ایک ایسا بے نظیر خواب اور ایک ایسا عدیم المثال رومانی شاعر تھا کہ صدیوں کے بعد ایسے شاعر پیدا ہوا کرتے ہیں۔
(ماہنامہ آج کل، دہلی، شمارہ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اختر، خیر آبادی

جاں نثار نام ہے، حضرت مضطر خیر آبادی کے فرزند ہیں، بمبئی میں قیام ہے، فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔ وہ، نامِ خدا، ایک زمانے میں، بے حد خوب رو تھے، جو نظر اُٹھاتا تھا، دیکھتا ہی رہ جاتا تھا__ اب چہرہ غروب، اور اُن کا فن طلوع ہو چکا ہے__ ماشاء اللہ، بہت خوش فکر شاعر ہیں، اور اُسی کے ساتھ ساتھ، نہایت مخلص اور نیاز مند بھی ہیں۔ اب کی بمبئی میں اصغری بیگم کی دعوت میں ملے تھے، میں نے ڈانٹا تھا کہ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے، اور انھوں نے، بڑی سعادت مندی کے ساتھ سر جھکا لیا تھا

ہر چند بمبئی میں ان کا کام چل رہا ہے، مگر حالات اُستوار نہیں ہیں۔ اگر وہ بنیادی طور پر شگفتہ نہ ہوتے تو مُرجھا چکے ہوتے۔

آزاد

جگن ناتھ نام، حضرت تلوک چند محروم کے فرزند، حکومتِ ہند میں افسر اطلاعات، خوش فکر سے زیادہ خوش گلو، اور عاشق مزاج انسان ہیں۔ ایک زمانے میں بسمل ٹونکی کے "رقیب روسیاہ" بھی رہ چکے ہیں۔ تقریباً سات آٹھ برس وہ "آج کل" کے نائب مدیر اور میرے رفیقِ کار رہے ہیں ☆ اُس دور میں وہ سراپا نیاز تھے، نیاز مند آج بھی ہیں، لیکن وہ بات باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن میرے دل میں اُن کی محبت آج تک باقی ہے، جب کبھی دہلی جاتا ہوں، اُن کو گلے لگا لیتا ہوں۔

☆ ___ جگن ناتھ آزاد اگست ۱۹۴۸ء سے دسمبر ۱۹۵۳ء تک دہلی سے نکلنے والے ادبی رسالے 'آج کل' کے نائب مدیر رہے، جبکہ جوش صاحب اگست ۱۹۴۸ء سے دسمبر ۱۹۵۵ء تک اس رسالے کے مدیر تھے۔

جذبی

معین احسن نام ہے، لکھنؤ میں رہتے تھے، اب علی گڑھ یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔ ایک زمانے میں سوشلسٹ تھے اب نہیں معلوم کیا ہیں۔ معاش کے دھندے نے اُن کو بُری طرح جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر زمانہ فرصت دیتا تو دوسرے فانی بن جاتے۔ مدت سے میں نے اُن کو نہیں دیکھا ہے، دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے، کیا کروں، میں کراچی میں ہوں، اور وہ علی گڑھ میں۔ ملاقات ہو تو کیوں کر ہو، بہر حال اُن کے تصور سے جی بہلا لیا کرتا ہوں۔ اور پھر مغموم ہو جاتا ہوں۔

جمال

نام حکیم محمد نبی خاں ہے، دہلی کے حاذق طبیب اور نام ور سیاسی راہ نما حکیم محمد اجمل خاں کے مایۂ ناز پوتے، نہایت کام یاب طبیب، اور بے حد مخلص انسان ہیں۔ اب جب لاہور جاتا ہوں انھیں کے وہاں قیام ہوتا ہے__ اور وہ میری مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔
اُن کا جمال آج تک باقی ہے، اور چہرہ پر ایسی شگفتگی اور تبسم میں اس قدر گھلاوٹ ہے کہ اُنھیں دیکھ کر، دل کی کلی کھل جاتی ہے اور یہ دیکھ کر، بے حد مسرت ہوتی ہے کہ وہ مہاجرت میں بھی، دہلی کی طرح، نہایت آسودہ حال اور فارغ البال ہیں__ اللہ اور فراغت دے، اور مزید پروان چڑھائے۔

رعنا، جگی

دہلی کے سب سے زیادہ طویل القامت، اور نہایت بلند خیال و وسیع الفکر شاعر، اور سعادت مندی میں یگانۂ روزگار، جب دہلی جاتا ہوں، اُن کو اپنے گردو پیش پاتا ہوں، مجھ کو حیرت ہے کہ وہ قطعی رند نہیں، پھر بھی ایسے اچھے شعر کہتے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے ابھی وہ اور بھی چمکیں گے، انشاء اللہ۔

سبطِ حسن

لکھنؤ سے، مجاز، جذبی، اور علی سردار جعفری کے ساتھ "نیا ادب" نکالتے تھے، اور پھر، بمبئی جا کر، کمیونسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں کام کرنے لگے تھے ___ پاکستان آئے تو لاہور سے ایک رسالہ نکالا ___ جس پر حکومت نے قبضہ کر لیا ☆ ___ اب ایک بڑی انشورنس کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔ اور اُسی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی اعلیٰ پیمانے کی کتاب بھی لکھ رہے ہیں، یعنی۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی

آدمی بڑے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ، لاکھوں مہاجرین کی طرح، کراچی کی آب و ہوا، اُن کے خلوص میں بھی زنگ لگا چکی ہے ___ پھر بھی، لاکھوں سے بہتر ہیں۔

وہ بڑے حسین تھے، اور فراق نے، اُنھیں غور سے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ پہلے بڑا خراب آدمی ہے اور جب میں نے کہا تھا کہ تم اتنے پیارے انسان کو خراب آدمی کہہ رہے ہو تو انھوں نے جواب دیا تھا تم اس کی پیشانی کو نہیں دیکھ رہے ہو، جس پر بخطِ جلی درج ہے کہ میں ہم آغوشی کا موقع کبھی نہیں دوں گا ☆۱۔

☆ ___ سبطِ حسن کے شاگردِ رشید، ان کی فکر کے امین، کراچی یونیورسٹی میں پاکستان اسٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر اور ہمارے دوست، ڈاکٹر سید جعفر احمد نے اس بارے میں میرے استفسار پر جو باتیں بتائیں اُن کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ میاں افتخار الدین نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (پی پی ایل) کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا جس کے تحت تین مطبوعات سامنے آئیں۔ پاکستان ٹائمز (انگریزی)، امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار۔ لیل و نہار پہلے سے نکل رہا تھا اس کا ڈکلیریشن کسی اور کے پاس تھا۔ پھر یہ بھی پی پی ایل کے تحت آ گیا۔ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض صاحب تھے، امروز کے احمد ندیم قاسمی جبکہ سبطِ حسن لیل و نہار کے ایڈیٹر تھے، اور ان تینوں مطبوعات کے چیف ایڈیٹر فیض صاحب تھے ایوب خاں کے مارشل لاء کے بعد ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ دو تین ماہ بعد یہ لوگ رہا ہو گئے تھے۔ ایوب خاں نے پی پی ایل کو سرکاری کنٹرول میں لے لیا تھا۔ میاں افتخار نے ان تینوں حضرات سے کہا کہ آپ لوگ اپنا کام جاری رکھیں مگر یہ لوگ خود مستعفی ہو گئے تھے۔

☆۱ ___ سبطِ حسن صاحب سے متعلق جوش صاحب کی یہ تحریر صرف پہلے ایڈیشن کا حصہ تھی۔ بعد کے ایڈیشنوں میں یہ شامل نہیں ہے، مقدمے میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں سبطِ حسن کے تذکرے میں جو آخری دو سطریں تھیں وہ قلمی نسخے میں نہیں ہیں ان کا اضافہ اشاعت کے وقت جوش صاحب نے کیا تھا، وہ سطریں یہ ہیں: "___ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری اس زیرِ نظر کتاب اور طباعت کا بار اُٹھایا اور اب مطبع کی اُلجھنوں کو سلجھا رہے ہیں ___"

سجاد ظہیر

آسمانِ شرافت کے ماہِ منیر، جسٹس وزیر حسن صاحب کے فرزندِ بے نظیر۔ اودھ کی کمیونسٹ پارٹی کے سردار، قصرِ ترقی پسندی کے معمار☆، پہلے بمبئی میں تھے اب دہلی میں رہتے ہیں۔ اُن کی ذات سیاست و شرافت اور ادب و انقلاب کا مجموعہ ہے۔ اب، نام خدا شعر بھی کہنے لگے ہیں ___ چہرے پر ایسی معصومیت، اور ایسا بھولا پن ہے کہ جب اُنھیں دیکھتا ہوں، پیار آنے لگتا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ میرے بعد وہ میرا مرثیہ ضرور کہیں گے، لیکن کان کھول کر سن لو سجاد ظہیر، عرف "بنے میاں" کہ میرا مرثیہ اگر معرا نظم میں لکھو گے تو میدانِ حشر میں ایسی لنگڑی ماروں گا کہ دھڑام سے، چاروں خانے چت، گر پڑو گے۔

سردار

علی سردار جعفری نام ہے، پہلے کمیونسٹ پارٹی کے بڑے سرگرم رُکن تھے۔ اب بال بچوں نے اُن میں عقلِ معاش پیدا کر دی ہے۔ بمبئی میں رہتے ہیں وہاں سے ایک نہایت معیاری ماہ نامہ☆۱ نکالتے ہیں، اور لالہ یودھ راج کے علمی و ادبی ادارے کے سکریٹری ہیں طبیعت میں بڑی اُپج ہے، مُعرا نظم میں بھی آب دار شعر نکال لیتے ہیں۔
جب لکھنؤ میں تھے، دس دس بجے دن تک سویا کرتے تھے، اور اس کاہلی کی بنا، پر میں اُن کو "پڑوا" کہا کرتا تھا، آزادیٔ ہند کے روز انھوں نے بمبئی میں ایک مسرت کا جلوس نکالا تھا، جس میں ہم سب، سڑکوں پر ناچے تھے، اور انھوں نے رقاصِ اعظم کا پارٹ کیا تھا

☆ ___ ترقی پسند تحریک کی ادبی، تہذیبی و تاریخی روداد پر مشتمل کتاب 'روشنائی' میں سجاد ظہیر نے جوش صاحب کو ترقی پسندوں کا پیرِ مغاں قرار دیا ہے (روشنائی، مکتبۂ اردو لاہور، طبع اوّل، ۱۹۵۶ء، ص: ۳۸)

☆۱ ___ جوش صاحب کا اشارہ سہ ماہی جریدے 'گفتگو' کی طرف ہے جس کا اجراء ۱۹۶۷ء میں بمبئی سے ہوا سردار جعفری اس کے مالک بھی تھے اور ایڈیٹر و ناشر بھی۔

شاد

نریش کمار نام، اور دہلی میں قیام ہے۔ پہلے اس بُری طرح پیتے تھے کہ رندوں تک کو گھن آتی تھی،
اب شراب چھوڑ کر، ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' کے کلیے کو توڑ دیا ہے
ممکن ہے، بہت بُری طرح پینے والوں کو اُن کی یہ بات بُری لگی ہو، مگر اچھی طرح پینے والے، اُن کی ترکِ مے کو بڑی اچھی نظروں سے دیکھتے، اور اُن کی عقل کی استواری اور اُن کے عزم کے استحکام کی داد دے رہے ہیں۔
وہ شاعر اور نہایت نادرہ گفتار شاعر ہیں، اور، اسی کے دوش بدوش، ایک بہت اچھے نقاد بھی ہیں۔ اللہ عمر دراز کرے۔

شکیل بدایونی

بمبئی میں رہتے، اور فلمی گیت کہتے تھے۔ بدایوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ فانی کے بعد، اُس نے شکیل کو جنم دیا تھا، فانی کی شاعری کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں، ان کی شاعری کے لبوں پر تبسم کی موجیں تھیں، اب کی بمبئی گیا تھا، وہ بیمار تھے، لیکن اپنی تیمارداری کے واسطے انھوں نے ایک ایسی لیلیٰ جمال کو منتخب کرلیا ہے کہ میں سمجھتا ہوں اب وہ بالکل تن درست ہو چکے ہوں گے۔ ☆ اس لیے کہ:

روئے نکو، معالجۂ درد زندگیست
ایں نسخہ، از بیاضِ مسیحا گرفتہ ایم

☆ ــــ شکیل بدایونی کے نام کے پیچھے جوش صاحب نے بعد میں 'مرحوم' کے لفظ کا اضافہ کیا ہے۔

عرش، ملسیانی

بال مکند نام ہے، اردو کے آخری مایۂ ناز استادِ فن حضرت جوش ملسیانی کے، فرزند ہیں۔ ''آج کل'' میں میرے رفیقِ کار۔ اور سچ پوچھیے تو میں برائے نام، اور وہ فعال مدیر تھے☆ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار بلونت سنگھ، پنڈت ہری چند اختر اور جگن ناتھ آزاد بھی، برابر میرا ہاتھ بٹاتے تھے، لیکن وہ نہ ہوتے تو ''آج کل'' اس خوبی کے ساتھ نہ چلتا۔

وہ، میرے ابتدائی دور میں ایک عجیب قسم کی پگڑی باندھ کر دفتر آیا کرتے تھے، لیکن جب میں نے اُن کو ''پٹواری'' کہنا شروع کردیا، تو انھوں نے، شرما کر، پگڑی ترک کردی۔

اُن کے پاس میرے، بہت سے خط محفوظ ہیں، اگر انھوں نے چھاپ دیے تو بعض خط پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں بفضلہٖ نہایت فحش نگار بھی ہوں۔

وہ پہلے، بڑے ترنم کے ساتھ کلام سناتے تھے، اب عمر ڈھل جانے کے بعد تحت اللفظ سنانے لگے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ماہ و سال کے اعتبار سے وہ کبھی جوان تھے، لیکن گفتار و کردار کے نقطۂ نظر سے، اُن پر کبھی جوانی آئی ہی نہیں، جوانی کا وظیفہ ہے ہنہنانا اور وہ کبھی خیر سے ہنہنائے ہی نہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوا ہے کہ اُن کی طبیعت میں دوستوں کی محبت کا مادّہ تھا، اور وہ مادّہ بھی خارج ہو چکا ہے۔ اور خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔

☆ ___ دہلی سے شائع ہونے والے معروف ادبی رسالے آج کل کے تعلق سے عرش ملسیانی اور جوش صاحب میں بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ جوش صاحب اگست ۱۹۴۸ء سے دسمبر ۱۹۵۵ء تک اس رسالے کے مدیر تھے بالکل اسی مدت میں عرش ملسیانی اُن کے تحت، حلقۂ ادارت میں شامل تھے۔ جوش صاحب کا جب آج کل سے تعلق ختم ہوا تو پھر ملسیانی نے ان کی ذمہ داری سنبھال لی اور وہ جنوری ۱۹۵۲ء سے اکتوبر ۱۹۶۷ء تک آج کل کے مدیر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں عرش ملسیانی کے مجموعۂ کلام 'چنگ و آہنگ' (دہلی، ۱۹۵۳ء) کا دیباچہ رقم کرتے ہوئے جوش صاحب نے لکھا ہے کہ '___ انہیں ایک دن بھی نہیں دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک سال گزر چکا ہے ___'

فیض

نام ہے فیض احمد۔ میں اُن کو اُس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ ایک گم نام طالب علم تھے۔ اُس وقت وہ بے حد ملنسار اور قیامت کے صاحب مہر و محبت انسان تھے۔ اور اب، عرش [ملسیانی] کی طرح خشک ہو کر، رہ گئے ہیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اُن کو یہ ہو کیا گیا ہے۔
افسوس کہ اُن کو میرے آغوش سے چھین کر، بڑے غلط قسم کے لوگ، اپنے کاندھوں پر بٹھائے پھر رہے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ انھیں اُن کے جوہر، نیز اُن کی پختگی و خامی، دونوں کا کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اور میرا یوسف جمال، اندھوں کا ممدوح بنا ہوا ہے۔☆

☆ ___ یادوں کی برات کے کراچی ایڈیشن (۱۹۷۰ء) میں فیض صاحب کا تذکرہ نہیں ہے۔ جوش صاحب کی خودنوشت کے گمشدہ صفحات جو دستیاب ہوئے ہیں، پیشِ نظر تذکرہ اسی کا حصہ ہے۔ لاہور ایڈیشن (۱۹۷۵ء) میں بھی اُن کا ذکر شامل ہے جو مندرجہ بالا سے الگ ہے ملاحظہ کیجیے: "___ کیا کہنا میاں فیض کا، ڈنکے پٹے ہوئے ہیں پورے پاکستان میں، اور کیوں نہ ڈنکے پٹیں کہ یہ اُس کے، بہمہ وجوہ مستحق ہیں۔ میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب کوئی انھیں جانتا ہی نہ تھا اور اُس دور میں جب کبھی میرا لاہور آنا ہوتا تھا، تو یہ، شام کے وقت میرے پاس بلاناغہ آیا کرتے تھے۔ اب میرے پاس کم آنے لگے ہیں اور میں اُن سے کہہ سکتا ہوں کہ میاں فیض

حریفِ بزمِ تو بودم، چو ماہِ نو بودی
کنوں کہ ماہِ تمامی، نظر دریغ مدار

فیض صرف اچھے شاعر ہی نہیں، اچھے آدمی بھی ہیں اور میرے اس قول کے مُصدق ہیں کہ حقیقی شاعر، کبھی بُرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔
ہر چند نہایت آب دار شعر کہتے ہیں، لیکن اس قدر بُری طرح پڑھتے ہیں کہ سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔

حدیثِ متواتر کے طور پہ سُن رہا ہوں کہ جالندھر کے حفیظؔ صاحب، فیضؔ کی شہرت و مقبولیت سے بے حد چراغ پا ہیں، اور کہتے ہیں ارے کل کا لونڈا، اس قدر مقبول ہو گیا کہ لوگ مجھ "ابوالاثر" کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

ایں طفلِ یک شبہ، رہ صد سالہ می زند

ارے فیضؔ پڑھتا نہیں گھانس کاٹتا ہے، اور میں گا گا کر، مُرکیاں لے لے کر زِرت کر کر کے اور انگشتِ شہادت کے سرے کو انگوٹھے کی نوک پر جما کر، گھوتے چھلّے بناتا، بار بار گردن لچکاتا رہتا ہوں، پھر بھی لوگ اس قدر بدمذاق ہیں کہ مجھ کو ٹھینگا دکھا رہے ہیں۔ ارے غضبِ خدا کا میں پکّا مسلمان، اور شاہنامۂ اسلام کا مصنف ہو کر فردوسی کو نیچا دکھا چکا ہوں، اور اس کے برعکس فیضؔ ملحد ہے، غدارِ وطن ہے، اور پھر بھی دنیا اس کی طرف ڈھلتی جا رہی ہے۔

اور میں اُن خبیا گر شاعر صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ:

طمع چہ می بری، اے سُست نظم، بر حافظؔ
قبولِ خاطر و حسنِ سخن، خداداد است

____ (ص: ۷۵۲، ۷۵۳)"

ماہنامہ افکار کے فیض نمبر اپریل مئی جون ۱۹۶۵ء میں بھی جوشؔ صاحب نے فیضؔ صاحب کی شخصیت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

۞

کیفی اعظمی

اعظم گڑھ کے رہنے، اور بمبئی میں فلمی گیت کہنے والے شاعر ہیں___ پہلے کیمونسٹ پارٹی کے بڑے سرگرم کارکن تھے اب ایک عدد بیوی اور چند بچوں کے کفیل ہیں۔ ☆
اگر زمانہ اُن کو فلمی گانے کہنے پر مجبور نہ کر دیتا، اور، اُسی کے ساتھ ساتھ، اگر اپنی محبوبہ کے ساتھ، اُن کی شادی، اس قدر تڑپ نہ ہو جاتی تو قدرت نے اُن کو جو زبردست جوہرِ شاعری عطا فرمایا تھا، وہ نکھر کر اس طرح پختہ ہو جاتا کہ وہ ایک عظیم شاعر بن جاتے، میں، فقر و فرقت کا قائل نہیں، اس لیے کہ اُن کا تسلسل خطرناک ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ شاعری اُبھرتی ہے، گاہ گاہ کے ناسازگار حالات اور تا دیر مفارقتِ محبوب کے آفات میں۔ افسوس کہ وہ ان دونوں سے دور ہو کر رہ گئے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اب بھی وہ ایسی نظمیں کہنے پر قادر ہیں کہ انھیں سن کر غبطہ ہوتا ہے۔

۞

☆___ ارتقا ادبی فورم کراچی اور بزمِ جوش کینیڈا کے زیرِ اہتمام مارچ ۱۹۹۹ء میں کراچی کے نیپا آڈیٹوریم میں جوش صدی تقریبات کا انعقاد ہوا ۲۰ رمارچ کو جوش سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے کیفی اعظمی صاحب نے اپنی شادی میں جوش صاحب کی شرکت اور اُن سے محبتوں کی دلچسپ روداد سنائی۔ جوش صاحب کی محفلوں کے صحبت یافتہ خورشید علی خاں جو کیفی اعظمی کے برادر نسبتی بھی تھے، اپنی کتاب 'کیفی اعظمی شخصیت و فن کے آئینے میں' (۱۹۹۵ء، کراچی) ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء کو بمبئی میں کیفی صاحب کی تقریبِ شادی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں
'___ اس تقریب میں حضرت جوش ملیح آبادی بھی شریک تھے جن کے سر پر تمام شعرا نے افشاں مل دی تھی اور وہ اسی طرح ستارہ بار سرِ اقدس لیے گھومتے رہے وہ اس شادی سے بہت خوش تھے___ ' (ص ۷۷) خورشید علی خاں کی ہمشیرہ اور کیفی اعظمی کی بیگم شوکت کیفی نے بھی اپنی کتاب 'یاد کی رہگزر' میں اپنی شادی کی کچھ یادیں قلم بند کی ہیں جس کا ایک اقتباس یہ ہے " ___ پھر مہدی، منیش نے شرارت سے کہا، جوش صاحب حیدرآباد کے رواج کے مطابق دولہے کے باپ کے سر پر افشاں ملی جاتی ہے۔ اس وقت تو کیفی کے باپ آپ ہی ہیں، معصوم جوش تیار ہو گئے۔ مہدی، اشفاق بیگ، منیش سب نے مل کر ان کے گنجے سر پر خوب افشاں ملی سب لوگ خوب ہنسے، مٹھائی تقسیم ہوئی___ " (مکتبہ دانیال، کراچی ۲۰۰۶ء، ص: ۶۹) جوش صاحب نے بھی، قلمی نسخے میں مجاز پر لکھتے ہوئے شادی کی اس تقریب کا تذکرہ کیا ہے (ملاحظہ کیجیے، پیشِ نظر کتاب میں مجاز کا تذکرہ)

گل زار

دہلی کے قدیم باشندے، یادگارِ داغ، حضرت زار کے فرزند اور کشمیری پنڈت ہیں۔ وہ اردو کے اس قدر زبردست حامی ہیں کہ جن سنگھی ہندو اُن سے خار کھانے لگے ہیں۔
وہ ایک ادبی انجمن کے سکریٹری ہیں، جس کی نشست ہر اتوار کو ہوتی رہتی ہے، اور میں جب دہلی جاتا ہوں، وہ میرے اعزاز میں ایک اہم مخصوص نشست کا اہتمام کر کے، میری عزت بڑھاتے ہیں۔
خوب رو، اب بھی ہیں، مگر ایک زمانے میں تو اس قدر حسین تھے کہ اُن کے روبرو، بڑے بڑے مُلاؤں کی ٹھڈیاں اُچکنے اور داڑھیاں کانپنے لگتی تھیں۔ اور، بڑے بڑے پانڈے، ہے رام، ہے رام، پکارنے لگتے تھے۔ میرے اُن کے مابین جیسی محبت پہلے تھی، اب بھی قائم ہے، دہلی جاتا ہوں تو وہ ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔
لیکن تمام خوبیوں کے باوصف، وہ ایک مستقل جلد بازی، ایک چھلاوا، ایک ہلچل اور ایک ایسا زبردست شور و غوغا ہیں کہ الامان والحفیظ۔ وہ باتیں نہیں کرتے، بم باری فرماتے ہیں۔

مجروح، سلطان پوری

پہلے جگر مرادآبادی کے مرید تھے، اب مارکس کے معتقد ہیں۔ بمبئی میں قیام اور فلمی گیتوں کا کام ہے۔ انھوں نے، چشمِ بددور، شاعری و دیدہ وری، دونوں میں بڑی ترقی کی ہے۔ جیسی موہنی صورت ہے، ویسی ہی پاکیزہ سیرت ہے۔ وہ مال، جمال اور کمال، ان تینوں، صفات کے حامل ہیں۔ جب کبھی بمبئی جانا ہوتا ہے، وہ مجھے کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے، اور اس قدر سعادت مندی سے پیش آتے ہیں کہ بیٹے کا مزا آنے لگتا ہے۔

مجاز

اُس :۔ خوش درخشید، ولے شعلۂ مستعجل بود' جوانہ مرگ کا نام تھا اسرار الحق، جو، دراصل، حق تھا، بشکل مجاز۔ اُس کی ذات سے، میری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ ایک شاعرِ عظیم بننے کے واسطے پیدا ہوا تھا۔ لیکن صد حیف کہ بے تحاشہ پینا، اُسے، قبل از وقت کھا گیا ☆

میں نے اپنے اُس قوتِ بازو، اور نورِ نظر کو مخاطب کر کے ایک ''پند نامہ'' کہا تھا۔ جس کو سن کر، اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے، اور اُس نے مجھ سے، رو رو کر کہا تھا

''جوش صاحب آپ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے، اس کا اندازہ آج ہوا، میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا، اور دن کے وقت شراب کے قریب نہیں پھٹکوں گا۔''

لیکن وہ بیچارہ اپنی افتادِ مزاج سے مجبور ہو کر، میری نصیحت پر عمل نہیں کر سکا۔

میں بار بار کہہ چکا ہوں، اور جب بھی موقع آئے گا بار بار اس بات کو دہراؤں گا کہ زندگی صرف اعتدال کا نام ہے اور تمام انفس و آفاق کا وجود فقط اعتدال پر قائم ہے۔

لیکن، انسان کے اس بدویت آمیز دورِ ارتقاء میں اعتدال سب سے زیادہ مشکل بات، اور شراب کے معاملے میں تو قطعاً نہ سہی، تقریباً محال ہے۔

اس لیے مجاز اعتدال حاصل نہیں کر سکا، اور سعادت حسن منٹو، اختر شیرانی، چراغ حسن حسرت اور مجید لاہوری کی طرح یہ کہتا ہوا، چل بسا:

تھا، جن کو، جن کو، عشق کا آزار، مر گئے
اکثر، ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

☆___ پیشِ نظر کتاب کے مقدمے میں یہ گفتگو ہو چکی ہے کہ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن میں مجاز کا تذکرہ کیوں شامل نہیں تھا؟ اور ترمیم شدہ ایڈیشن میں کیوں شامل کر لیا گیا۔ گزشتہ صفحات میں مجاز کا تذکرہ اُس تذکرے سے جدا ہے جو یادوں کی برات میں شائع ہو چکا ہے اس لیے مجاز کے بارے میں جوش صاحب کی یہ غیر مطبوعہ تحریر اس کتاب میں محفوظ کر لی گئی ہے۔

ایک بار، کسی نے مجاز کو نصیحت کی تھی کہ دیکھو جوش صاحب کے مانند، شراب کی ایک مقدار معین کو، شام کے وقت، گھڑی سامنے رکھ کر، پیا کرو، اس کا اُس نے جواب دیا تھا کہ

"جناب والا، جوش صاحب گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں، یہ رسم انھیں کو مبارک ہو، اگر ہمارا بس چلے تو ہم گھڑا سامنے رکھ کر، پیا کریں۔"

کالج سے فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد، اُس نے علم سے رشتہ منقطع کر لیا تھا، کتب بینی تو بڑی چیز ہے، وہ اخبار تک نہیں پڑھتا تھا اُس کے صرف دو کام رہ گئے تھے، اپنی طاقتِ برداشت سے زیادہ پینا، اور ذکرِ خوباں کے سہارے جینا۔

وہ رزق کمانے کو بھی ایک فعلِ عبث خیال کرتا تھا۔ ایک بار چند حسین لڑکیاں، میرے مکان کے سامنے سے گزر رہی تھیں اور جب وہ ان کو دیکھ کر تڑپنے لگا تو میں نے کہا ارے کم بخت، کم سے کم، انھیں خوش جمالوں کے حصول کی خاطر، کوئی ایسا کام شروع کر دے کہ تیری جیب بھر جائے اُس نے کہا کہتے تو آپ ٹھیک ہیں، پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

کثرتِ بادہ خواری نے ایک بار اُسے پاگل بھی بنا دیا تھا۔ کچھ روز کے بعد اچھا تو ہو گیا، لیکن مرتے دم تک شدید سنک میں مبتلا رہا۔

آخری عمر میں وہ تھرڈ ریٹ پر اُتر آیا اور سفہاء کے ساتھ ہر رات کو، لکھنؤ کے متعدد شراب خانوں میں جا جا کر پینے لگا تھا۔ اور اس نے اس عادت کا نام رکھا تھا "ٹھیکے کمانا" اور اسی عادت نے، آخرِ کار، اُس کی جان لے لی، اور ایک ٹھیکے ہی میں روح پرواز کر گئی۔

انتقال سے چند روز پیشتر وہ دہلی آ کر مجھ سے ملا تھا، اُس زمانے میں اُس کی سنک زوروں پر تھی، اس نے میرے دوست شنکر پرشاد، چیف کمشنر دہلی کو ٹیلی فون کیا کہ مجھے سو روپے کی ضرورت ہے۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے اُسے بہت ڈانٹا پھٹکارا، میرے سامنے تو وہ کچھ نہیں بولا لیکن مجھ سے بگڑ کر، اُس نے میرے خلاف چند شعر کہے، اور شہر بھر میں سناتا پھرا، اُس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے، آپ بھی سُن لیں:

جو گزرتی ہے قلبِ شاعر پر
شاعرِ انقلاب کیا جانیں

میں نے، ایک روز اُس سے کہا "کیوں مجروے (مجاز) تو نے میری ہجو کہی ہے" وہ میرے قدموں پر گر پڑا اور میں نے اس کو گلے لگا لیا۔ لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک بار وہ شام کو میرے پاس قہقہے لگاتا آیا، اور کہنے لگا کہ

"ابھی میں رفیع احمد خاں کے وہاں سے آ رہا ہوں، وہ مجھ سے باتیں کر رہے [تھے] کہ اُن کے نوکر نے آ کر کہا کہ آپ کے باورچی نے کہا ہے کہ آپ ہماری تنخواہ ڈیوڑھی کر دیں، ورنہ ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔ خاں صاحب، نے ڈنڈا تان کر کہا، بلاؤ باورچی کو۔ باورچی آیا، اُن کے

تیور اور اُن کے ڈنڈے کو دیکھ کر سہم گیا۔ انھوں نے اُس سے، ڈانٹ کر پوچھا تم نے مجھ سے کیا کہلا بھیجا ہے، باورچی نے ڈرتے ڈرتے، کہا میں نے یہ کہلوا بھیجا تھا کہ خاں صاحب ہماری تنخواہ ڈیوڑھی کر دیں، ورنہ ____ رفیع احمد خاں "ورنہ" سنتے ہی اپنا ڈنڈا اُٹھا کر کھڑے ہو گئے اور کہا اگر ہم تنخواہ نہیں بڑھائیں گے تو تُو کیا کرے گا، بول۔ باورچی نے کہا ورنہ اسی تنخواہ پر نوکری کرتے رہیں گے"۔

اور جب وہ پی چکا تو گانے لگا:۔ ورنہ اسی تنخواہ پر" "ورنہ اسی تنخواہ" پر" ہاں ہاں اسی تنخواہ پر" " ورنہ اسی تنخواہ پر" اور ہنستے ہنستے ہم سب کا بُرا حال ہو گیا۔

ایک بار جذبی میرے پاس بیٹھے تھے کہ مجاز آ گیا، آتے ہی جذبی سے پوچھا

"تمہارا ڈاکٹریٹ کا تھیسس طیار ہو گیا کہ نہیں"

اور جذبی نے جب یہ کہا کہ "ابھی نہیں" تو اُس نے کہا

"جوش صاحب یہ جذبی جو میرے سامنے بیٹھا ہے، میں اُس کے بارے میں، یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کو تھائی سس ہو جائے گا، مگر یہ تھیسس نہیں لکھ سکے گا۔"

میں بمبئی کے ایک نہایت اعلےٰ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا، آفتاب غروب ہونے میں دس پانچ منٹ باقی تھے، وہ میرے پہلو میں، پینے کے لیے بے چین بیٹھا تھا کہ ساغر آ گئے اتنے میں آسمان پر شفق پھول گئی، سامنے کا سمندر گلابی ہو گیا ملائم ہوا سنکنے لگی۔ اور دور شروع ہو گیا۔ جب نشہ گھنگھور ہونے کے قریب آیا، وہ اُٹھا، ساغر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں، ساغر بھی اُس سے چمٹ گئے،

اُس عالم میں اُس نے کہا

"سغر وا (ساغر) مجھے تجھ سے بے حد محبت ہے، تو میرا بڑا پیارا دوست ہے"

ساغر نے کہا

"مجز وا (مجاز) مجھے بھی تجھ سے بے حد محبت ہے، تیرا سا دوست ملے گا کہاں"

یہ سن کر، مجاز اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا

"پیارے ساغر، اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں، لیکن پیارے یہ اور بات ہے کہ میں تجھ کو شاعر تسلیم نہیں کرتا"۔

یہ سنتے ہی ساغر نے رونا شروع کر دیا۔ ساغر کو روتا دیکھ کر، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، ساغر کی گردن میں پھر بانہیں ڈال دیں، اور کہا "ساغر تیرا کوئی جواب نہیں"۔

ساغر خوش ہو گئے۔ رونا بند ہو گیا اور مجاز پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور، تھوڑی دیر میں اُس نے مجھ سے کہا "جوش صاحب میں ساغر پر اپنی جان تک نچھاور کر سکتا ہوں" ساغر، اُس سے، دوڑ کر

لپٹ گئے، ابھی وہ لپٹے ہوئے ہی تھے کہ مجاز نے کہا" مگر یہ اور بات ہے ساغر کہ میں تجھ کو شاعر نہیں سمجھتا" ساغر نے پھر رونا شروع کر دیا اور ہنستے ہنستے میرا بُرا حال ہو گیا (ہائے وہ ہنسیاں، اب خون کے آنسو رُلا رہی ہیں)

لیجئے ایک رات اور یاد آ گئی،

دہلی کا واقعہ ہے ہم لوگ کنور مہندر سنگھ بیدی کے گھر میں بیٹھے پی رہے تھے۔ اُن کے ملاقات کمرے میں ایک شیر فریم کے اندر ایک طرف، کھڑا ہوا تھا شعر خوانی ہو رہی تھی۔ صابر دہلوی جب اپنا کلام سنا چکے تو مجاز کی باری آئی۔ وہ، بڑی متانت کے ساتھ، اُٹھا، اور کمرے کے شیر کی پشت پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا" ارے یہ کیا کر رہا ہے"

اُس نے کہا" آپ سب بھیڑیں ہیں کہ فرش پر بیٹھے شعر سنا رہے ہیں، میں شیر ہوں، شیر پر بیٹھ کر اپنا کلام سناؤں گا (ہائے وہ شیر کہاں چلا گیا)"

لکھنؤ کا ذکر ہے، ایک بار ہم دونوں چار باغ اسٹیشن پر کھڑے ہوئے تھے کہ، دھڑ دھڑاتا پنجاب میل آیا، ایک صاحب جن کے منھ پر چیچک کے داغ تھے، اور رنگ نہایت سیاہ تھا، نہایت شان دار سوٹ پہنے اور گھڑی کی سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے، اپنے فرسٹ کلاس سے اُترے، اور اپنے سونے کی انگوٹھیوں والے ہات، پتلون کی جیب میں ڈال کر، بڑے ٹھاٹ کے ساتھ، پلیٹ فارم پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی اس فرعونیت کو دیکھ کر، اُسے مذاق سوجھا، اُن کے سامنے جا کر اُس نے، بڑے ادب کے ساتھ، اُن کو سلام کیا، اور پوچھا

"حضور کہاں تشریف لیے جا رہے ہیں"

انھوں نے کہا

"یہ بات آپ کیوں پوچھ رہے ہیں"

اُس نے ہات جوڑ کر کہا

"حضور میں بے حد غریب آدمی ہوں، آپ میری امداد فرما دیں۔

انھوں نے جیب میں ہات ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر، اُس کی طرف بڑھا دیا، اُس نے بڑی مسکنت سے، اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا،

سرکار، میں آپ سے روپے کی مدد کا خواستگار نہیں ہوں، فقط اس قدر استدعا ہے کہ آپ ایک ٹرین مس کر کے، صرف ایک رات کے واسطے لکھنؤ میں ٹھہر جائیں،

انھوں نے، تیوری پر بل ڈال کر، پوچھا

"میں یہاں ٹھہر کر کیا کروں گا"

اُس نے کہا

''حضور یہاں ایک رات اگر ٹھہر جائیں گے تو میں اور میرے بال بچے ایک بڑی مصیبت سے نجات پا جائیں گے، اور ہم سب آپ کو ہمیشہ دعائیں دیتے رہیں گے، انھوں نے کہا یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اُس نے، پھر ہات جوڑ کر کہا اے حضور، یہاں کے ایک محلے ''عیش باغ'' میں ایک میرا چھوٹا سا کھیت ہے، ہر رات کو گیدڑ آتے ہیں، اور کھیت چر کر چلے جاتے ہیں، اس لیے میری یہ گزارش ہے کہ حضور، آج رات کو اُس کھیت میں دونوں پاؤں پھیلا کر، اور دونوں ہاتوں کو بلند کر کے فقط ایک گھنٹے کے لیے، کھڑے ہو جائیں تاکہ مجھ کو حرام زادے گیدڑوں سے ہمیشہ کے واسطے نجات مل جائے''

یہ سُنتے ہی وہ مجاز کی طرف جھپٹے، وہ پیچھے ہٹ گیا، گاڑی نے سیٹی دی، وہ غصے میں بھرے اپنے درجے میں چلے گئے، اور گاڑی رینگنے لگی اور، ہات جوڑے ہوئے مجاز کی یہ آواز گونجنے لگی ''حضور، صرف ایک رات کے لیے''۔

میں نے ایک دن پوچھا

''مجاز، تیرے والدین تو بے حد پابند صوم وصلوۃ ہیں، مجھ کو حیرت ہے کہ وہ تیری بادہ خواری کو کیوں کر برداشت کرتے ہیں''

اُس نے کہا

''بعض والدین اس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں کہ اُن کی اولاد نہایت سعادت مند ہوتی ہے، اور میں اس قدر خوش قسمت بیٹا ہوں کہ میرے والدین، حد سے زیادہ، سعادت مند ہیں''۔

اور میں اس لفظ ''سعادت مند'' کے محلِ استعمال پر لوٹ پوٹ ہو کر رہ گیا۔

ایک رات کو، لکھنؤ میں پھڑ جمی ہوئی تھی۔ رئیس احمد، میرزا جعفر حسین، حکیم صاحب عالم، حکیم مخمور، میرزا عطا حسین قزلباش، میرن صاحب، اور نہ جانے اور کون کون، ایک حلقے میں، فرش پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مجاز، جھک کر ''ہلو، ہلو'' کرنے لگا اور ٹے لی فون کا فرضی رسیور اُٹھا کر کہنے لگا

''میں اسرار الحق مجاز بول رہا ہوں آپ کون ہیں؟

اچھا اچھا گجن بائی ہیں ارے ارے آپ کو مجھ سے اس قدر عشق ہے ارے آپ کو میرے بغیر نیند نہیں آرہی ہے اچھا ابھی آتا ہوں''۔

یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اور ایک دم سے نرت کر کے گانے لگا: ''بریلی کے بجار میں، جھمکا گراری، جھمکا، اے جھمکا گراری، بریلی کے بجار میں جھمکا گراری''[1] اور حکیم مخمور اُس کے سامنے کھڑے ہو گئے، اور تالیاں

---

[1] کہیں سے بریلی کے بازار میں جُھمکا (کان کا زیور) گر پڑا (یعنی کسی کو دیکھا اور اس پر دل آ گیا)۔

بجا بجا کر، نعرے لگانے لگے: "اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے، اے بڑھ کے بیٹا، بڑھ کے" [۱]

ادھر ارے، بریلی کے بجار میں جُھمکا، ارے جُھمکا۔ آہا جُھمکا بریلی کے بجار میں، جُھمکا گراری جُھمکا گراری، جُھمکا گراری، جُھمکا گراری، جُھمکا گراری، اور اُدھر "بڑھ کے اے بڑھ کے، اے بڑھ کے بیٹا بڑھ کے،" "ہاں ہاں بڑھ کے، بیٹا بڑھ کے" نے قیامت برپا کردی، اور ہم سب اس قدر، زور زور سے ہنسے کہ گلی کے کتّے بھونکنے لگے۔

میاں کیفی اعظمی، کمیونسٹ پارٹی کے جلسے میں شریک ہونے کے لیے، حیدرآباد دکن گئے، اور وہاں سے تیرِ عشق کھا کر، بمبئی آگئے اور اُس لڑکی کے باپ کے پاس اپنے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ لڑکی کی ماں نے انکار کردیا، مگر لڑکی کے باپ، اس قدر خوش حال تھے کہ وہ اپنی لڑکی کو بمبئی لے آئے، اور کیفی سے اُس کا نکاح کرادیا۔ نکاح کا جشن بنے میاں (سجاد ظہیر) کے کمرے میں منایا گیا تھا۔ ہم سب لوگوں نے اپنے اپنے چہروں پر، طرح طرح کے رنگ لگا لگا کر دھوم مچائی تھیں، اور، خوشی میں ڈوب کر رقص کیا تھا۔ جب ساری اُچھل کود ہوگئی۔ تو مجاز، کیفی کے خسر کے پاس آئے، اور اُن کی روشن خیالی کی داد دے کر، جب انھوں نے یہ کہا

"جنابِ والا خسر ہو تو آپ کا سا، ورنہ سرے سے ہو ہی نہیں"

تو ہم سب کے پیٹ میں، ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ خدا کی قسم، "ورنہ ہو ہی نہیں" کی داد نہیں دی جاسکتی۔

❁

---

۱ ــــ جب کوئی نو عمر طوائف ناچنے گانے کے لیے کھڑی ہوتی ہے، تو اس کے سازندے، اُس کا دل بڑھانے کے واسطے بڑھ کے بیٹا، کے نعرے لگاتے ہیں تاکہ وہ بڑھ بڑھ کر ناچے اور لہک لہک کر گائے۔

مجتبیٰ حسین

ماضی کا وطن جون پور، حال کا وطن پاکستان، الٰہ آباد یونی ورسٹی کے مایۂ ناز گریجویٹ اور اب سراج الدولہ کالج کے قابلِ فخر پروفیسر ہیں۔☆

جوانی ہر چند ڈھال پر آ چکی اور، رو بہ نشیب ہے، لیکن تخیل، چڑھائی پر گام زن اور رو بہ فراز ہے۔ جسمانی اعتبار سے، نحیف و زار، لیکن، فکری اعتبار سے، اُپی تلوار۔ کبھی کبھی، منھ کا مزا بدلنے کے لیے شاعری بھی کرتے، اور آب دار شعر کہتے ہیں، لیکن اُن کا اصلی میدان ہے انتقاد و سیاست۔

انتقاد کے وقت اُن کی نگاہ عکس ریز (Xray) کا کام کرتی، اور، ادب کے بدن میں ڈوب کر، اُس کے تمام محاسن و معائب کا معائنہ کر لیتی ہے۔ اور اُن کی نفاذ جودت اس بلا کی نکیلی ہے کہ پتھروں تک کو برما دیتی، اور فولاد تک میں ڈوب جاتی ہے۔

☆ ____ جوش صاحب کی انتہائی جامع اور تمام تر تفصیلات پر مشتمل سوانح اگر ترتیب دی جائے تو اس میں سراج الدولہ کالج کراچی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ کراچی کے فیڈرل بی ایریا میں کریم آباد کے مقابل ۱۹۶۳ء کے آس پاس یہ کالج راجہ صاحب محمود آباد نے قائم کیا تھا۔ کم و بیش اسی زمانے میں کالج کے عقب میں کچھ فرلانگ پر جوش صاحب کا مکان ۱۳۸، ڈی، بلاک ۵ (فیڈرل بی ایریا، کراچی) بھی تعمیر ہو رہا تھا جو ۱۹۶۶ء کے آخر میں مکمل ہوا۔ اردو کے نامور نقاد پروفیسر مجتبیٰ حسین اس کالج میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ مجتبیٰ صاحب اکثر و بیشتر جوش صاحب کے پاس جایا کرتے تھے۔ کالج میں شام کی بھی کلاسیں ہوا کرتی تھیں جہاں مجتبیٰ صاحب کی زیرِ سرپرستی، شعری نشستوں کا خوب انعقاد ہوا کرتا تھا یہاں روبرو جن شعراء کو دیکھا اور سنا اُن میں جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، سراج الدین ظفر، جمیل الدین عالی، راغب مراد آبادی، ابنِ انشا، احمد فراز اور کئی دوسرے شعراء کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب جن کے آنے پر کھِل جایا کرتے تھے وہ جوش صاحب تھے جو بارہا یہاں تشریف لاتے تھے۔ کالج سے جوش صاحب کے گھر کا راستہ پیدل ہی چلے جانے کا راستہ تھا اگر کوئی کلاس نہیں ہو رہی ہوتی تھی تو مجتبیٰ صاحب کے ساتھ چلے جانے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ سراج الدولہ کالج کے ادبی و شعری ماحول اور جوش صاحب کی نسبت سے یہاں کی یادوں کا تذکرہ راقم السطور نے اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے جنھیں بار بار کیا دہرایا جائے۔

جاری ہے

اب رہی سیاست۔ سواس رستمِ زماں و مردِ میداں کو اُس کی بیوی، آختہ کر چکی ہے۔ اب وہ ٹاپیں تو ضرور مارتے ہیں، لیکن ہنہناتے نہیں وہ، اندر اندر جلتے رہتے ہیں، مگر کیا مجال کے دھواں باہر آ جائے۔ یہ نامراد رسمِ ازدواج، ہزاروں سورماؤں کو چوڑیاں پہنا چکی، اور لاکھوں آتش فشاں پہاڑوں کو، برف کے تودوں میں تبدیل کر چکی ہے۔

مجھ کو یقین ہے کہ جس وقت نکاح کی تنسیخ کا قانون مرتب ہونے لگے گا، اُس وقت اُس کے مردافگن ثابت کرنے کے سلسلے میں، سب سے بڑی دلیل کے طور پر، شبیر حسن خاں جوش، اور سید مجتبیٰ حسین کے نام، سب سے پہلے پیش کیے جائیں گے۔ اور اُس کے بعد ازدواج کو حرام ٹھہرا دیا جائے گا۔ اور جو شخص نکاح کا ارتکاب کرے گا اُس کو حبسِ دوام کی سزا دی جائے گی:

اے زوجہ، تو نے، لاکھوں مردوں کو کھا کے چھوڑا
جو سورما بھی اُبھرا، اُس کو دبا کے چھوڑا

❁

(گذشتہ سے پیوستہ)

"نیم روز" کے نام سے یہاں میں نے کالج میں ایک اخبار کا اجراء کیا تھا۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین اس کے سرپرستِ اوّل اور شعبۂ اردو ہی کے اُس کے وقت کے لیکچرار محمد رئیس علوی (سابق رجسٹرار، کراچی یونیورسٹی) اخبار کے نگراں تھے۔ اور میں ایڈیٹر تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں جوش صاحب نے اس کی اعزازی سرپرستی قبول کر لی تھی۔ جوش صاحب کے نواسے فرخ جمال ملیح آبادی نے اپنی کتاب 'جوش میرے بابا شخص و شاعر' (اسلام آباد، ۲۰۱۰ء) میں مجتبیٰ صاحب کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "پروفیسر مجتبیٰ حسین سراج الدولہ کالج کے شعبۂ اردو کے صدر تھے اور بابا سے نہایت عقیدت رکھتے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی چونکہ اُن کا تعلق بھی اسی کالج سے تھا اکثر اوقات بابا کے پاس پروفیسر مجتبیٰ حسین کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین بلا کے ذہین اور ذی شعور انسان تھے اکثر جب بابا سے علمی اور ادبی گفتگو کیا کرتے تھے تو میں بھی اس دوران وہاں موجود ہوتا تھا پھر بابا جب اسلام آباد منتقل ہو گئے تب بھی محترم مجتبیٰ حسین بابا سے کبھی خط کے ذریعے اور کبھی فون پر رابطہ رکھتے تھے۔ بابا بھی پروفیسر مجتبیٰ حسین کو بے حد پسند کرتے تھے۔" (ص ۶۱،)

۶

ندیم، قاسمی

میرا دعویٰ ہے کہ اچھا شاعر، کبھی بُرا آدمی ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ہر مادر زاد شاعر کے سینے میں پیغمبرانِ جلیل القدر کا دل دھڑ کتا رہتا ہے ___ اور میں، اپنے اس دعوے کی دلیل میں، ندیم قاسمی کو پیش کر رہا ہوں۔ ندیم اپنے ہم عصر شعراء کے حلقے میں جب کھڑا ہوتا ہے تو اس کا قامت اس قدر بلند ہے کہ، دور سے، اس کو دیکھ لیا جاتا ہے۔ اُس کو، پروپیگنڈے کی اسپرنگ پر بٹھا کر، اُچھالا نہیں گیا ہے، وہ اپنے جوہرِ ذاتی کی بناء پر، بلند ہوا ہے، اور بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے گا ☆۔ دیکھو وہ کج کلاہ، بڑی خسروانہ محبوبیت کے ساتھ، اورنگِ سخن پر جلوہ افروز ہے، اور، روحِ پنجاب پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

ایست کہ دل بردہ و خوں کردہ بسے را
بسم اللہ ، اگر تاب نظر ہست کسے را!!

☆ ___ جوش صاحب نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اپنے جریدے 'کلیم' میں ایسے کئی مضامین لکھے تھے جس میں شعراء کی تنگ نظری، ہم عصر شعراء سے رقابت اور اُن کی شہرت سے عناد و حسد کا برملا تذکرہ کیا تھا۔ جوش صاحب گنتی کے اُن دو ایک تخلیق کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے ہم عمروں، کم عمروں اور نوجوانوں تک کی پذیرائی کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ان کی یہ تحریر اُن کے اسی جذبے کی عکاس ہے۔ خود قاسمی صاحب بھی اُن دو ایک لکھنے والوں میں شامل ہیں جنھوں نے جوش کے اثرات کا بہت کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے۔ ہر بڑے شاعر کی نفی کر دینے والے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ: ' ___ ممکن ہے یہ شعراء بھی فیشن کے مطابق جوش کو یونہی سا شاعر قرار دے کر اپنی انانیت کو تھپک لیتے ہوں، لیکن اگر وہ تنہائی میں، دیانتداری کے ساتھ، انانیت کے شکنجے کو طاق پر رکھ کر اپنے ہی کلام پر غور کریں اور اپنی ہی آواز کو کان لگا کر سنیں تو انہیں محسوس ہوگا کہ اُن کے کم سے کم آدھے کلام میں جوش بول رہا ہے ___ '

(افکار جوش نمبر، ۱۹۶۱ء، ص: ۶۳۶)

بابِ چہارم

میرے پاکستانی دوست

میں، احبابِ زندہ کی مفارقت سے فگار، یارانِ رفتہ کا سوگ وار، اور درازیٔ عمر کا گناہ گار، عمر کی اُس آخری منزل میں پاکستان آیا ہوں، جب کہ رفیق گری اور دوست سازی کا ولولہ دم توڑ چکا ہوتا ہے ___ پھر پاکستان آکر، یہاں کے کروروں باشندوں میں سے جو، اِنے گِنے چند احباب میں نے پیدا کر لیے ہیں، وہ بھی اوچھی پونجی کے مانند، آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے، میرے چار پاکستانی دوست، ساحل بلگرامی، نواب ابوالحسن بلگرامی، قیصر شاہ جہاں پوری، اور زیار ردولوی، اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور سوچتا ہوں کہ سخت جانی کے ہاتوں، اگر نصیبِ دشمناں اور بھی جیتا رہا تو پھر ہوگا کیا؟ ___ اے قوتِ حیات، مجھ کو اُن بدبختوں میں نہ شامل کر دینا جو قیامت کے بوڑھے ہو رہیں گے۔ مجھ کو نئے احباب کی جدائی سے بچانا، اور اس عبرتناک سناٹے سے دور رکھنا، جب ساری دنیا کراہتی اور بھائیں بھائیں کرنے لگتی ہے، اور گھبرا دینے والی تنہائی کے اتھاہ سمندر میں، دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ اور آدمی، آسمان کی طرف منھ اُٹھا کر چیخ اُٹھتا ہے:

نہ مونسے، نہ رفیقے، نہ ہم دمے دارم
حدیثِ دل بکہ گویم؟ عجب غمے دارم!!

❁

بہ ترتیب حروف تہجی ☆

☆___ اس فہرست سے متعلق ایک وضاحت کتاب کے صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

(نواب) ابوالحسن بلگرامی

اُن کے چہرے کا سانولا پن، کھلتے رنگ کی جانب مائل تھا۔ داڑھی فرنچ کٹ تھی، قد نکلتا ہوا تھا، گزری ہوئی جوانی اُن کے خال وخط پر ایسے نقوش چھوڑ گئی تھی، کہ جب خضاب لگا کر، جامہ وار کی شیروانی پہن لیتے تھے، تو ان کے چہرے سے پتا چلنے لگتا تھا کہ وہ جوانی میں نہایت خوب صورت ہوں گے، اور اُن کی مُخضب داڑھی میں وہ کالی راتیں پرفشاں نظر آتی تھیں، جن میں وہ زلفوں سے کھیلا کرتے تھے۔

وہ شعروسخن کے بے حد رسیا تھے۔ اور اُن کا داد دینے کا طرز بالکل انوکھا تھا، اُن کو جب کوئی شعر پسند آتا تھا تو آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر اور دونوں ہاتوں کو دعا مانگنے کے انداز سے، بلند کر کے" وانڈر فل، گرانڈ افیر، گرانڈ افیر (Wonderful, grand affair,grand affair) کے نعرے لگانے لگتے تھے، لیکن مذاقِ سخن بلند نہیں تھا، اس لیے بُجھے اشعار کی داد دیا کرتے تھے __ اور جب وہ میرے کسی شعر پر" وانڈر فل، گرانڈ افیر" نعرہ بلند کرتے تھے، تو میں سوچنے لگتا تھا کہ اس شعر میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور رہ گئی ہے۔

اُن کو اردو فارسی کے لاکھوں اشعار یاد تھے، جن میں درجۂ اوّل کے اشعار کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔

وہ شرافت و وضع داری، اور احتیاط وکفایت شعاری کا، ایک جامع الاضداد مجموعہ تھے۔ جب کوئی دوست، اُن کے گھر آتا تھا، وضع داری کہتی تھی کہ اُس کی، جی بھر کے، تواضع کرو، اور کفایت شعاری، حکم دیتی تھی کہ آنے والے کو سوکھا ٹال دو، اس اندرونی کشمکش نے، آخر کار، اُن کو ذیابطیس کے مرض میں گرفتار کر دیا تھا۔ لیکن میرے ساتھ اُن کا برتاؤ اس سے قطعی مختلف تھا، میں عذر کرتا تھا لیکن انھوں نے مجھے اپنے گھر سے کھلائے پلائے بغیر کبھی رخصت نہیں کیا۔

وہ ہماری تہذیب اور ہماری مجلسی زندگی کے آخری نمونے اور اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ وہ دفن نہیں ہوئے، اُن کے ساتھ، ایک پورا دور دفن ہو گیا ہے۔

ڈھونڈو گے اگر شہروں شہروں☆ ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو، وہ خواب ہیں ہم

☆ __ شاد عظیم آبادی کی مشہور غزل کے مطلع کا مصرعۂ اول ۔۔۔ ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ۔۔۔ ہے، جوش صاحب نے مشہروں شہروں لکھ دیا ہے۔

بدر، الٰہ آبادی

صاف عذار (کلین شیو)، صاف قلب، گورے چٹے، اور خوش مزاج انسان ہیں۔☆ شاعری کا شوق ہے، کبھی کبھی غزل، اور زیادہ تر مرثیے اور منقبتی قصائد کہتے۔ اور حضرت عباس کے یومِ ولادت پر، بڑی عقیدت و مودت کے ساتھ ہر سال مقاصدے کا جشن منایا کرتے ہیں۔ مذہبی آدمی ہیں، رندی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ایک بار انھوں نے، بڑی شاندار دعوت کی تھی، اور مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے واسطے بڑی اعلیٰ درجے کی بوتل منگائی ہے۔ لیکن دعوت کے وقت انہوں نے جب بوتل سامنے رکھی تو وہ بڑے گھٹیا خاندان کی نکلی۔ اُن کی اس میں کیا خطا ہے، وہ تو "ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں" قسم کے بھولے بھالے آدمی ہیں۔
وہ بڑا اچھا کھانا کھلاتے، اور، خدا جانے، کس آلے سے کیتلی کے پانی کو چلاتے ہیں کہ اُن کے ہات کی بنی ہوئی چائے بڑی لذیذ ہوتی ہے__ اُن کے مزاج میں بے حد انکسار ہے، اور اُن کا چہرہ اس قدر شگفتہ ہے کہ انھیں دیکھ کر "بدرِ شبِ قدر" کہنے کو جی چاہتا ہے۔

☆__ جن احباب سے جوش صاحب بہت بے تکلفی سے ملا کرتے تھے اُن میں بدرالٰہ آبادی (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۶ء) بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کا نام ظلِ حسنین تھا، بدر تخلص کرتے تھے۔ ماہرِ لسانیات، لغت نویس اور معروف مرثیہ نگار شاعر نسیم امروہوی کے وہ شاگرد تھے۔ نسیم امروہوی کی ادبی خدمات پر مشتمل کتاب 'عرفانِ نسیم' (مطبوعہ ۱۹۷۳ء، کراچی) میں مضمون 'نسیم امروہوی کے تلامذہ' شامل ہے جس میں اُن پر بھی لکھا گیا ہے۔ اُن کے مرثیوں اور قصائد پر مشتمل کتاب 'بدرِ کامل' ۱۹۷۶ء میں نسیم امروہوی کے دیباچے کے ساتھ کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔

پیر حسام الدین

پیدائش کے اعتبار سے مسلمان، مگر فکری نقطۂ نظر سے کافر۔ جسمانی حیثیت سے لاغر، مگر علم و فضل کے لحاظ سے دیو پیکر۔ معاش کی طرف سے غنی، پھر بھی مطالعے کے دھنی۔ قلب کے مریض، مگر زندہ دل۔ جید عالم، مگر انکسار پسند پیروں کے خاندان سے، مگر قطعی بے ریا۔ کثیر الاخلاص مگر قلیل الارتباط۔ ذوقِ گناہ تا بہ حلقوم مگر گناہ معدوم ___ اس شہر کراچی میں جہاں دولت کی پرستش ہوتی، اور اربابِ ہوس کے انفاس سے درآمد و برآمد کے بھبکے آتے ہیں، پیر صاحب کے سے ذی علم و قانع آدمی کا قیام کرنا، اور زندہ رہنا، ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔

وہ بیسیوں انجمنوں کے صدر، اور ایران تک "ثقافتِ" پاکستان کا آوازہ بلند کرتے پھرتے ہیں، مگر، یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس قدر قربِ مکانی کے باوجود، وہ میرے پاس کبھی بُھولے بھی نہیں۔ اُن کا نہیں، یہ کراچی کا قصور ہے، اگر وہ کہیں اور رہتے تو، ڈھونڈ ڈھونڈ اور موقع نکال نکال کر، مجھ سے ملتے۔ ذرا قیاس تو فرمایئے، کہ جس شہر کے اکابر کا یہ عالم ہے اُس نامراد شہر کے اصاغر کیسے ہوں گے۔

قیاس کُن، ز گلستانِ من، بہارِ مرا!

تقی

سید محمد تقی نام ہے، روز نامہ ''جنگ'' کے مدیر ہیں۔ وطن ہے امروہہ، قیام ہے کراچی میں، سائنس اور فلسفے میں ایسی دستگاہ ہے کہ پاکستان کی آب رو ہیں۔ یہ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ اس قدر رزی علم انسان، پڑا ہوا ہے صحافت کے گڑھے میں۔ اگر پاکستان بصارت سے محروم نہ ہوتا تو، ان کو، بہمہ وجوہ، مطمئن بنا کر، ان سے فقط علمی کام لیتا، اور دنیا کو دکھا دیتا کہ میرے تاج میں بھی سید محمد تقی کا سا کوہ نور دمک رہا ہے۔

اُن کے فکری مقالات سے پتا چلتا ہے کہ بہت کچھ جانتے ہیں، مگر ابنائے زمانہ کے خوف سے دو ٹوک بات کہتے گھبراتے، اور، عریاں صداقت جب زبان پر لانا چاہتے ہیں، تو مصلحتاً ہکلانے لگتے ہیں۔ اور اُن کے دریائے علم کے ساحل پر جب اوندھی عقل کے تماشائی آتے ہیں، تو وہ اپنے شفاف پانی میں، جلدی سے، مٹی ملا کر، اُسے گندلا کر دیتے ہیں، تا کہ اُن کے دریا کے تہ نشین موتیوں کو وہ دیکھ نہ سکیں، اور اُن کی جان محفوظ رہے۔☆

☆ــــ امروہے کی سادات کے مختلف گھرانوں میں اپنی علم افروزی، سخن دانی اور ادب نوازی کے اعتبار سے جس خاندان کو پاکستان میں بہت شہرت حاصل ہوئی وہ شفیق حسن ایلیا کا خاندان ہے۔ وہ تقسیم کے بعد مع اپنی آل اولاد کے کراچی میں آ کر آباد ہو گئے۔ ایلیا مرحوم کے چار صاحبزادے ہوئے۔ رئیس امروہوی، سید محمد تقی، محمد عباس اور جون ایلیا۔ محمد عباس صاحب بقید حیات ہیں۔ باقی تین شخصیات مرحوم ہو چکی ہیں۔ یہ پورا خاندان مانک جی اسٹریٹ گارڈن ایسٹ، ۱۲۹، اے، کراچی ۳ پر رہا کرتا تھا۔ نام گنوانا تو قدرے مشکل ہے لیکن ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور سیاستدانوں کی آمد و رفت کے اعتبار سے یہاں کی ادبی و علمی بیٹھک ایک تاریخی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ جوش صاحب اکثر و بیشتر یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ اُن کی سوانح حیات پر جب بھی بہت جم کر لکھا جائے گا تو رئیس امروہوی اور سید محمد تقی کے گھر کی اس بیٹھک کو بھی ایک اہمیت کے ساتھ یاد رکھنا ہوگا۔

جمیل نشتر

صورۂ جمیل، سیرۂ جبرئیل ___ پاکستان کے بے لوث راہ نما حضرت نشتر کے فرزندِ کج کلاہ، دوستوں کے پشت پناہ ___ اسٹیٹ بینک کے اعلیٰ عہدہ دار، روز وشب، یہودیوں کا کاروبار، پھر بھی تمدن شعار اور علم وادب کے پرستار میرے ہم قوم، یعنی پٹھان، مادری زبان پشتو ہے، لیکن اردو فارسی پر قابو حاصل ہے، اور باریک سے باریک شعر بجھ لیتے ہیں۔ ہمارے مابین تعلقات جدید ہیں اس قدر جدید کہ ابھی تک اُن کی مَسیں بھی نہیں بھیگی ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے گویا ہم ایک دوسرے کے صبحِ ازل سے رفیق ہیں۔ سنتا ہوں، وزارت پیش کی گئی تھی، انھوں نے انکار کر دیا، اس ایک بات سے اُن کی رفعتِ کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں اپنے بچے سید مصطفےٰ زیدی کو دعا دیتا ہوں کہ اُس کی بدولت، جمیل نشتر کی سی دولتِ بیدار میرے ہات لگی ہے۔ اُن کی صورت اس قدر موہنی ہے کہ کافر دیکھ لے تو ایمان لے آئے، اور اُن کی طہارتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ فرشتے دیکھیں تو درود پڑھنے لگیں۔ الغرض:

آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

جوہر

علامہ سید محمد مصطفےٰ صاحب، رہنے والے ہیں بہار کے، اب کراچی کو وطن بنالیا ہے☆۔علم وفضل میں اُن کا پایہ اس قدر بلند ہے، کہ بڑے بڑے علماء اُن کے روبرو ایسے معلوم ہوتے گویا تاج محل کے سامنے کوئی جھونپڑا رکھ دیا گیا ہے __ سکندرِ اعظم عالم کوب تھا، یہ عالم کوب ہیں۔

وہ ذاکری کرتے ہیں، لیکن اُس سے جیب نہیں بھرتے ہیں۔اُس کے ساتھ ساتھ، وہ سخن گستر بھی ہیں اور سخن شناس بھی۔وہ جب کسی کا کلام سنتے ہیں، سکّوں کے مانند اپنی پلکوں پر اُس کو بجاتے اور اُس کا کھوٹا کھرا اپن جانچ لیتے ہیں۔اور اُن کی نگاہیں بتادیتی ہیں کہ فلاں شعر بڑھیا ہے، اور فلاں گھٹیا۔

اور یہ بھی نہایت حیرت ناک بات ہے کہ ہر چند وہ ایک خالص دینی آدمی ہیں، پھر بھی اُن کے مزاج میں اس قدر شگفتگی ہے کہ رندانہ زندہ دلی اُن کا منھ دیکھنے لگتی ہے کہ اُن میں یہ بشاشت وظرافت آ کہاں سے گئی ہے۔

ویں عجب بیں کہ چہ نورے، زکجا می بینم!

۞

☆ __ جوش صاحب نے علامہ محمد مصطفےٰ جوہر صاحب (۱۸۹۵ء_۱۹۸۵ء) کو سید لکھ کر یاد ہے۔قبلہ جوہر صاحب کے صاحبزادے، علامہ طالب جوہری صاحب کا بیان ہے کہ وہ نسلاً صدیقی ہیں۔اس وضاحت کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جوش صاحب سے تسامح ہوا ہے۔جمیل مظہری کے نام ایک خط میں جوش صاحب اپنے حوالے سے لکھتے ہیں، __ میں نسلاً پٹھان ہوں لیکن طبعاً سید واقع ہوا ہوں __' (کائنات، جمیل مظہری نمبر ۱۹۸۲ء، ص: ۵۰۳) اس حوالے سے اُن کا ایک شعر بھی ہے:

اے جوش میں افغان ہوں حب نسب جسم

حب نسب طبع ہوں منجملۂ سادات

اہلِ علم سے جوش صاحب کے رشتے حب نسب جسم نہیں حب نسب طبع ہی قائم ہوئے ہیں۔برصغیر کے علمائے عظام اور (علمائے سو نہیں) علمائے حق کی قدردانی جس طرح جوش صاحب نے کی ہے اس کی مثال جوش صاحب کے معاصرین میں سے کسی ایک آدھ شاعر کی شاید ہی دی جاسکتی ہو۔بیسویں صدی کے عشرۂ چہارم میں جوش صاحب نے جب سنگین اور سخت لہجے کے ساتھ 'ذاکر سے خطاب' لکھی تھی تو اس کی تردید میں بھی اُس وقت بہت سی نظمیں لکھی گئی تھیں جس میں علامہ جوہر صاحب (ولادت......) کی نظم 'گنبد کی صدا' بھی سامنے آئی تھی لیکن جوش صاحب اہلِ علم کی علم پروری کے اتنے قدرداں ہیں کہ اُن کے نزدیک ایسے اختلافات دامن کی گرد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔مسدس میں مصطفےٰ جوہر صاحب کی یہ غیر مطبوعہ نظم 'گنبد کی صدا' مجھے کئی برس پہلے اُن کے صاحبزادے علامہ طالب جوہری صاحب نے اپنے نوادرات سے عطا کی تھی۔

حکیم نصیرالدین

اصلی باشندے ہیں اجمیر کے، اب کراچی میں مطب کرتے ہیں اُن کا چہرہ، صبح بہار کے مانند شگفتہ، اُن کا دل، چودھویں کے چاند کی طرح تاب ناک، اور اُن کا لہجہ، چینی پر اشرفی کی جھنکار سے زیادہ سامعہ نواز ہے وہ جب باتیں کرتے ہیں تو عربی و فارسی الفاظ کی دل نشیں آمیزگی ایسی ہوتی ہے گویا ریشمی تاگے میں دُرہائے شاہ وار پروئے ہوئے ہیں__ اُسی کے دوش بدوش وہ بڑے حاذق طبیب، اور قیامت کے سخن شناس بھی ہیں__ ہر چند، وہ بڑی سختی کے ساتھ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں، مگر زاہدانہ خشکی سے کوسوں دور اور ذوقِ حُسن پرستی سے بھرپور ہیں۔

اُن کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ جب ملنے جاتا ہوں، وہ کوئی نہ کوئی تحفہ دیئے بغیر مجھ کو رخصت نہیں کرتے، شراب کے قریب نہیں پھٹکتے، لیکن اُس کی بوتلیں الماری میں چھپا کر رکھتے اور مجھ کو عنایت کیا کرتے ہیں۔ اُن کا مشرب اس قدر وسیع اور اُن کا سینہ اس قدر چوڑا ہے کہ جب راتوں کو اُن کے پاس جاتا ہوں، اُن کے مُصلے کے قریب بساطِ بادہ خواری بچھا دی جاتی ہے، ایک طرف قیام وقعود، اور ایک طرف ساغر کے سامنے بوتل سر بسجود، یہ گنگا جمنی سماں بڑا ہی دل کش ہوتا ہے۔

ان کے تدیّن کا یہ عالم ہے کہ اُن کے وہاں جو دوائیں طیار ہوتی ہیں۔ اُن کے تمام اجزاء خالص ہوتے ہیں، کیا مجال کہ ملاوٹ ہو جائے، قیمت تو زیادہ ہوتی ہے، مگر اُن کے وہاں دوغلی نہیں، نجیب الطرفین دوائیں ملتی ہیں۔

کراچی میں رہتے ہوئے جُگ بیت چکا ہے، مگر اُن کے خلوص پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑا ہے، اور اُن کا اخلاص، اس آب وہوا میں بھی، کھرے سونے کے مانند دمک رہا ہے۔

اور کھانا اس قدر اچھا کھلاتے ہیں کہ نواب حامد علی خاں، والیٔ رام پور اور حکیم صاحب عالم کا دستر خوان یاد آ جاتا ہے۔

اے، از فروغِ رویت، روشن چراغِ دیدہ
خوش تر زچشمِ مستت، کس در جہاں نہ دیدہ

راغب مرادآبادی

حکومتِ کراچی کے ''خاندانی منصوبے'' میں ملازم ہیں☆۔ جس کا مقصد ہے سلسلۂ تناسُل کی روک تھام لیکن اُس پر خود عامل ہونا اُن کے بس کا روگ نہیں ہے۔

وہ ہماری ہفتہ وار صحبت میں، جس کا ذکر آگے آئے گا، بڑی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور جس دن کسی مانع قوی کی بناء پر نہیں آتے، ہماری نشست اُداس رہتی ہے ___ وہ غزل، نظم اور رُباعی، تمام اصنافِ سخن پر قادر اور نہایت آب دار شعر کہتے ہیں اور فی البدیہہ کہنے میں تو کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا کوئی خیال یا مصرع دے دیجئے وہ ایک سیکنڈ میں اُس کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیں گے۔ اس معاملے میں وہ اس مشینی ترازو کے مانند ہیں، جس پر قدم رکھتے ہی، وزن کا ٹکٹ کھٹ سے باہر آ جاتا ہے۔

وہ، چشمِ بدور، بڑے عملی شاہد باز بھی ہیں اور اس میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کر چکے ہیں، نامِ خدا بھی خود بھی حسین تھے۔ اور ڈوبے ہوئے آفتاب کی شفق، آج بھی اُن کے چہرے پر مچل رہی ہے۔

۞

☆ ___ اس کتاب کے مقدمے میں کئی جگہ پر یہ بات کہی گئی ہے کہ یادوں کی برات کے اکثر و بیشتر پروف راغب صاحب نے پڑھے ہیں۔ یادوں کی برات کے صفحات کتابت کے بعد مع جوش صاحب کی اصل تحریر کے اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ دو مقامات قلمی نسخے میں ایسے بھی ہیں جہاں اُن کی بھی ایک آدھ تحریر دیکھی جا سکتی ہے ایک تو اسی صفحے پر، اُنھی کے تذکرے کی پہلی سطر میں جہاں جوش صاحب نے لکھا ہے کہ '' ___ حکومتِ کراچی کے خاندانی منصوبے میں ملازم ہیں ___ '' اسے راغب صاحب نے ایک نشان بنا کر خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے میں لکھ دیا ہے۔ دوسرے ساحل بلگرامی کے تذکرے والے صفحے میں پہلی سطر کے اوپر راغب صاحب نے جوش صاحب کو یاد دلایا ہے کہ '' ___ حضرتِ ساحل بلگرامی کو آپ نے پارہ جان کا خطاب دیا تھا (قلمی صفحہ نمبر ۱۰۹۱) جوش صاحب سے راغب مرادآبادی مرحوم کی صحبت و قربت ایک وسیع موضوع ہے۔ جس پر علیحدہ سے ایک تفصیلی تحقیق و مطالعے کی ضرورت ہے۔ جوش صاحب کی وفات (۱۹۸۲ء) کے بعد راغب صاحب کی دو کتابیں 'مکالمات جوش و راغب' (۱۹۸۸ء) اور 'خطوط جوش ملیح آبادی' (۱۹۹۳ء) شائع ہو چکی ہیں۔

رعناؔ، اکبر آبادی

اب کراچی میں قیام ہے، لیکن آگرے کو بھولے نہیں ہیں پہلے تجارت کرتے تھے، اب، گھر میں بیٹھے اللہ اللہ کیا کرتے ہیں۔ پہلے، ایک جوانِ رعنا کی طرح، شراب خانوں میں جاتے، اور شاہدانِ بازاری کے زینوں پر چڑھا کرتے تھے۔ اب دونوں کوچوں سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔
اُن کے بچے کی پُراسرار گم شدگی نے اُن کے دل کو بجھا کر رکھ دیا، اور اُن کی باگ دین داری کی جانب موڑ دی ہے، دین داری کی لے اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک بار انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی، اور شیخ اللہ بخش معلوم ہونے لگے تھے۔
بارے اب، لوگوں کے کہنے سننے سے داڑھی منڈا دی ہے۔ وہ بفرمانِ عقل و تحقیق دین داری کی جانب مائل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ شدید غم نے اُن کو اس سانچے میں ڈھال دیا ہے اس لیے ایمان میں تو رسوخ حاصل نہیں ہو سکتا، مگر اب رندی کی جانب عود کرنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ وہ بڑے پختہ مشق شاعر، اور رُباعیاں بے مثل کہتے ہیں۔ یہ بڑے شکر کی بات ہے کہ زُہد و اتقاء نے اُن کی زندہ دلی کو اب تک کوئی گزند نہیں پہنچایا ہے۔ اور شگفتگی اُن کے چہرے پر کھیلتی رہتی ہے۔ یہ بھی بسا غنیمت ہے، اس لیے کہ اگر وہ مولانا عبدالمتین بن جاتے تو ہم اُن کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

❁

روشن علی، بھیم جی

بمبئی کے باشندے تھے، اب کراچی کے ایک بہت بڑے انشورنس ادارے کے سربراہ ہیں۔ گجراتی مادری زبان ہے، انگریزی بہت ہی اچھی جانتے ہیں، اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے، مگر اس قدر شستگی و روانی کے ساتھ بولتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی صاحبِ زبان بات کر رہا ہے۔ اور لہجے میں وہ شریفانہ اُتار چڑھاؤ ہے کہ دل موہ لیتا ہے وہ صرف اپنے کاروبار ہی میں پختہ نہیں، بلکہ اُن کا مطالعہ بھی نہایت وسیع ہے، اور علم و ادب پر بھی بڑا عبور حاصل ہے ___ حیرت ہے کہ وہ نہایت خشک مشغولیت کے باوجود کُتب بینی کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ اُن کے دن، ایک جفاکش سپاہی کی طرح بسر ہوتے ہیں، اور اُن کی راتیں، اُن کو تختِ شاہی پر جلوہ افروز کر دیتی ہیں۔

مرے دن، کارخانوں میں، مری راتیں نگاروں میں

میرے اُن کے مابین ۱۹۴۱ء سے دوستی، اور بڑی پکّی دوستی ہے وہ بمبئی میں کیمونسٹ تھے، اور اب سرمایہ دار ہیں لیکن سرمایہ داری کے تمام عیوب سے، قطعی طور پر پاک ہیں، اور اُن کی سرمایہ داری پر درویشی کا عنصر غالب ہے۔ اور انھوں نے ایسی طرح ڈالی دی ہے [کہ] آج اُن کے انشورنس کا ادارہ، ہزاروں غریبوں کے کام آ رہا ہے، وہ کارِ خیر کے ایک ایسے منارۂ عظیم ہیں کہ دنیا کا بدترین زلزلہ بھی اُس کو گرا نہیں سکتا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے وہ فقط میرے بے لوث دوست ہی نہیں، میرے، بہت بڑے محسن بھی ہیں☆ میں پٹھان ہوں، پٹھان کسی تاج و تخت کے سامنے بھی گردن خم نہیں کر سکتا، مگر اپنے محسن کے سامنے سر جھکا دینے کو عبادت سمجھتا ہے۔

میں اپنے فرزند سجاد حیدر کو وصیت کرتا ہوں کہ بیٹا، اپنے بوڑھے باپ کے اس محسن کے قدموں پر، اگر ضرورت پڑے تو جان کی سی چیز بھی تصدق کر دینا۔

سچ ہے، احسان کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے
چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تُربت میری

☆ ___ یادوں کی برات کا انتساب روشن علی بھیم جی ہی کے نام ہے۔ جوش صاحب نے اُن کے نام انتساب کے صفحے پر یہ عبارت لکھی ہے "میں اپنی اس کتاب کو اپنے محسن اور دوست روشن علی بھیم جی کی ذاتِ گرامی سے منسوب کرتا ہوں"۔

رئیس امروہوی

ایسا قادر الکلام انسان آج تک دیکھنے میں نہیں آیا___ ارے صاحب، ہر عالم میں، اور ہر روز اخبار کے واسطے قطعہ کہنا اور ہر ہفتے ایک طویل مضمون لکھنا، کوئی معمولی کام ہے؟ رئیس آدمی نہیں، دیو ہیں، خدا کی قسم دیوا گر کوئی مجھ سے کہے کہ تو صرف ایک مہینے کے واسطے ہی، ہر روز ایک قطعہ کہہ کر اخبار میں دیا کر، میں تو خون تھوک کر مر جاؤں، یا پھر ''یا لیلیٰ'' کا نعرہ مار کر، کسی ویرانے کی طرف نکل کھڑا ہوں۔ ایں کار از تو، آید و مرداں چنیں کنند!

اُن کی شاعری میں بڑی جان ہے، اور سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ، تمام ایشیا کے شعراء وصوفیاء کے علی الرغم یہ عقل کی تبلیغ کرتے، اور عشق کا تاج اُتارتے، اور اُس کو فکر کے سر پر رکھتے ہیں۔ اور:

شاید اُسے عشق بھی نہ سمجھے   جس کرب میں عقل مبتلا ہے

کا نعرہ بلند کرتے ہیں___ پائندہ بادا ے مبلغ علم___ رئیس ☆!!

❁

☆___ رئیس امروہوی (۱۹۱۴ء ___ ۱۹۸۸ء) جوش صاحب کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ انہوں نے جوش صاحب کی زندگی میں بھی، اور بعد میں بھی، اپنی شاعری میں ان کو یاد کیا ہے۔ جوش صاحب کی وفات سے کچھ دنوں پہلے رئیس امروہوی نے مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے زاہد کلیم کے توسط سے کچھ اشعار جوش صاحب کو بھجوائے تھے۔ فیڈرل گورنمنٹ کالج سیالکوٹ کے پروفیسر سید ضمیر حیدر نے یہ اشعار اور ان کے ساتھ زاہد کلیم کی ایک تحریر بھی مجھے ارسال کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رئیس امروہوی کے لیٹر پیڈ (فوٹو اسٹیٹ) پر لکھے ہوئے یہ غیر مطبوعہ اشعار جوش صاحب کے انتقال کے روز ان کے سرہانے رکھے ہوئے تھے:

جناب جوش کے ہیں مرشدِ طریقتِ عشق   کسی روش میں نہیں ہیں بہ فیض بادہ وہ بند
رئیس ان کا جو مداح ہے کراچی میں   وہ آج کل غم ایّام سے ہے زار و نژند
بس ایک شعر ہے نذرِ سخن شناسیِ جوش   یہ شعر جوش کے معیار سے نہیں ہے بلند
وہ شعر یہ ہے کہ اے شاعر بلند افکار   وہ شعر یہ ہے کہ اے ناظم جمال پسند

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
زما سلام رسانید ہر کجا مستند

بر سبیلِ ارتجال در عالمِ لاہوت گفتہ شد___ رئیس امروہوی (۱۹۸۲ء)

زیبا

نام تھا علی حسنین (ہائے اب "تھا" لکھنے کو جی رہا ہوں) رُدولی کے رہنے والے، کراچی کے پنشن یافتہ افسرِ اطلاعات تھے کہنے کو تو وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے، مگر اُن کے اصل اصناف تھے اہلِ بیت کے قصائد اور حضرتِ حسین کے مراثی، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ان اصناف میں بے نظیر شاعر تھے۔ ☆
اُسی کے دوش بدوش وہ فنِ شاعری اور علمِ عروض کے اس قدر زبردست ماہر تھے کہ کوئی اُن کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا وہ نماز کے بے حد پابند اور بڑی سختی کے ساتھ، مذہبی آدمی تھے، اور دین کے خلاف اگر کوئی اُن کے سامنے بات کرتا تھا تو وہ، جامے سے باہر ہو کر، چیخنے چلانے لگتے تھے۔
ایک دن میں نے اُن سے کہا تھا کہ زیبا صاحب، اگر آپ ایم اے نہ ہوتے، تو خدا کی قسم وضو کے بدھنے اور استنجے کے ڈھیلے بیچتے پھرتے تو وہ ہنسی کے مارے لوٹنے لگے تھے۔
اُن کے مزاج میں بڑی ظرافت بھی تھی۔ وہ ہماری محفل میں ہر ہفتے آتے، میرزا ابو جعفر اور میری جیب سے اس قدر صفائی کے ساتھ، چیزیں اُڑا لیا کرتے تھے کہ ہم کو مطلق پتا نہیں چلتا تھا، اور چلتے وقت پکار کر کہا کرتے تھے، لوگ اپنی جیب ٹٹول کر دیکھ لیں۔ کوئی چیز غائب تو نہیں ہو گئی ہے۔ اور جب ہم چیختے کہ ہماری جیبیں خالی ہو چکی ہیں تو، مٹھائی کا وعدہ لے کر، ہماری چیزیں واپس کر دیا کرتے تھے (ہائے اب کوئی ہماری جیبیں خالی کرنے اور میری بالائی کی پلیٹ اُڑا لے جانے والا باقی نہیں رہا ہے)
انتقال سے ایک دن قبل وہ میرے یہاں بالکل تن درست اور ہشاش بشاش آئے تھے، اور انھوں نے، جاتے ہوئے میری بیوی سے کہا تھا کہ بھابی آپ میری بزرگ ہیں، میرے حق میں دعا کیجیے، اُن کی یہ آواز سنتے ہی، میرے دل میں بجلی کی لپک کے مانند یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ کل تک زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ وہی ہوا دوسرے ہی دن وہ ہم سب کو روتا چھوڑ کر، ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو گئے ہائے، دوستوں کو روتا چھوڑ کر چلا جانا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ دوستوں کی موت پر عمر بھر کے لیے ماتم کیا جائے ___ زیبا میں تم پر تمام عمر روتا رہوں گا۔

❁

☆ ___ زیبا ردولوی (۱۹۰۷ء۔ ۱۹۶۸ء) کا غیر مطبوعہ شعری اثاثہ اُن کے صاحبزادے اطہر حسنین صاحب کے پاس کراچی میں موجود ہے۔ جس میں سے اُن کے قصائد اور مرثیوں کا مجموعہ 'گلہائے زیبا' ۱۹۹۸ء میں کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

ذہین شاہ تاجی

کوئی تک بھی ہے جنابِ والا، شاہ صاحب اور میرے مابین اختلاط واتحاد کا۔ وہ غیبی ہیں، میں شہودی، وہ ذکر کے رسیا، میں فکر کا شیدا۔ اُن کا آلۂ علم وجدانی، میرا وسیلۂ آگاہی بُرہانی، وہ مسندِ یقین پر مطمئن، میں خارزارِ تشکک میں لہولہان۔ میں خراباتی، وہ خانقاہی اور پھر بھی ہم ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار۔

یہ اضداد کی ہم آغوشی ہوئی کیوں کر، نہایت اختصار کے ساتھ سناتا ہوں۔ میرے سوتیلے خالو نواب خادم حسین خاں، جنھوں نے نوابی ترک فرما کر درویشی اختیار کر لی ہے، ۱۹۵۵ء میں جب مجھ سے ملنے آئے تھے۔ اُن کے ساتھ ذہین شاہ نے بھی، غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا تھا اور وہ پہلا دن تھا کہ میں نے اُن کی صورت دیکھی تھی (شاہ صاحب فرماتے ہیں وہ مجھ سے...... وطن جے پور میں بھی ملے تھے، لیکن وہ ملاقات میرے حافظے سے نکل چکی ہے)

وہ جو کہتے ہیں کہ انسان کی سب سے پہلی سفارش اُس کا چہرہ ہوتا ہے۔ سو مجھے اُن کے چہرے نے زیادہ متاثر کیا، اور یہاں تک کہ میرا دل اُن کی جانب کھنچنے لگا۔

اُس کے بعد جب مکالمت کی نوبت آئی تو اُن کے الفاظ کے رچاؤ، فقروں کے بہاؤ، اور لہجے کے سبھاؤ نے [یہ بات] ثابت کردی کہ وہ ایک ذی علم انسان ہیں، اور بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ، میں نے اُن میں یہ وصف بھی پایا، جو فقط بڑے آدمیوں ہی میں ہوتا ہے، کہ وہ اپنے کلمات کے خلاف جب کوئی بات سنتے ہیں تو، تلخی و ترشی، یا غیظ و غضب کے عوض، اُن کے چہرے پر ایک دل آویز تبسم مچلنے لگتا ہے۔ ہر چند میرے اور اُن کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے، لیکن میں اُن سے محبت کرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ مجھے شاہ صاحب کی ایک بات ——— ☆

☆ ——— کراچی کی معروف خانقاہی شخصیت بابا ذہین شاہ تاجی صاحب (۱۹۰۲ء-۱۹۷۸ء) سے جوش صاحب کے قلبی تعلقات کا اندازہ اُن خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو جوش صاحب نے اُنھیں لکھے۔ یہ خطوط پہلی بار راقم السطور کی کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں، جلد اوّل (فروری ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوئے ہیں اس کے بعد، (جاری ہے)

راغب مراد آبادی صاحب کی کتاب 'مخطوطہ جوش ملیح آبادی' (اکتوبر، ۱۹۹۳ء) اور خورشید علی خاں صاحب کی کتاب 'ہمارے جوش صاحب' (جنوری، ۱۹۹۶ء) میں بھی انھیں شامل کیا گیا ہے۔ بابا صاحب کا نام محمد طاسین ذہین تھا۔ جے پور کے رہنے والے تھے اپنے اسلاف کے سلسلۂ خلافت سے اُن کا سلسلہ متصل تھا۔ ۱۹۶۷ء میں اُن کی غزلیات کا مجموعہ 'آیات جمال' جوش صاحب کے مقدمے (اضداد کی ہم آغوشی) کے ساتھ کراچی سے شائع ہوا تھا۔ انھی دنوں جوش صاحب یادوں کی برات کے لیے اپنے حلقۂ احباب پر لکھ رہے تھے۔ پیشِ نظر صفحۂ گم شدہ اوراق کا آخری صفحہ ہے اور یہ اسی لیے ادھورا اور نامکمل ہے کہ جوش صاحب نے کتاب پر لکھتے ہوئے اس صفحے کو روک دیا تھا۔

❁

سرور، بارہ بنکوی

یہ، نامِ خدا ابھی جوان ہے۔ اس کم مشقی کے باوجود دور کی کوڑی لاتا ہے، اور سامعین کا دل لبھاتا ہے۔ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بڑا ہی سعادت مند، نہایت مُہذب اور قابلِ تحسین حد تک خوش نوش ہے، پی کر بہکتا نہیں، جی بھر کے چہکتا ہے۔
حالات کی ناسازگاری سے مجبور ہو کر وہ فلمی دنیا کی طرف مڑ گیا ہے، خیر، اور دھندوں کے بالمقابل یہ میدان بہت غنیمت ہے، اس میں اس کی شاعرانہ صلاحیت اتنا رنگ بھر دے گی کہ چند روز کے بعد، اُس کو تہی دامانی کی شکایت نہیں رہے گی۔ لیکن اگر اُس کو فراغت حاصل ہوتی تو اُس کی صلاحیتیں اور اُبھر جاتیں، شاعر کی حیثیت سے وہ ایک قابلِ رشک مقام حاصل کر لیتا۔
ہمارے کتنے صاحب جوہر ادیبوں اور شاعروں کی فکر کو روٹی کھاتی چلی جا رہی ہے، اور حکومت ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کے موذی مرض میں گرفتار ہے۔

سلامت علی خاں

رام پور کے پٹھان، نارائن گنج میں براجمان، جوٹ کی تجارت میں ہلکان، بڑی شریف و لائق سیدانی کے شوہر ذی شان، پانچ بیٹوں کے باوا جان، سب بیٹے، لولو و مرجان، بڑے پکے مسلمان، پھر بھی مے گساروں کے کپتان، شاعری کے سچے قدر دان، بنگال میں میرے مستقل میزبان، ہر چند مُردہ ایفاء و زندہ پیمان، پھر بھی، موتیوں میں تولنے کے قابل انسان۔
میں اُن کو کبھی نہیں بھولتا، وہ بھی مجھ سے، چھوٹے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں☆ جب نارائن گنج جاتا ہوں، وہ "نارائن نارائن" کہتے دوڑ پڑتے ہیں، خوب بھینچ کر گلے لگاتے ہیں، لیکن جب کراچی آجاتا ہوں، وہ مجھے بھول جاتے ہیں۔ بڑے بڑے وعدوں سے دل لبھاتے ہیں، مگر ایفاء سے جی چراتے ہیں، پھر بھی میں ان کی محبت سے ہات نہیں اُٹھاتا ہوں، اور ہمیشہ اُن کے گُن گاتا ہوں۔ اسے کہتے ہیں بے لوث محبت۔
ایک روز وہ، دوپہر کے وقت پی رہے تھے، مجھ کو متلی ہو رہی تھی، اور میں سوچ رہا تھا کہ جو لوگ مطلق نہیں پیتے، پینے والوں کو دیکھ کر انھیں کس قدر نفرت ہوتی ہوگی، اس لیے ہم کو چاہیے کہ بد توفیقوں کے سامنے جام نہ اُٹھائیں اور "ظلم بر حیوانات"[1] سے اپنا دامن بچائیں۔

❁

---

1 ___ Crimlty to Animals

☆ ___ سلامت علی خاں کے نام جوش صاحب کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط مجھے ادب نواز دوست اور جوش صاحب کے قدر داں عمران علی سجاد نے دیے تھے جو انہیں سلامت علی خاں کے صاحبزادے شاہد علی خاں (کراچی اسٹاک ایکسچینج) سے ۲۰۰۱ء میں ملے ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش صاحب اور سلامت علی خاں کے درمیان اپنائیت کا رشتہ استوار تھا کئی خطوط میں جوش صاحب نے انہیں برادرِ عزیز کہہ کر بھی مخاطب کیا ہے۔ یہ خطوط اب تک تو غیر مطبوعہ ہی ہیں لیکن جوش صاحب کے خطوط کے مجموعے پر مشتمل راقم السطور کی کتاب میں یہ تمام خطوط آپ عنقریب ملاحظہ فرما سکیں گے۔

سلیم اللہ فہمی

ردولی کے باشندے ہیں، مدتِ دراز سے بنگال کو وطن بنالیا ہے لیکن زبان کو بگڑنے نہیں دیا ہے، اور لہجے کے پاؤں میں موچ نہیں آنے دی ہے۔ غزل اور نظم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لیکن ایک زمانۂ دراز سے شاعری ترک کر چکے ہیں۔ پہلے کراچی میں محکمۂ خوراک کے جوائنٹ سکریٹری تھے، اب، پنشن پانے کے بعد، ڈھاکے میں رہتے ہیں۔

ایک زمانے سے دل کے بیمار ہیں۔ اللہ اُن کے دل کو دھڑکتا رکھے کہ اُن کا سا بے لوث اور قابلِ پرستش دوست، چراغ لے کر، ڈھونڈوں گا، تب بھی نہیں ملے گا۔

ہماری عمر اب اس قدر ڈھل چکی ہے کہ ہم دونوں اب موت کی بس کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں، اور میں اس تاک میں ہوں کہ، اُنھیں کہنی مار کر، بس میں سوار ہو جاؤں۔ ہائے کیا دنیا ہے:

کمر، باندھے ہوئے، چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں!

حمایت علی، شاعرؔ

نام ہے حمایت علی، باشندہ ہے دکن کا۔ ہر چند کئی بچوں کا باپ ہے، مگر، بچوں کے طرح شگفتہ رو اور شریف گھرانوں کے لڑکوں کی طرح سعادت مند و با ادب ہے۔ مزاج میں اس کے بڑی قیامت کی اُپج، اور اُس کے دماغ میں ایک بڑے شاعر بن جانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ لیکن "روٹی تو کسی طرح کما کھائے مچھندر" کے تحت، یہ بچہ بھی فلمی دنیا میں آ گیا ہے، جس سے اُس کے جوہرِ شاعری کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

اس میں شک نہیں، وہ روٹی تو ضرور کمالے گا، مگر اُس کو معلوم نہیں کہ وہ روٹی اُس کو نگل جائے گی۔ وہ ڈوب رہا ہے، مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ اس ہونہار جوان کو دریا سے نکال لاؤں۔ یہ کام تو حکومت کا تھا کہ وہ اپنے اولیائے فن کو، بہمہ وجوہ مطمئن کر کے، اُن سے فقط ذہنی کام لیتی، جس کے واسطے قدرت نے انھیں پیدا کیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے:

یاں تو، کوئی سنتا نہیں، فریاد کسی کی!

شمس، زبیری

میں ان کو "شمس تبریزی" کہتا ہوں۔ سنتا ہوں شمس تبریزی یہودی تھے، عقائد کی رو سے، یہ ممکن ہے یہودی ہوں، لیکن کردار کے اعتبار سے قطعی یہودی نہیں۔ اور، معاملات میں بڑے کھرے ہیں۔ ماہ نامہ "نقش" کے بڑے لائق مدیر ہیں، اور موڑ سے لے کر قلم تک کے تمام اسرار سے واقف ہیں۔ شیعہ دوستوں سے اُن کی بڑی نوک جھونک رہتی ہے، مگر مزاح مومنین کی حد تک، کیا مجال کہ اُس میں تلخی کی جھلک آنے پائے۔ فن کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو بے ہوش، اور ایک باہوش۔ یہ، خدا کے فضل سے باہوش فن کار ہیں، اور قلم کے ذریعے سے رزقِ کریم حاصل کر رہے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں آپ ان سے محبت نہ کریں کہ یہ ایک زمانے میں آپ کے خلاف تھے، اور انھوں نے "جوش نمبر" کی ترتیب میں شاہد احمد دہلوی کا ہات بٹایا تھا، میں کہتا ہوں کہ یہی تو ان کی ایک ایسی خوبی ہے، جس سے ان کے کردار کی استواری ثابت ہوتی ہے، اور اُن کی ذات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دوست شاہد احمد دہلوی کا ساتھ دیا تھا۔

لیکن یہ شمس زبیری صاحب ایک رائی بھر خلافِ مزاج بات پر دفعتاً پربت بھر بگڑ بھی جاتے ہیں☆ اور دوستوں سے اس طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں کہ:

پھری ہیں ہم سے نگاہیں وہ ہیل میل نہیں
میں دیکھتا ہوں کہ اب ان تِلوں میں تیل نہیں

پھر بھی دل ان کا چوں کہ شفاف ہے اس لیے بے منائے خود مَن بھی جاتے ہیں۔

☆___ شمس زبیری کے بارے میں یہ پورا صفحہ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن میں میرے چند قابلِ ذکر احباب کا حصہ تھا البتہ ترمیم شدہ ایڈیشن میں اسے ہٹا دیا گیا۔ یادوں کی برات کے جو غیر مطبوعہ صفحات دستیاب ہوئے ہیں ان میں شمس زبیری کے تذکرے میں یہ آخری سطریں موجود نہیں ہیں۔ جوش صاحب نے پہلے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یہ اضافہ کیا تھا۔

صبا، اکبرآبادی

رعنا اکبرآبادی کے قرابت دار، اور میرے بڑے چہیتے یار ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے، وہ بڑی پٹڑی (براڈ گیج) کے انجن ہیں، مگر غزل کی چھوٹی پٹڑی (میٹر گیج) پر، اپنے کو سکیڑ کر چل رہے ہیں، اور اس بچاؤ کے باوجود ایسے ایسے آب دار شعر کہتے ہیں کہ ذوقِ شعری وجد کرنے لگے جن لوگوں نے اُن کے مراثی و قصائد سنے ہیں، وہ میری اس رائے کی تائید کریں گے کہ وہ اس قدر خوش فکر شاعر ہیں کہ اُن کو سر آنکھوں پر جگہ دی جائے۔
اُن کے اچھے شاعر ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ بڑے اچھے انسان بھی ہیں، اُن کے خلوص، اور اُن کے بھولے پن میں وہ کشش ہے کہ جب بھی اُن کو دیکھ لیتا ہوں، بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ چھاتی سے لگا کر پیار کرلوں، ایک روز میں اُن کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نہایت خوبصورت تصویر پر میری نظر پڑ گئی، میں نے پوچھا۔ صبا صاحب، یہ کون پٹاخا سا حسین لونڈا ہے، انھوں نے، بڑے شیریں تبسم کے ساتھ سر جھکا کر کہا جی، یہ مر چکا، لیکن اب تک دفن نہیں ہو سکا ہے۔ یعنی یہ اسی خاکسار کے لڑکپن کی تصویر ہے۔ میں نے قہقہہ مار کر، ان کو سینے سے لگا لیا، اور کہا ہائے کیسا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔
وہ پہلے، رعنا صاحب کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔ اب کسی مدرسے میں معلم، اور قلیل تنخواہ پر، بڑی اُداسی کے ساتھ، زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔
کس کو نہیں معلوم کہ معلم، قوم کا معمار، اور نژادِ نو کا پروردگار ہوتا ہے، مگر اس سرزمین پر تو اسے ''راج'' یعنی تھوئی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دی جاتی یہاں تو سکوں کی تھیلیاں تولی جاتی ہیں، کھوپڑیوں کو کوئی پوچھتا نہیں۔ سچ کہا ہے عرفی نے:

خاک باشی، خوک باشی، با سگِ مُردار باش
ہرچہ باشی۔ باش عرفی، لیک زردار باش!

۞

عابدی

آغا حسن عابدی۔ میرے لکھنؤ کے باشندے، اور یونائیٹڈ بینک کراچی کے صدر ہیں۔ سنا تھا کہ وہ بڑے خشک اور بے مہر و مروت انسان ہیں، دیکھا تو اُن کو سراپا خیر پایا۔
کہتے ہیں افواہوں میں کچھ نہ کچھ جان ضرور ہوتی ہے، اور جب تک رائی نہ ہو اُس کو پربت نہیں بنایا جاسکتا، یہ بات مجھے بھی تسلیم ہے، لیکن آغا صاحب کی ملاقات کے بعد، یہ بات ثابت ہوگئی کہ کم سے کم یہ افواہ قطعی غلط اور معاندانہ ہے۔ کس سے یہ بتاؤں کہ آغا صاحب نے جو سلوک مجھ سے کیا ہے، وہ سلوک، معمولی انسانوں کا نہیں، اوتاروں کا ہوا کرتا ہے۔ ☆

جس نے کچھ احساں کیا، اک بوجھ ہم پر رکھ دیا
سر سے تنکا کیا اُتارا، سر پہ چھپر، رکھ دیا

افسوس کے لوگوں نے، اپنے نفوس پر قیاس کر کے، اُن کی بدگوئی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ فقط اعلےٰ درجے کے بینک پیا ہی نہیں، بلکہ ایک بڑے نکتہ سنج مفکر بھی ہیں۔ اور زندگی کے بے شمار مسائل کو کھنگال چکے ہیں۔
اُن کو بینک میں گرفتار دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے، انھیں تو مسندِ علم پر جلوہ گر ہونا چاہیے تھا، لیکن صد حیف کہ وہ سونے کی دار پر لٹکے ہوئے ہیں، اور ان کے گرد ارباب علم کے عوض، ہزاروں جاہل کرورپتی شور مچا رہے ہیں ___ حالات کا دھارا انسان کو بہا کر کہاں سے کہاں لے جاتا ہے:

من ملک بودم و فردوسِ بریں، جایم بود
آدم آورد و ایں دیرِ خراب آبادم

☆ ___ جوش صاحب کے خیر خواہوں میں آغا حسن عابدی مرحوم (۱۹۲۲ء۔۱۹۹۵ء) کی ذات کو بڑی اوّلیت حاصل ہے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ چاہا کہ جوش صاحب کا تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام از سر نو شائع کیا جائے۔ زاہدہ حنا نے اپنے ایک کالم میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ آغا حسن عابدی نے خاندانِ جوش کو پیش کش کی تھی کہ وہ (آغا صاحب) جوش صاحب کے تمام کلام کو شائع کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں لیکن خاندانِ جوش کی طرف سے انھیں کوئی مثبت جواب نہیں دیا گیا۔ (روزنامہ جنگ کراچی، ۲۳ر فروری ۱۹۸۹ء ص: ۳)

ظفرؔ

سراج الدین ظفر، نہایت وجیہ، بے حد شریف، اور بڑے محبت کے انسان ہیں ان میں آفاق گیر شاعری کی صلاحیت ہے قدرت نے اُن کو شاعرِ کبیر بن سکنے کا جوہر، بڑی دریا دلی کے ساتھ، ودیعت فرمایا ہے، لیکن وہ اپنی وسعتوں کو غزل تک محدود کیے ہوئے ہیں__ ہر چند یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن کی غزل کا مزاج، اور اُن کا لہجہ تمام غزل گویوں سے بالکل مختلف اور بمراحل بلند ہے، اور اُن کے وہاں فارسی کی جو چاشنی پائی جاتی ہے، وہ عین میرے مذاق کے مطابق ہے۔

اُن کے اکثر اشعار پر میں جھوم جھوم اُٹھتا ہوں__ اُن کے علاوہ، کوئی دوسرا شاعر اس منزل پر آ کر رک جاتا تو میں اُس سے آگے کا مطالبہ نہ کرتا، اور اُس خوش فکر کو، داد دے کر، خاموش ہو جاتا۔ لیکن سراج میاں کا معاملہ دوسرا ہے وہ چوڑے آدمی ہیں اس لیے میں اُن سے [استدعا] کروں گا کہ وہ ایک محدود قطعۂ ارض پر کاشت کاری نہ کریں، تمام روئے زمین کو اپنے حلقۂ کاشت میں لے آئیں، یعنی:

کچھ اور چاہیے وسعت، ترے بیاں کے لیے! ☆

☆__ سراج الدین ظفر کے بارے میں جوش صاحب کی یہ تحریر اُن کے قلمی نسخے کے صفحہ نمبر ۱۷۵ پر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے چھ شاعروں اور دوستوں پر لکھا اور پھر صفحہ ۱۸۲ پر سراج الدین ظفر کے بارے میں اُن کی ایک اور تحریر ملتی ہے جو اُن کی پہلی تحریر سے مماثل بھی ہے اور مختلف بھی۔ مختلف ہونے کی وجہ ہی سے یہاں فٹ نوٹ پر ہم اسے نقل کر رہے ہیں "سراج الدین ظفر، نہایت وجیہ، بے حد شریف، نہایت ذہین، اور بڑے رندِ پاک باطن ہیں۔ قدرت نے اُن کو شاعرِ بزرگ بن سکنے کا جوہر عطا کیا ہے، لیکن وہ اپنی وسعتوں کو غزل تک محدود کیے ہوئے ہیں۔ ہر چند یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن کی غزل کے تیور، اُن کے کلام کا مزاج، اور اُن کا لہجہ، تمام غزل گویوں سے بالکل مختلف، اور بہ مراحل بلند بھی ہے اور اُن کے وہاں فارسی کی جو مٹھاس پائی جاتی ہے، وہ میرے مذاق کے عین مطابق اور میری شاعری و رندی کا بڑا سرچشمہ ہے اُن کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر اگر اُن کے مقام تک آ کر ٹھہر جاتا تو میں اس سے نہ کہتا لیکن سراج کا معاملہ دوسرا ہے، اُن کے جوہرِ سخن کا سینہ بہت چوڑا ہے، وہ بڑی بلند پروازی رکھتے ہیں، اس لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ میاں، ایک محدود قطعۂ ارض پر کاشت کاری نہ کرو، اور تمام انفس و آفاق کو اپنے ہل کے نیچے لے آؤ اور، کائنات کے تمام گوشوں پر چھا جاؤ۔ اس لیے کہ: کچھ اور چاہیے وسعت، ترے بیاں کے لیے؟"

عبدالحسین، تھاریانی

اُن کے دل کی طرح، اُن کا چہرہ بھی منور ہے، فرنچ کٹ داڑھی، دراز قامتی، اور آنکھوں کی فن کارانہ تابش نے ان کو جمال و جمال☆ کا ایک مرکب مجسمہ بنادیا ہے۔ وہ عظیم عمارت گر (آرچی ٹکٹ) اور صوفی مزاج شاعر ہیں۔ ان کے دماغ میں ہزاروں تاج محل کنمناتے اور سر بہ فلک عمارتوں میں تبدیل ہو کر اُن کی خلاقی کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ میرے مکان "بیت الشرف" کا نقشا بھی انھوں نے ہی بنایا تھا☆۱، اگر میرا خطرناک ٹھیکہ دار جس کا نام اکرم ہے، اس کی صورت نہ بگاڑ دیتا تو آج میرا مکان دیکھنے کے قابل ہوتا۔
اُن کی مادری زبان گجراتی ہے، لیکن، گجراتی کی طرح، وہ اردو میں بھی، شعر کہتے ہیں، اُن کی شاعری انسان دوستی سے بھری ہوئی ہے۔ میں نے اُن کے چند گجراتی قطعات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے☆۲، جو "صابر کے موتی"[ا] کے نام سے شائع ہو چکا ہے، وہ میرے پرانے، بمبئی کے زمانے سے، دوست ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی کی پائے داری، ایک عجیب چیز ہے۔ میں حدود شکن رند ہوں، وہ متقی اور عبرت ناک حد تک متقی ہیں۔ اور یہ نباہ اس بناء پر ہو رہا ہے کہ وہ محبت کی بناء پر میری رندی سے مصالحت کر چکے ہیں، اور میں، وسعتِ قلب کے باعث، اُن کے تقوے کو معاف کر چکا ہوں اور ہماری دوستی:

تم ، ظلم چھوڑ دیتے ، ہم ، ترکِ آہ کرتے
کچھ تم نباہ کرتے ، کچھ ہم نباہ کرتے

کے جادے پر قدم رکھتی چلی جارہی ہے۔

☆ ___ جمال و جمال ہی لکھا ہوا ہے۔ کیا یہاں جلال و جمال ہونا چاہئے تھا؟

☆۱ ___ کراچی کے فیڈرل بی ایریا بلاک ۵ میں کوٹھی نمبر ۱۳۸، ڈی کے تعمیر کی ذمہ داری تھاریانی صاحب پر تھی

☆۲ ___ صابر صاحب کے گجراتی قطعات کا جوش صاحب نے منظوم ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب 'صابر کے موتی' کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں سمندزاد پبلکیشنز کراچی نے شائع کی اس میں تھاریانی صاحب کے متعلق جوش صاحب کا تعارفی نوٹ بھی تھا۔

• ان کی غزلوں کا مجموعہ 'دیوانِ صابر' (۱۹۷۱ء) بھی جوش صاحب کی رائے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

ا ___ صابر، تخلص ہے

فضلی

بڑے پاکیزہ مزاج آدمی ہیں، اور گھر بھی ایسا بنایا ہے کہ دلھن معلوم ہوتا ہے۔ اُن کو غزل سے وہ شیفتگی ہے کہ مکان تک کا نام "بیت الغزل" رکھا ہے۔

جگر مرادآبادی کے سب سے بڑے معتقد ہیں، اوڑھنا بچھونا ہے غزل، ہلکی پھلکی، عاشقانہ بول چال میں ڈوبی ہوئی رنگین غزل۔

وہ شاعری میں بھاری بھرکم الفاظ کے سخت مخالف ہیں، غزل کی حد تک یہ بات صحیح ہے، اس لیے کہ الھڑوں کے سامنے بیٹھ کر، اور جنسی ہیجان میں ڈوب کر "اللہ کی قسم" تو کہا جاسکتا ہے "یا اللہ العظیم" کون کہہ سکے گا۔

لیکن آفاقی و فکری شاعری کے میدان میں ہلکے پھلکے الفاظ سے کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ اُن کے ناتواں الفاظ پر اگر دقیق معانی سوار کردیے جائیں گے تو ان کی ہڈیاں بولنے لگیں گی، اور ان کی کمریں ٹوٹ کر رہ جائیں گی۔

میں غزل کا مخالف ہوں، وہ غزل کے شیدائی ہیں۔ ہمارے مابین اس موضوع پر اکثر بڑی نوک جھونک ہوا کرتی ہے، لیکن کیا مجال کہ تلخی راہ پاسکے، میں بھی قہقہے مارتا ہوں، وہ بھی ہنستے رہتے ہیں۔

سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے غزل کا شاعر سمجھتے ہیں، اور غزل و تغزل میں جو بین عملی فرق ہے، اپنی "مراد اندیشگی" (wish ful thinking) کی بنا پر، وہ اُس فرق کو نہیں سمجھتے۔

وہ اس قدر خوش طبع، شائستہ اور شستہ انسان ہیں کہ اُن سے مل کر روح میں بالیدگی آجاتی ہے اور اگر اُن کا گھر قریب ہوتا میں ہر وقت ان کے مکان میں دھنا دیے، بیٹھا رہتا۔

قیصر

نظیر حسین نام، اور تخلص تھا قیصر، قوم کے شیخ تھے، لیکن چوں کہ پروان چڑھایا تھا، پٹھانوں کے شہر یعنی شاہ جہاں پور نے، اس لیے مزاج میں قیامت کا تیکھا پن تھا، ذرا ذرا سی بات پر، بڑے بڑے دوستوں سے اُلجھ پڑتے تھے۔
اُن کو شیعیت سے بڑی چڑ تھی، ایک دن میں نے اُن کو بُخاری کی ایک روایت سنائی تو وہ مجھ سے بگڑ گئے، اور کہنے لگے یہ رافضیوں کی من گھڑت ہے، اب میں آپ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ جب وہ ایک ہفتے تک میرے پاس نہیں آئے، میں انھیں منانے کے لیے اُن کے گھر پہنچ گیا، بُخاری ساتھ لے گیا تھا، وہ روایت ان کے سامنے رکھ دی، اور وہ مجھ سے من گئے، اور بُخاری کو بُرا کہنے لگے۔
اُن کو سلیم اللہ صاحب فہمی نے، قالین بافی کا ایک پرمٹ دلا دیا تھا جس کے چلانے کے واسطے بیس لاکھ کی ضرورت تھی، میں نے سمجھایا "دیکھو قیصر اس قدر سرمایہ تمہارے پاس نہیں ہے، لامحالہ کسی موٹی آسامی کو شریک بناؤ گے، وہ سرمایہ دار چار دن میں تمھیں دھتا بتا کر خود قابض بن بیٹھے گا، اس وقت تم کو اس پرمٹ کے گیارہ لاکھ روپے مل رہے ہیں، اس کو فروخت کر کے، کوئی دوسرا دھندا شروع کر دو، وہ تمہارے قبضے کا ہوگا"۔ انھوں نے جواب دیا کہ "یہ بے ایمانی کی بات ہے"۔
ایک مدت دراز تک وہ شریک کو ڈھونڈتے رہے، کوئی معقول آدمی نہیں ملا، اور آخر تنگ آ کر، انھوں نے وہ پرمٹ لاکھ سوا لاکھ میں فروخت کر دیا۔
فروخت کر دینے کے کوئی مہینے دو مہینے کے بعد وہ میرے پاس آئے، منھ لٹکائے ہوئے۔ میں نے پوچھا "اب اُس رقم سے کون سا دھندا سوچا ہے" انھوں نے سر جھکا لیا۔ اور جب میں نے بے حد اصرار کیا، اور غضب ناک ہو کر اصرار کیا تو انھوں نے کہا۔ "بھائی اور بہن میں وہ روپیہ قرض کے نام سے تقسیم ہو چکا ہے۔ اب میرے پاس دوا و غذا کے واسطے بھی کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اور بھائی، بہن، دونوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں"۔ وہ ہمیشہ کے بیمار تھے، اس آخری ضرب نے اُن کا دل توڑ دیا، وہ بھائی کے گھر سے اُٹھ گئے۔ اور چند ہی روز میں انھوں نے دم توڑ دیا۔ قیصر اُن درجہ اوّل کے ناعاقبت اندیش مخلص انسانوں میں سے تھے، جو خود، برباد ہو کر، دوسروں کا گھر بھر دیا کرتے ہیں۔
اُن کا خلوص، کھرے سونے کی طرح خالص تھا، اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ بے حد متدیّن و خوددار بھی تھے، اور اسی خطا پر روزگار نے اُس فرشتہ خصلت انسان کو ذبح کر ڈالا۔ ہائے قیصر، ہائے قیصر!!

مبین الحق، صدیقی

ایک زمانے میں وہ اس قدر صاحب خیر و مخلص انسان تھے کہ شرافت کو اُن کی ذات پر ناز تھا۔ لیکن جب سے وہ سیاست کی دلدل میں پھنس گئے ہیں، اُن کی کایا پلٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں ان کو سمجھایا تھا کہ مبین صاحب آپ اس قدر بھولے بھالے اور ایسے خالص شریف آدمی ہیں کہ آپ سیاست کے میدان میں کبھی پنپ نہیں سکیں گے، یہ کوچہ دغا بازوں اور بے ایمانوں کا ہے، خدا کے لیے اُدھر نہ جائیے ـــــ لیکن وہ نہیں مانے، اسمبلی کے اسپیکر بن گئے، اسپیکری کا بار اُٹھا نہیں سکے، علیحدہ کر دیے گئے۔ لیکن کچھ ایسی قلبِ ماہیت ہو چکی ہے کہ اسپیکری کے عہدے سے ہٹ جانے کے بعد بھی، وہ سیاست کو سینے سے لگائے لگائے پھرا کرتے ہیں۔

ہائے وہ معصوم آدمی، اب ہمارے کام کا نہیں رہا ہے، اور بازاری لوگوں کی ہم نشینی کے عذاب میں گرفتار ہے۔

محمد طفیل

رسالہ ''نقوش'' کے مدیر، اور چہرے پر وہ تنویر کہ:

خطِ ساقی ، گر ازیں گو نہ زند نقش بر آب
اے بسا رخ کہ بخونا بہ منقش باشد!

جب کبھی لاہور جاتا ہوں، وہ ہمیشہ میرے پاس آتے اور گھنٹوں بیٹھتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے، جس زمانے میں میرے خلاف ''ساقی'' کا ''جوش نمبر'' نکالا تھا، اس بات کی بڑی سعی کی تھی کہ وہ بھی میری بدگوئی میں حصہ لیں، مگر انھوں نے انکار کر دیا تھا، اور، میری ذات کے ساتھ اُن کی محبت کا یہ بڑا ثبوت ہے۔☆

وہ، جس معنوی و صوری حُسن کے ساتھ ''نقوش'' نکالتے ہیں، اس پر نگاہ کر کے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے تمام مدیروں پر اُن کو فوقیت حاصل ہے۔

وہ صورت کے اعتبار سے دل کش، اور سیرت کے اعتبار سے مکمل تاجر ہیں، اور کہا جا سکتا ہے کہ:

چہ قیامت است، جاناں، کہ بعاشقاں نمودی
رُخے، ہم چو ماہِ تاباں، دلے، ہم چو سنگِ خارا!

لیکن اس کے باوجود، اور بعض تجربوں کے باوصف، مجھے اُن سے محبت ہے، اور ایسی محبت جو سود و زیاں کو خاطر میں نہیں لاتی:

اے خالِ رُخِ یار، تجھے ٹھیک بناتا جا، چھوڑ دیا، حافظِ قرآن سمجھ کر!

☆ ___ ماہنامہ ساقی کے جوش نمبر (۱۹۶۳ء) کے سلسلے سے شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمد طفیل نہیں چاہتے تھے کہ جوش صاحب کی مخالفت کے شعلوں کو ہوا دی جاتی رہے۔ شاہد احمد دہلوی کے نام اُن کے ۲۵ راپریل ۱۹۶۳ء کے خط کا یہ اقتباس اسی جذبے کی عکاسی کرتا ہے: ''___ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں، میں جوش صاحب پر مضمون ضرور لکھ دیتا، میں انہیں کوئی چدرہ برس سے پڑھ رہا ہوں مگر میرا خام مطالعہ آپ کے نمبر کے مزاج کے خلاف ہوگا ___'' (ساقی جوش نمبر ۱۹۶۳ء ص: ۳۹۸)

منور عباس

میرٹھ کے باشندے، لکھنؤ کے تربیت یافتہ، لکھیم پور کے مسلم لیگی لیڈر اور ممتاز وکیل، اب، کراچی کے، سر برآوردہ ایڈووکیٹ۔ ماضی کے ہر جائی تماش بین، حال کے مجبور و "یک در نشین" متوسط قد کے، دبلے پتلے، پوست و اُستخواں۔ دیکھو تو رائی، اور پرکھو تو پربت قسم کے انسان ہیں.........

..........اس غدار شہر کراچی کی غالباً چھتیس لاکھ آبادی میں صرف ایک منور عباس ہی ایک ایسے جامع المتفرقین فرد ہیں، جو ہر ہفتے ہم تمام "ملاعنۂ ادب"[۱] کو یک جا ہو جانے کی مسرت اندوزی کا موقع دے کر، تیرہ چودہ برس سے چلا رہے ہیں۔[☆] جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔

وہ بڑے حوصلہ مند میزبان بھی ہیں، پوری کراچی میں بالائی صرف انھیں کے وہاں ملتی ہے، اُن کی دعوتوں میں زیبا مرحوم میری بالائی کی پلیٹ چُرا لیا کرتے تھے، ہائے اب کون چُرائے گا۔

اُن کے کام یاب وکیل ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ چڑچڑے پن کی بناء پر وہ اپنے موکلوں کو بُری طرح جھڑکیاں دیتے ہیں، مگر موکل اُن کے اس قدر تابع ہیں کہ جھڑکیاں کھاتے، اور پھر بھی، اُن کے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ہر چند ڈنکے کی چوٹ پر وہ اعلان کر چکے ہیں کہ ہفتے کو میرا دفتر بند رہتا ہے[☆۱]،

---

[۱] یعنی میرزا ابو جعفر کشفی، حبیب اللہ رشدی، راغب مراد آبادی، شاہد شکار پوری، بدر الہٰ آبادی، افتخار حسنین خاں، سراج الدین ظفر، حشم لکھنوی، خاور نگرامی، حکیم ندیم، رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، وغیرہ (کراچی میں شاعروں اور ارباب قلم کو "ملاعنۂ" میں شمار کیا جاتا ہے) اس لیے میں اس اجتماع کو "اجتماع الملاعنۂ" کا خطاب دیتا ہوں

[☆] کم از کم دو عشروں پر مشتمل منور عباس صاحب کے گھر (بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا) کی یہ علمی و ادبی نشستیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں مجھے بھی ان نشستوں میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ میری درخواست پر منور عباس مرحوم کے صاحبزادے، پاکستان کے معروف منقبت وسلام خواں جناب اشرف عباس ان نشستوں کی تفصیلی روداد قلم بند کر رہے ہیں۔

[☆۱] منور عباس صاحب کا یہ دفتر سٹی کورٹ کے بالکل قریب سڑک کے کنارے واقع ایک عمارت میں تیسری منزل پر تھا منور عباس صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ ۲۴ فروری ۱۹۵۰ء کو انہوں نے اس دفتر کا آغاز کیا تھا کچھ عرصے بعد یہاں پر ہر ہفتے میں ایک بار وہ اپنے ادبی دوستوں کے ساتھ ادبی بیٹھک کا بھی اہتمام کرنے لگے۔ پاکستان آجانے کے بعد جوش صاحب اس ادبی بیٹھک کے صدر نشین ہوئے یہ بیٹھکیں بھی ایک بڑا موضوع ہیں جن پر لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔

پھر بھی چند گھومو نہیے موکل آتے، اور اپنے دانتوں سے ہماری آنکھوں کو زخمی کر جاتے ہیں۔
وہ شاعر بھی ہیں، اور کبھی کبھی آب دار شعر بھی کہہ جاتے ہیں۔ لیکن، وہ اُن مزدوروں کی طرح شاعر ہیں، جو قحط کے موقع پر، بیگار کے واسطے پکڑ بلائے جاتے ہیں۔ البتہ، جہاں تک سخن سنجی کا تعلق ہے، اس کراچی میں اُن کا کوئی جواب نہیں، وہ داد کے میدان میں عبدالرحیم خانِ خاناں ہیں، جو تحسین کے پھولوں سے شاعر کی جھولی بھر دیا کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو بخششِ بے جا پر بھی اُتر آتے ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجسم مہر و وفا ہیں، اور میرے نزدیک اُن کے خلوص میں شک کرنا، سب سے بڑا کفر ہے، اس کے باوجود، اگر کوئی اُن کی ذات سے یہ توقع وابستہ کرے گا کہ وہ اپنی قانونی مصروفیت کو مجروح کر کے، اُس کی عقدہ کشائی کے لیے وقت نکال سکیں گے تو اُسے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا، نیز یہ کہ اگر حکومت کسی کے خلاف تفتیش یا کارروائی کر رہی ہے، اس وقت ان کی مال اندیش عقل، اُن کو اپنے دوست کی رفاقت کی اجازت نہیں دے گی۔
وہ بے پناہ ذہین و ژرف نگاہ آدمی ہیں، اور موڈ میں آجائیں تو ایسی حکیمانہ باتیں کرتے ہیں کہ اربابِ ایمان بلبلا اُٹھتے ہیں، اور ہزاروں دینی مسائل کا اس طرح پول کھول کر رکھ دیتے ہیں کہ اُن پر سقراط ہونے کا دھوکا ہونے لگتا ہے،
لیکن، اثنائے کلام میں جب نماز کا وقت آجاتا ہے تو اُن کا حال: 'قبضے پہ ہات رکھتے ہی کچھ اور ہو گئے' کا سا ہو جاتا ہے، وہ سلسلۂ کلام کو، چٹ سے توڑ کر، غسل خانے چلے جاتے ہیں، اور وہاں سے اس بُری طرح منہ لٹکائے اور گندے کھولے، برآمد ہوتے ہیں کہ دیکھنے والوں پر شدید ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور ہم سب، اپنی اپنی جانوں کو غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں ___ اور پُشت کے کمرے میں داخل ہو کر، جب وہ نماز پڑھنے لگتے ہیں، تو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اندھیرے جنگل میں، رات کے وقت بھیڑنی بھکر رہی ہے اور نماز سے فارغ ہو کر جب وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں، تو پھر چار پانچ منٹ تک اُن کا منہ برابر نماز پڑھتا رہتا ہے، اور جتنی دیر تک اُن کے ہونٹ رپ رپاتے رہتے ہیں، میں اپنے اعصاب کو سخت کیے، اور اپنی دونوں رانوں پر ہات جمائے بیٹھا رہتا ہوں کہ کہیں وہ دفعتہً حملہ آور نہ ہو جائیں۔
اور جب وہ آبائی دورہ ختم ہو جاتا ہے۔ اُن کے چہرے کی سختی میں نرمی آجاتی ہے، وہ پھر بساطِ حکمت پر موتی رولنے لگتے اور سقراط و مارکس بن جاتے ہیں۔
میں اُن پر سوچتے سوچتے عاجز آچکا ہوں۔ اُن کی ذات ایک ایسے "بچہ معمائی" (Problam Child) کے طور پر مسائل انگیز، پیچیدہ، چیستانی، دشوار مرور، غرابت محصور، اور عسیر الاستخراج ہے کہ اُس بھول بھلیاں میں عقل بھٹکتی پھرتی، اور راستہ نہیں پاتی ہے۔
دنیا جانتی ہے کہ عقل اور عقائد کے مابین ازلی بیر ہے۔ لیکن منور عباس صاحب، جو گاہ سقراط در آستین و گاہ

سراپا مولانا حبل المتین ہیں، دونوں کو متحد کر کے یہ نعرہ لگا رہے ہیں: ☆

دین را ، من آشنائی دادہ ام ، باعاشقی ۱
ورنہ ، عمرے ، ہر دورا، باہم نفاق افتادہ بود

☆ مقدمے میں یہ بحث کی جا چکی ہے کہ یادوں کی برات کے پہلے ایڈیشن میں جوش صاحب نے 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' کی ذیلی سرخی کے تحت ۳۵ احباب کا ذکر کیا ہے، جس میں آخری نام منور عباس ایڈووکیٹ کا تھا۔ پھر جب ترمیم شدہ ایڈیشن سامنے آیا تو اس میں شمس زبیری، سید سبطِ حسن اور منور عباس صاحب کے نام نہیں تھے ان کی جگہ مجاز کا تذکرہ شامل کیا گیا تھا۔ یہاں فٹ نوٹ میں ہم جوش صاحب کی وہ تحریر بھی شامل کر لیتے ہیں جو ترمیم شدہ ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں 'یادوں کی برات' کا حصہ نہیں تھی۔ ترمیم شدہ ایڈیشن کی تحریر یہ ہے:

"____ میرٹھ کے باشندے۔ لکھنؤ کے تہذیب یافتہ لکھیم پور کے مسلم لیگی لیڈر۔ کراچی کے مقبول ایڈووکیٹ، میزبانی کے رسیا، مرثیوں کے پروردہ، انیس کے شیدائی، علم و ادب کے قدردان، اقلیمِ سخن فہمی کے سلطان، محرابِ تعلقات میں چراغِ محبت، میدانِ خدمتِ یاراں میں قلیل الفرصت، عدالتوں میں شدید الضرب، مجالسِ عزا میں رقیق القلب، نحیف الجسہ، قوی الحافظہ، قلیل الغذا، کثیر الغیظ، جامع المتفرقین، ماضی کے تماش بین، حال کے مصلےٰ نشین، جلوت میں فکر کے غازی، خلوت میں نمازی، مباحث میں سقراطِ ثانی، اعتقاد میں سیدنا قاضی الہمدانی، اعمال میں رائی، افکار میں پربت قسم کے انسان ہیں۔ وہ ایک عقدۂ لاینحل اور Problem Child قسم کے آدمی ہیں۔ وہ جب فکر کے موڈ میں آتے ہیں تو ایسی کھری کھری باتیں زبان پر لاتے ہیں کہ سامعین میں جو دین دار ہوتے ہیں، وہ بلبلا جاتے ہیں اور ہزاروں دینی مسائل کا پول اس طرح کھول کر رکھ دیتے ہیں کہ اربابِ اعتقاد کے منھ، لمبے ہو ہو کر لٹک جاتے ہیں۔ لیکن اثنائے کلام میں جب نماز کا وقت آ جاتا ہے، وہ گریہ آواز کے ساتھ، اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیل کر غسل خانے کی طرف لپک پڑتے ہیں اور وہاں سے وضو کر کے، اس طرح آستین چڑھائے اور ایسا خوفناک منھ بنائے نماز پڑھنے کے واسطے کمرے میں داخل ہوتے ہیں کہ میں اپنی دونوں رانوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر کے بیٹھ جاتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جھپٹا مار کر میرا سارا مال مسالا نوچ کر سڑک پر نہ پھینک دیں۔

اور جب وہ عقبی کمرے سے نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو چند منٹ تک ان کے ہونٹ زیرِ لب ہلاتے رہتے ہیں۔ اور جب تک اُن کا منھ نماز پڑھتا رہتا ہے میں اپنے اعضائے نازک کو غیر محفوظ سمجھتا رہتا ہوں۔ اور جب اُن کا منھ نماز سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر عقل کے دریا بہانے اور منکرانِ دین فلسفہ کے بہت سے اقوال کی تصدیق فرمانے لگتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان کے اثنائے صلوٰۃ میں ہم لوگ جو باتیں کرتے ہیں، وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی ان پر اظہارِ خیال کرنے لگتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی نماز دوسروں کی باتیں برابر سنتی اور ان کے جوابات سوچتی رہتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس مباحث نیوش اور جواب کوش صورتِ حال کو نماز کہا بھی جا سکتا ہے کہ نہیں۔ ارے اللہ کے بندو تم میں سے کوئی تو منھ سے بولے، سر سے کھیلے، اور مجھ نامراد کو بتائے، کہ یہ شخص، جس کو منور عباس کہا جاتا ہے آخر ہے کیا چیز؟؟ لوگو، اگر میری بات مانو تو میں یہ کہوں گا کہ این منور، سریست از اسرار الٰہی، کہ انکشاف اُو، خارج از احاطہ، مکاشفت ____" (ص ۵۷۷، ۵۷۸)

۱ ____ زہد را من آشنائی دادہ ام، باعاشقی (شبلی)

کشفی

نام ہے میرزا ابو جعفر، تخلص ہے کشفی، ان کے باپ کاشمیری، اور ماں لکھنوی تھیں۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اور، چوں کہ باپ شال کا کاروبار کرتے تھے، وہ ان کو لے کر کلکتے چلے گئے، وہیں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی، اور معمولی سی نوکری سے ترقی کر کے محکمۂ تعلیمات کے اعلیٰ عہدے تک پہنچ گئے۔
اُن کی شرافت اور وضع داری اس امر کی مقتضی ہے کہ اُن کی پرستش کی جائے، لیکن وہ جو عورتیں کہتی ہیں کہ کون ایسی کشش ہے، جس میں میخ نہ ہو، اُن کے ماتھے پر، سرکارِ برطانیہ کے عطا کردہ خطاب "خان بہادر" کا سیاہ داغ بھی موجود ہے۔ جو زندگی بھر چھٹائے نہیں چھوٹے گا، اور بھارت ماتا اُن کو قیامت تک معاف نہیں کرے گی۔

اب وہ اپنی پنشن فروخت کر کے، اپنے، برسرِ کار بیٹوں کے ساتھ، کراچی میں رہتے، خاموش زندگی بسر کرتے، اور ہفتے میں صرف ایک بار ہماری "انجمن ملاحین" میں شرکت کے لیے گھر سے نکلتے ہیں۔ وہ پکے شیعہ ہوتے ہوئے، تصوف کی جانب مائل ہوئے اور مولانا روم کی مثنوی، ایسے مکمل سروں میں سناتے ہیں کہ درو دیوار جھومنے لگتے ہیں۔
شاعری میں حکیم ناطق لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک بار اُن کے استاد نے اُن سے کہا تھا کہ تمہاری غزلوں میں بالکل جان نہیں ہوتی، اگر غزلوں میں جان پیدا کرنا چاہتے ہو تو کسی پر جان دینے لگو، تو میں نے یہ کہا تھا کہ میں تو پہلے ہی سے عاشق ہوں، اور اپنی بیوی پر جان دیتا ہوں، اُس پر استاد نے بگڑ کر کہا تھا، لاحول ولاقوۃ، اجی کوئی مردِ معقول کہیں بیوی پر بھی جان دیا کرتا ہے، میاں کسی باہر کی عورت پر عاشق ہو جاؤ تو کام چلے۔

استاد کی اس جھاڑ کے بعد، انھوں نے غزل ترک کر کے، رُباعیاں کہنا شروع کر دی تھیں۔ لیکن ایک حادثۂ عظیم کے بعد، اب اُن کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ وہ ایک مصرع بھی موزوں نہیں کر سکتے۔ ایسا کیوں ہوا، وہ داستان بھی سُن لیجیے۔ وہ کراچی سے کلکتے جا رہے تھے، اُن کے فرسٹ کلاس میں اور کوئی دوسرا مسافر نہیں تھا، کسی جنکشن پر ایک سکھ آیا، اور اُن کا ہم سفر ہو گیا۔ جب وہ نماز پڑھ کر لیٹے تو، جست کر کے، وہ اُن کے سینے پر آ گیا، اور اس

زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ وہ بے ہوش ہو گئے، اُس نے ان کی قیمتی انگوٹھیاں اور سونے کی گھڑی اُتار لی، اور اُن کو مُردہ سمجھ کر، چلتی ریل سے، نیچے پھینک دیا، جان تو بچ گئی، لیکن ان کا سر، بتیس جگہ سے پھٹ گیا، اور موزونی طبع ختم ہو گئی۔ اب وہ اللہ اللہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتے، رات کو نو بجے سے دو بجے تک عبادت کرتے، اور وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔

اب انھوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے، اور جب اپنی جوانی کی رنگ رلیاں بیان کرتے ہیں، تو کان پکڑ کر اور توبہ کر کر کے، اپنے گالوں پر طمانچے مارنے لگتے ہیں۔ ہائے بڑھاپا۔

اُن کا بیان ہے کہ ایک روز، عبادت سے فارغ ہو کر جب میں دو یا تین بجے رات کو بستر پر دراز ہوا تو کوئی میرے پاؤں دبانے لگا، میں نے کہا تم جو کوئی ہو، میرے سامنے آؤ، کوئی جواب نہیں ملا۔ اور دوسرے دن میرے بیٹے نے خواب میں دیکھا کہ چند عورتیں، ایک نہایت مغموم عورت کو حلقے میں لیے بیٹھی، اُس سے یہ کہہ رہی ہیں کہ یہ عورت آپ کے گھر میں رہتی ہے! اس کو ستایئے گا نہیں۔ جب میرے لڑکے کی آنکھ کھلی، پھاٹک پر دستک کی آواز آئی، میرا بیٹا پھاٹک پر گیا تو کیا دیکھتا ہے، وہی مغموم عورت سامنے کھڑی ہوئی ہے، اُس نے پوچھا تم کون ہو، وہ جواب دیے بغیر، غائب ہو گئی اور جب دوسرے دن میں رات گئے وظیفہ پڑھ رہا تھا، تو میری میز پر بالشت بالشت بھر کی چالیس پچاس لڑکیاں ناچتی نظر آئیں۔

خیر، ان باتوں کو تو اُن کے واہمہ کی خلاقی کہا جا سکتا ہے، لیکن وہ جو اپنے کلکتے کا واقعہ بیان کرتے ہیں، وہ اس قدر عجیب ہے کہ اگر کوئی اور کہتا تو میں اُس کو زٹیل سمجھتا۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک جوتشی کا یہ شہرہ سن کر، میں اُس کے پاس گیا کہ اُس کے رجسٹروں میں دنیا بھر کے تمام انسانوں کے نام اور حالات درج ہیں۔

جب میں وہاں پہنچا، اُس نے گھڑی دیکھی، مجھے دیکھ کر، سر ہلایا، اندر جا کر، ایک بڑا سا رجسٹر اُٹھا لایا، اور اسلامی نام سنا سنا کر، پوچھنے لگا کہ آپ کا یہ نام ہے کہ نہیں، کوئی آٹھویں یا نویں رجسٹر کو دیکھ کر اس نے پوچھا کیا آپ کا نام "اَبُو جفرا" ہے؟ میں سمجھ گیا کہ یہ "ابو جعفر" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ اور جب میں نے کہا جی ہاں یہی میرا نام ہے، تو اُس نے میرے لڑکپن سے لے کر اُس وقت تک کے تمام حالات بیان کر دیے، میرے باپ دادا، میری ماں، میری بیوی، میرے بیٹوں، اور میری بہوؤں تک کے نام بتا دیے، ایک بہو کے بارے میں کہا اُس کا رنگ سانولا ہے، مگر وہ مرگ لوچنی (آہو چشم) ہے، اور اس امر سے بھی آگاہ کر دیا کہ آگے چل کر، آپ کو ایک زبردست حادثہ پیش آئے گا، جو بے حد سخت ہوگا، مگر آپ کی جان بچ جائے گی۔ اگر اس واقعے کو صحیح مان لیا جائے، تو پھر یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ:

۱۔۔۔اس عالم کون و فساد میں، ازل سے لے کر ابد تک، جس قدر بھی واقعات ہوتے ہیں، وہ، بہت پہلے سے، ایک امر طے شدہ کے مانند ہیں۔ یا دینی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ جو کچھ حکم قضاء و قدر، یا فرمانِ مشیت ہے، اس عالم کے تمام تغیرات، حالات، اور اعمال اس

کے مطابق رونما ہوا کرتے ہیں۔

۲ــــ ہم اپنے افکار گفتار اور کردار کے قطعی ذمہ دار نہیں،

۳ــــ اور نہ ہم کسی جزا کے مستحق ہیں نہ سزا کے۔ یعنی:۔ آں چہ استادِ ازل گفت ہم آں می گویم۔

بہر حال یہ موقع ان اُمور پر بحث کرنے کا نہیں، میں قارئین پر اُس کا فیصلہ چھوڑ کر، اپنے دوست ابو جعفر کے ایک ایسے وصف کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکے گی ــــــ اُن کی محبوب بیگم کے انتقال پر دس بارہ برس کی مدت گزر چکی ہے، مگر اُن کی رحلت کا غم آج بھی اُن کے دل میں، روزِ اوّل کی طرح تازہ ہے، اور وہ مرحومہ کے ذکر پر آج بھی اس طرح، بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں گویا اُن کی بیوی کی لاش، ابھی گھر سے اُٹھی نہیں ہے، انھوں نے پندرہ بیس ہزار سے اُن کا بڑا خوب صورت مقبرہ بنوایا ہے، آندھی ہو یا پانی، گرمی ہو یا سردی، وہ ہر روز مقبرے جاتے، قرآن پڑھتے اور آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ اللہ ری وفاداری۔ ☆

سوختن، بر شمعِ مُردہ، کارِ ہر پروانہ نیست!

☆ ــــ میرزا ابو جعفر کشفی صاحب کا ۱۹۷۳ء میں کراچی میں انتقال ہوا، اس وقت جوش صاحب اسلام آباد میں رہ رہے تھے۔ وفات کی اطلاع انھیں راغب مرادآبادی نے دی۔ جوش صاحب ۵ راگست ۱۹۷۳ء کے خط میں راغب صاحب کو لکھتے ہیں ــــ "ہائے میرزا ابو جعفر دغا دے گئے اُن کی موت سے جو دلی قلق ہوا ہے بیان نہیں کر سکتا۔ اب ایسے آدمی پیدا نہیں ہوں گے، کس کس کو روؤں ہمارے مختصر سے حلقۂ ملاعنہ کو سونا کر گئے۔ ابوالحسن بلگرامی، زیبا، رُشدی، قیصر اور حکیم ندیم...... ایک رہ گئے تھے ابو جعفر صاحب سو وہ بھی سدھار گئے۔ سوچتا ہوں آخر اس بدبخت زمین کو پکڑے کب تک بیٹھا رہوں گا۔ میں نامراد مرنے کا نام ہی نہیں لیتا میاں راغب دعا کرو میری موت کی ــــ" (خطوطِ جوش ملیح آبادی، ۱۹۹۳ء، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ص: ۸۸)

میر عترت حسین، عرف ''میر صاحب''

مضافاتِ میرٹھ کے سادات میں سے ہیں، اب، ایک مدت دراز سے، لاہور میں رہتے ہیں۔ اور آدھا شہر میر صاحب کا کلمہ پڑھتا ہے، کلمہ کیوں نہ پڑھے، وہ اس قدر صاحبِ مہر و محبت ہیں کہ پل بھر میں دلوں کو موہ لیتے، اور پلک جھپکاتے،، دوستوں کی عقدہ کشائی کر دیتے ہیں۔

حالاں کہ وہ پڑھے لکھے آدمی نہیں، لیکن ادب کا بے حد ذوق رکھتے ہیں، میں جب لاہور جاتا ہوں، وہ اپنے گھر مجھ کو ٹھہراتے، اور کہیں اور ٹھہروں تو وہ اپنا بوریا بستر وہیں لے آتے، اور جب تک میں قیام کرتا ہوں، میرے ساتھ، سائے کی طرح رہتے ہیں۔☆

اور حُسن پرستی کا یہ عالم ہے کہ پیری اور ضیق النفس کے باوجود، وہ اپنے ساتھ، کوئی نہ کوئی لُسر کا ضرور لگائے رکھتے ہیں:

دل سے، شوقِ رُخِ نکو، نہ گیا۔

❁

☆____ میر عترت حسین، مغربی یوپی کے ضلع مظفر نگر کے ایک قصبے کے رہنے والے تھے۔ تقسیم کے بعد انہوں نے لاہور کو اپنا مرکز بنایا کرشن نگر میں ارجن روڈ پر جسے اب حیدر روڈ کہتے ہیں، اُن کی دکان تھی۔ پان، سگریٹ، اسٹیشنری اور کینٹین کا کاروبار بھی اس دکان سے وابستہ تھا۔ پاکستان کے معروف ادباء و شعراء خصوصاً جگر مراد آبادی اور جوش صاحب سے اُن کا بہت گہرا قلبی رشتہ رہا ہے۔ میر عترت حسین کے ہم وطن، ماہر تعلیم اور معروف اسکالر ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اُن کے نام جوش صاحب کے غیر مطبوعہ خطوط ترتیب دے کر اُن کی وفات کے دو برس بعد ۱۹۷۶ء میں 'نقشِ اخلاص' کے نام سے سنگ میل پبلیکیشنز لاہور سے شائع کیے تھے اس میں میر صاحب کے تعارف میں جوش صاحب کی اک تحریر بھی شامل تھی۔ اب یہ کتاب تلاشِ بسیار کے بعد بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ میر صاحب کے نام جوش صاحب کے ۵۶ نایاب خطوط راقم السطور نے اپنے جریدے 'جوش شناسی' کے پانچویں شمارے (اگست ۲۰۰۹ء) میں شائع کر دیے تھے۔

میر، علی احمد خاں، تال پور

لانبے تڑنگے، گورے چٹے، بلند پیشانی، شیریں لہجہ، سخن شناس، وسیع المطالعہ انسان اور سندھ کے بڑے جاگیر دار، اور شاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اُن کا کتب خانہ بڑا شان دار ہے، انھوں نے کھوکلے روسا کے مانند، شان دکھانے کی خاطر، فرنیچر کی طرح کتابوں کا انبار نہیں لگایا ہے، بلکہ انھوں نے ایک ایک کتاب کو پڑھا، اور سمجھ کر پڑھا ہے، اور جو کچھ پڑھا ہے، اُسے ہضم بھی کر لیا ہے۔ تمام اکابرِ عالم کے مانند وہ بھی قیامت کے حُسن پرست اور حُسن خواری کی حد تک، حسن پرست ہیں۔

مبارک باد، لطفِ نو، بجُر کاں۔

صدہا اوصاف کے ساتھ ساتھ، اُن میں ایک ایسا عجیب وصف بھی ہے، جو کروروں انسانوں میں، کسی ایک خوش بخت کو ملا کرتا ہے اور وہ ہے اُن کا بے مثال حافظہ۔ ہر چند، اردو ان کی مادری زبان نہیں، لیکن وَلی سے لے کر، آج کی تاریخ تک کے تمام اردو شعراء پر ان کو اس قدر عبور حاصل ہے کہ بڑے بڑے اہلِ زبان اُن کا منھ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اور سونے پر سہاگا کہ فارسی و اردو کے جس قدر بھی دواوین ان کی نظر سے اب تک گزر چکے ہیں، انھوں نے ان کا عطر کھینچ کر، اپنے دماغ کے رطلِ گراں میں بھر لیا ہے۔ ہزاروں بار انھوں نے مجھے اپنے انتخاب کردہ اشعار سنائے، لیکن ایک بار بھی میں نے اُن کی زبان سے درجۂ دوئم کا شعر نہیں سنا۔

وہ ہم عُصر اور بُجھے شعر کہنے والوں کے کلام میں سے بھی دو ایک اچھے شعر، اس طرح چھانٹ لیتے ہیں، جیسے مٹی کو چھان کر نیارئیے، سونے چاندی کے ٹکڑے نکال لیا کرتے ہیں۔

❁

ہاشم رضا☆

اقتدار کا نشہ، بہت ہی تیز ہوتا ہے، اور، پلک جھپکاتے ہی، چڑھ جایا کرتا ہے۔ یہ تماشہ میری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ جب ہندوستان آزاد ہوا تھا، اور، ہندوستانی راہ نماؤں کو، بڑے بڑے عہدوں کی کرسیاں ملی تھیں، اس وقت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، اور سروجنی نائیڈو کے علاوہ، تمام نیتاؤں کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں، اور وہ تمام لوگ جو، کل تک انکسار کے پتلے تھے، غرور کا ٹھرّا پی کر اول فول بکنے لگے تھے۔ اور ابوالعلا معرّی کے اس قول کی زد میں آ گئے تھے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ شر انگیز فرماں رواں وہ ہے جو رعایا کو اپنے روبرو جھکنے پر مجبور کر دے لیکن اپنے دوست سید ہاشم رضا کے باب میں یہ میرا دعویٰ ہے اور اس دعوے کی شہادت، پاکستان کے تمام ارباب نظر کو میں پیش کرتا ہوں۔ سید صاحب، گورنری کے عہدے تک پہنچ جانے کے باوجود، حاکمانہ تکبر سے کوسوں دور رہے، اور، اقتدار کا پورا میکدہ پی چکنے کے باوجود نہ اُن کی آنکھیں ہی چڑھیں اور نہ قدم ہی ڈگمگانے پائے۔

اور ان پر نشہ چڑھتا بھی تو کیوں کر، انہوں نے اپنے آباء اجداد سے جو، غیر معمولی شرافت، وراثت میں پائی ہے وہ اُس امر قبیح کی اجازت ہی کب دے سکتی تھی کہ اُن کا انکسار، استکبار میں متبدل ہو جانے کی دنائت، اختیار کر سکے۔ شرافت کے دوش بدوش ان کی یہ بھی بڑی جواں بختی ہے کہ، اُن میں ادبیت و شعریت کا جوہر بھی، کوٹ کوٹ کر، بھرا ہوا ہے اور یہی وہ جوہرِ اعلیٰ ہے، جس نے، ان کی انسانیت کے خدوخال میں، ایک ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ جب اُن کے شگفتہ چہرے کی جانب نگاہ اُٹھاتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں، انسانی پیکر میں،

☆: ___ قلمی نسخے کے صفحہ نمبر ۳۱۲ پر ہاشم رضا صاحب کا صرف نام لکھا ہے اس کے بعد ۳۲۰ تک صفحات خالی ہیں۔ یقیناً جوش صاحب ان پر ہاشم رضا صاحب کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے۔ جوش صاحب کے انتقال کے چار ماہ بعد جولائی ۱۹۸۲ء میں صہبا لکھنوی نے اپنے رسالے افکار کا بیادِ جوش نمبر شائع کیا تھا جس میں انہوں نے ایک حصہ جوش صاحب کی نادر و نایاب تحریروں کے لیے بھی وقف کیا تھا۔ یہ تحریریں جوش صاحب کے عکسِ تحریر میں تھیں، انھی میں سید ہاشم رضا کے بارے میں یہ تحریر اور اُن کے متعلق جوش صاحب کے کچھ اشعار بھی تھے یہ قلمی تحریریں صہبا صاحب کو راغب صاحب نے دی تھیں۔ راغب صاحب نے مجھے بتایا کہ ہاشم رضا کے بارے میں یہ دو ہی تحریریں ہیں جو جوش صاحب نے یادوں کی برات کے لیے لکھی تھیں۔

تاج محل دیکھ رہا ہوں اور وہ بھی شب ماہ میں۔ سید صاحب! اس بحرانی صدی کے ایک ایسے مستثنیٰ فرد ہیں کہ میں ان سے ملنے کو ذہنی عبادت اور تصوری حج اکبر خیال کرتا ہوں۔
اب وہ برسر اقتدار نہیں ہیں، اس صورتِ حال میں آ کر، آدمی اتراشخہ بن کر رہ جاتا ہے لیکن اس امر کا اُن کی محبوب ذات پر، ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑا ہے اور آج بھی ان کی شرافت کے در پر، سر ہی نہیں، دل جھک رہے ہیں اور میں ان کو پیش کر کے بلا خوفِ ابطال یہ کہہ سکتا ہوں:

انسیت کہ دل بُردہ خوں کردہ بسے را
بسم اللہ، اگر تابِ نظر ہست کسے را

مرحوم جوش، ۶۸/۸/۲، علی الصبح ☆

☆ اس تحریر کے کم و بیش چار ماہ بعد جوش صاحب نے سید ہاشم رضا کے لیے کچھ اشعار بھی کہے تھے یہ منظوم اظہار ہاشم رضا کا قصیدہ نہیں ہے بلکہ سلطانِ کج نہاد اور افسرِ باطل کے مقابل صولتِ اہلِ وفا اور اربابِ انکسار کی عظمتِ کردار کا بیان ہے:

کیا دیکھتا ہے، دبدبۂ لشکرِ جفا — اے کم سواد، صولتِ اہلِ وفا کو دیکھ
کیا دیکھتا ہے، جاہِ سلطانِ کج نہاد — جو فرش پر ہے عرش نشیں، اُس گدا کو دیکھ
چترِ دعلم کی حشمتِ یک روزہ کے مرید — اہلِ قلم کے طنطنۂ دیرپا کو دیکھ
اہلِ غرور، بت ہیں سوکل ٹوٹ جائیں گے — اربابِ انکسار کی شانِ بقا کو دیکھ
کیا دیکھتا ہے، افسرِ باطل کی آب و تاب — جو کوئے حق میں ثبت ہے اُس نقشِ پا کو دیکھ
اے روئے اقتدار کے نظارگیٔ خام — پیشانیٔ ائمۂ صدق و صفا کو دیکھ
منہ پھیر کر عبائے فقیہانِ شہر سے — خوبانِ گل عذار کی رنگیں قبا کو دیکھ
کمزور ہے، بنائے توانائیٔ شہاں — آ، زورِ فقر و طاقتِ خیبر کشا کو دیکھ
بس ایک شب ہے، روشنیٔ بولہب کی عمر — ناداں، فروغِ مشعلۂ مصطفےٰ کو دیکھ
باطل کے اقتدار کا کھل جائے گا بھرم — فوجِ یزید و حوصلۂ کربلا کو دیکھ
آ ظلمتِ حیات میں، جویائے مہر و ماہ — تابندگیٔ چہرۂ ہاشم رضا کو دیکھ

جوش مرحوم ۶۸/۱۲/۱۵

باب پنجم

میرے دور کی چند عجیب ہستیاں

1967 Thursday 3 AUGUST

Rabi-ul-Sani 1387 18 Srabon 1374 19 Sawan 2024
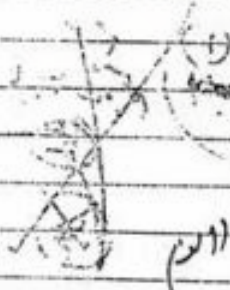
18 Srabon 1374

___ قلمی نسخے کے صفحہ ۱۳۲۱ سے باب پنجم کا جو آغاز ہوا ہے وہ "میرے دور کی چند عجیب ہستیاں" سے مخصوص ہے اس میں ۱۲۲ افراد کے نام جوش صاحب نے ایک فہرست کی صورت میں صفحہ ۱۳۲۲ پر لکھے ہیں جبکہ یادوں کی برات (مطبوعہ) میں ۱۹ افراد کا تذکرہ ہے۔ جن ۱۲۲ افراد کی فہرست قائم کی گئی ہے انہیں الف اور ب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دونوں میں گیارہ گیارہ نام ہیں۔ جوش صاحب کی ترتیب کے مطابق وہ نام یہ ہیں:

الف ___ میر سخاوت حسین، ناظم الدین حسن بیرسٹر، علی گڑھ کے ایک گم نام پٹھان شاعر، نبی شیر خاں، محمد شیر خاں، گنجو خاں، امیر احمد خاں، ہدایت اللہ خاں، مجبوب شاہ، الو ریو، مشیر احمد خاں

ب ___ مولوی احمد حسین، بتان الدین خاں، مصطفےٰ علی خاں، زاہد علی خاں، میر بارق لکھنوی، منشی واحد علی ابر قدوائی، حکیم دانش لکھنوی، عبدالرؤف خاں، نواب رستم علی خاں سپہر، ظہور احمد خاں، چھدو خاں،

بتان الدین خاں[1]

کنول ہار، محلہ ملیح آباد کے باشندے، ہماری ڈیوڑھی کے، سب سے زیادہ قابلِ قدر سپاہی، اور میرے باپ کے نہایت معتبر جاں نثاروں میں سے تھے ___ عرف اُن کا تھا "بتانو خاں"۔
اپنے باپ کے انتقال کے بعد میں نے، اپنی پھپھی زاد بہن کے فرزند، اور اپنے ضلع دار خواجہ حسن خاں شاد ملیح آبادی سے ایک روز جب بتانو خاں کی تعریف کی تو انہوں نے کہا میں اُن کی وفاداری کا قائل نہیں، میں نے کہا مجھے تو اُن کی وفاداری میں، ذرہ برابر بھی شک نہیں، تمہیں شک ہے تو ابھی میرے ساتھ اُن کے گھر چلو، اور میں تم پر ثابت کردوں گا کہ وہ کس قدر وفادار ہیں۔
کوئی گیارہ بجے رات کو میں نے، کنول ہار جا کر، اُن کا دروازہ کھٹکھٹایا، شدید جاڑے کا زمانہ تھا، اندر سے کوئی آواز نہیں آئی، میں نے خواجہ حسن سے کہا تم کھٹکھٹاؤ، انہوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے آواز آئی "کون ہے" خواجہ حسن نے میرا نام بتایا، اُن کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "ارے" اور وہ ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے باہر آگئے، اور بڑی سراسیمگی کے ساتھ پوچھا منجھلے بھیا اس آدھی رات کے وقت کیسے آنا ہوا، خیر تو ہے؟ میں نے کہا بتانو خاں، ایک بہت بڑا حادثہ ہوگیا ہے۔ آپ میرے خدمت گار "جگنو"[2] کو تو جانتے ہیں؟ انہوں نے کہا خوب جانتا ہوں، خدا کے لیے جلدی کہئے بات کیا ہوئی، میں نے کہا، میں نے غصے میں آکر اُس کو، زور سے تھپڑ مار دیا، تھپڑ کھاتے ہی وہ گر پڑا، اور دم توڑ دیا۔ انہوں نے کہا کوئی پروا نہیں، آپ نے نہیں، جگنو کو بتانو خاں نے تھپڑ مارا تھا۔ آپ اس وقت موٹر سے لکھنؤ چلے جائیں، میں تھانے جا کر ابھی رپورٹ لکھا دوں گا کہ منجھلے بھیا لکھنؤ گئے ہوئے ہیں، مجھ کو گھر کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے تھے، جگنو نے مجھ سے بدتمیزی کی، میں نے اُس کو "تھپڑ" مار دیا ___ خدا کے لیے آپ اسی وقت لکھنؤ چلے جائیں۔
میں نے کہا بتانو خاں آپ سوچ لیں، انہوں نے جواب دیا۔ منجھلے بھیا ایسے موقعوں پر سوچتے وہ ہیں جو نمک حرام ہوتے ہیں، اور جن کے نطفے میں فرق ہوتا ہے ___ اُن کی سرفروشی دیکھ کر خواجہ حسن کھسیانے ہوگئے، اور جب بتانو خاں کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کی وفاداری کا امتحان لیا جارہا تھا، تو وہ سر پکڑ کر رونے لگے، اور کہا خان صاحب بہادر زندہ ہوتے تو میرا امتحان نہ لیتے۔

---

[1] ___ یہ نام عجیب ہے ___ [2]: جگنو اب درویش بن کر "جگن میاں بابا" بن چکا اور لکھنؤ میں گنڈے تعویذ کر رہا ہے مگر گرو گُرو ہی رہے، اور چیلے شکر بن گئے۔

عبدالرؤف خاں

میرے قرابت داروں میں سے تھے، منہ پر گھنی داڑھی تھی اور، بالوں پر سفیدی آ چکی تھی۔ لیکن بچوں سے بھی زیادہ بھولے آدمی تھے۔

اُن کے بیٹے یا پوتے کی شادی کا جب وقت آیا تو انہوں نے کہا اس شادی میں رنڈی ضرور ناچے گی، لوگوں نے کہا آپ اس قدر نماز روزے کے پابند ہیں، اور اپنے گھر میں رنڈی نچوائیں گے؟___ انہوں نے جواب دیا خاں صاحب غمی اور شادی میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ میں پرسوں ایک شرعی شادی میں شریک ہوا تھا، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی کے چالیسویں میں بیٹھا ہوا ہوں۔

اور جب تک اُن کے احاطے میں ناچ ہوتا رہا وہ اپنے مکان کے سامنے مسجد میں برابر نماز پڑھتے اور توبہ کرتے رہے۔

اُن کے بیٹے عبدالغفور خاں کو مُسدسِ حالی پڑھنے اور کبوتر پالنے کا شوق تھا___ ایک روز آدھی رات کے وقت اُن کے گھر چور آ گیا: وہ لٹھ سنبھال کر، باہر نکل آئے، اور جب یہ دیکھا کہ چور کبوتروں کی کھتیا سے نکل کر، بھاگ رہا ہے تو انہوں نے پکار کر کہا ارے بھائی یہ تو بتاتے جاؤ کہ کون کون سے کبوتروں کے جوڑے لیے جا رہے ہو، لقے ہیں، شیرازی ہیں، گولے ہیں، گرہ باز ہیں یا چتکبرے۔ اور بھاگتے چور نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو انہوں نے پھر، ڈپٹ کر کہا اماں کیسے آدمی ہو، کچھ بتاتے ہی نہیں، صبح جب عبدالغفور پوچھے گا کہ کون کون سے کبوتر چوری ہوئے ہیں تو میں اُس کو کیا جواب دوں گا___ چور نے اُن کے بھولے پن پر قہقہہ مارا، اور تو دو گیارہ ہو گیا۔..........

ظہور احمد خاں

ڈبلے پتلے، فرنچ کٹ، ملیح آباد کے باشندے، فرنگی محل لکھنؤ کے فارغ التحصیل طالب علم، نہایت دلچسپ، بے حد مسوڑ اور، پولیس و نظام دکن کے نام سے کانپنے والے، پرلے درجے کے سنکی آدمی تھے۔
انہوں نے، دنیا بھر سے نرالی، ایک اصطلاح ''سائنس لگا دینا'' ایجاد کی تھی، جس کے معنی یہ تھے کہ جادو کے ذریعے سے وہ جس کو چاہتے تھے، ویسا ہی بنا دیتے تھے۔
ایک روز، بہت سویرے، وہ فرنگی محل کے ایک متقدر عالم کی خدمت حاضر ہوئے، اور ہات جوڑ کر کہا، مولانا میں آپ کا شاگرد ہوں، شاگرد، بیٹے کے برابر ہوتا ہے، اجازت دیجئے کہ میں آپ کے ہات پاؤں دبا دوں۔
استاد نے اجازت دے دی، اُنہوں نے اُن کا سیدھا ہات دبانا شروع کر دیا، اور جب سیدھا ہات دباتے دباتے دیر ہو گئی تو استاد نے کہا کیا ایک ہی ہات کو دن بھر دباتے رہو گے، انہوں نے کہا قبلہ سارا زور تو اسی ہات پر ہے، اس بناء پر اسے دبا رہا ہوں، استاد نے پوچھا یہ ''سارا زور'' کیسا؟ انہوں نے ہات جوڑ کر کہا میں نے کل رات کو آپ پر طبلے کی سائنس لگا دی تھی، آپ رات بھر طبلہ بجاتے رہے ہیں، اس لیے چوں کہ سیدھے ہاتھ پر مسلسل زور پڑا ہے، اس لیے اسی کو دبا رہا ہوں۔
مولانا نے، ڈانٹ کر کہا، دور ہو جاؤ میری نظروں سے بدتمیز، اور وہ اپنی، فرنچ داڑھی کھجاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک بار وہ حیدر آباد میں مولوی غیاث الدین صاحب کے وہاں، بطور میہمان ٹھہرے ہوئے تھے شام کا وقت تھا، میں غیاث الدین صاحب کے وہاں پہنچا، دیکھا کہ وہ ان کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہیں، میرے پہنچتے ہی انہوں نے منہ پر ہات رکھ رکھ، ہنسنا شروع کر دیا، مولوی غیاث الدین نے پوچھا خاں صاحب یہ کس بات پر آپ بار بار ہنس رہے ہیں، انہوں نے کہا مولوی صاحب، میں آپ پر لونڈے کی سائنس لگا چکا ہوں، اور آپ کو جوش صاحب کے سپرد کر دیا ہے۔
میں یہ بات سُن کر ہنسنے لگا تو مولوی صاحب نے مجھ سے کہا جوش صاحب، ہنسیے نہیں، ظہور احمد خاں زبردست سنکی آدمی ہیں، گلی گلی یہ اس بات کو کہتے پھریں گے۔ اور پھر انہوں نے، بڑی خوف آمیز سنجیدگی کے ساتھ کہا، ظہور احمد خاں، میں قرآن اُٹھا کر اس بات کی قسم کھاتا ہوں کہ میں اس قبیل کا آدمی نہیں، آپ ایک میرے سے

تقریباً اسّی برس کے بوڑھے پر یہ الزام لگا رہے ہیں، انہوں نے منہ پر ہات رکھ کر ہنستے ہوئے کہا، مولوی صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کہیں میری لگائی ہوئی سائنس بھی غلط ہو سکتی ہے، اور، مولوی صاحب، غصے میں بھرے زنانے میں چلے گئے، اور وہ قہقہے مار مار کر کہتے رہے، وہ بھاگ کھڑا ہوا لونڈا۔ اب کیا کریں گے جوش صاحب۔

اُن کا قاعدہ تھا کہ جب کسی سے ناخوش ہو جاتے، تو، چلا چلا کر، کہتے تھے کیوں بے، لگا دوں ٹٹی کی سائنس؟ گلی گلی تھر کتا پھرے گا۔

ایک مرتبہ پولیس نے ملیح آباد پر حملہ کیا، وہ اُس وقت مُراد چلے گئے، اور پھر وہاں سے کبھی نہیں پلٹے، اور جب تک جیے، یہی کہتے رہے، ملیح آباد رہنے کے قابل نہیں رہا ہے، وہاں میں پولیس کی سائنس لگا چکا ہوں۔ ☆

☆ـــــ یادوں کی برات میں 'میرے دور کی چند عجیب ہستیاں' والے باب پر، تجزیہ نگاروں نے، جوش صاحب کو زد پر رکھ کے بڑی تیغ بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جوش صاحب نے ان عجیب ہستیوں سے جو واقعات منسوب کیے ہیں وہ سب من گھڑت ہیں۔ ایسے میں طویل مباحث سے گریز کرتے ہوئے صرف رشید حسن خاں، جو جوش صاحب کے طرفداروں میں نہیں ہیں، کے مضمون سے صرف ایک اقتباس نقل کرنا ضروری ہے، جس کے بعد پھر کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اقتباس یہ ہے:

'ـــــ اس کتاب میں ملیح آباد کے پٹھانوں کی جو چہرہ نگاری کی گئی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ بہت جاندار اور شاندار مرقعے ہیں۔ آج تو بہت سے پڑھنے والوں کو اکثر واقعات، افسانہ معلوم ہوں گے لیکن جن لوگوں نے پٹھانوں کی پرانی بستیوں کو گئے گزرے زمانے میں یعنی ۱۹۴۷ء سے ذرا پہلے بھی دیکھا ہے وہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ یہ سب واقعات ہو سکتے ہیں اور یہ سب حقیقی شخصیتیں ہیں۔ ایسا ہی ہوتا تھا اور ان بستیوں میں ایسے ہی لوگ رہتے تھے ـــــ' (جوش بحیثیت انشاء پرداز، مشمولہ، جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتب: ڈاکٹر قمر رئیس، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص: ۳۰۱)

بابِ ششم

میرا خاندان☆

میرے ماں باپ، بھائی بہنیں، بیوی بچے، چچا، دادا، پردادا

☆___اس موضوع کی نسبت سے یہاں ۳ باتیں قابلِ ذکر ہیں

۱.....ایک تو یہ کہ جوش صاحب نے اپنے قریبی خاندانی رشتوں کے بارے میں جس ترتیب سے قلمی نسخے میں لکھا ہے وہ ترتیب یادوں کی برات میں یکسر بدلی ہوئی ہے۔ مطبوعہ خودنوشت میں ان رشتوں کی ترتیب یہ ہے۔ میرے پردادا، دادا، باپ، ماں، چچا، بیوی، بیٹی، بیٹا۔

۲.....دوسرے یہ کہ قلمی نسخے میں جوش صاحب نے اپنے دو بھائیوں اور چار بہنوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو یادوں کی برات میں نہیں ہے۔

۳.....تیسری بات یہ کہ اپنے دادا، ماں، بیوی اور اولاد کے بارے میں اُن کے دو دو مختلف مسودے قلمی نسخے میں موجود ہیں اس سے پہلے کہ مسودے انہوں نے شاید پھاڑ دیے۔ جن کو ضائع کر دینا تھا انہیں ضائع کر دیا، جن کو قلم زد کیا انہیں ردوبدل کے بعد از سرِ نو لکھنا تھا، جس کا وقت کی کمی نے انہیں موقع نہیں دیا۔ دادا سے متعلق دونوں مسودے کم و بیش یکساں ہیں البتہ ماں، بیوی اور اولاد کے تذکروں پر مشتمل مسودوں میں سے ایک سے یادوں کی برات کے لیے کتابت ہوئی دوسرے مسودے کے نادر صفحات ہم نے اپنی اس کتاب میں محفوظ کر دیے ہیں۔

میری ماں

نواب خواجہ محمد خاں، جاگیردار دھول پور کی بیٹی تھیں۔ اُن کی والدہ کا اُن کی کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا، سوتیلی ماں، حاتم زمانی بیگم نے، اُن کو، بڑی محبت سے پالا پوسا، اور اس قدر دھوم دھام سے اُن کی شادی کی تھی کہ آگرے کے بڑے بوڑھوں کو اب تک یاد ہے ___ بے شمار جہیز کے ساتھ ساتھ، جو آٹھ مال گاڑی کے ڈبوں میں بھر کر آیا تھا۔ دو مغلانیاں، ایک غلام، دو اونٹ اور ایک ہاتی بھی، بطور جہیز دیا تھا۔
نانا پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، لیکن یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اُنہیں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال تھا، انہوں نے لکھنؤ کے مولوی اور اُستانی سے میرے ماموں اور میری ماں کو تعلیم دلائی تھی، اور گھر کی ماما ئیں، اصیلیں، اور مغلانیاں بھی لکھنؤ کی شیعہ تھیں جس کا یہ اثر ہوا کہ ماموں تو پورے شیعہ ہو گئے، میری ماں "تسنیت وشیعیت" کے بین بین ہو کر رہ گئیں۔ اصحاب ثلاثہ کو مانتی رہیں، لیکن آلِ رسول کی محبت میں بے حد غلو ہو گیا، اور محرم میں، بڑی پابندی کے ساتھ عزاداری کرنے لگیں۔
وہ سب بچوں سے زیادہ مجھے چاہتی تھیں، اور، شاید مجھ سے بھی زیادہ، اُن کو اپنے باپ اور بھائی سے محبت تھی۔
ہر چند وہ موزوں طبع نہیں تھیں، مگر شاعری، اور ہندی گیتوں کا اُنہیں بے حد شوق تھا۔
امورِ خانہ داری میں وہ بالکل کوری تھیں، اسی لیے میرے باپ نے خانہ داری کا تمام کاروبار اپنی ماں کے سپرد کر دیا تھا، اور گھر کے اندر میری ماں کی نہیں، میری دادی [۱] کی حکومت تھی۔

---

[۱] ___ میری دادی بے حد پختہ شیعہ تھیں، انہوں نے ہمارے گھر امام باڑہ تعمیر کرایا تھا ___ وہ میرزا خادم حسین صاحب، رئیس اکبرآباد کی بہن تھیں، ان کے باپ کوتوال تھے، آگرے کے "کوتوال کی ماں" انہیں کے نام سے اب تک مشہور ہیں۔ انتظامی قوت اُن میں اس قدر تھی کہ گھر کیا وہ ایک سلطنت چلا سکتی تھیں ہزاروں اردو فارسی شعر اور بے شمار کہاوتیں ان کو یاد تھیں۔ اُن کو صحتِ زبان اور فروغِ تہذیب کا بھی بہت خیال رہتا تھا، جب ہم کوئی لفظ غلط بولتے تھے، وہ فوراً ٹوک دیا کرتی تھیں، اور جب ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو وہ نوالہ توڑنے اور چبانے کے انداز سکھایا کرتی تھیں۔ اور جب چپکے چپکے وہ مجھ کو شیعیت کا درس دیتی تھیں، تو میری ایک پھپھی جو کٹر سنی تھیں، یہ کہتی تھیں اماں پوتے کو شیعہ نہ بنایئے تو وہ بگڑ کر کہتی تھیں چل چتے مُردار خارجن، گھر میں کوئی تو ایسا ہو کہ میرے مرنے کے بعد اُس کا فاتحہ درود مجھ تک پہنچے۔
اس کے ساتھ ساتھ، وہ بے حد سخی بھی تھیں، اور خصوصیت کے ساتھ، ملیح آباد کی سیدانیوں کو تھیلیاں بھر بھر کر اشرفیاں دیا کرتی تھیں۔

اُن کی دو خاص لکھنوی مُغلانیاں تھیں، ایک کا نام تھا ممو خانم، اور دوسری کا نام عباسی خانم، وہ دونوں اُن کے بھولے پن سے فائدہ اُٹھا کر، اُن سے دو دو تین تین بار، ہر مہینے کی تنخواہ وصول کیا کرتی تھیں، اور جب وہ کہتی تھیں کہ مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ میں تم دونوں کو تنخواہ دے چکی ہوں تو وہ حضرت عباس کی قسمیں کھا کھا کر انکار کرتیں، اور کہتی تھیں کہ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم آپ سے تنخواہ لے کر، دوبارہ مانگیں۔ اور وہ اُلٹی شرمندہ ہو جاتی تھیں، اور چوں کہ اُن کو پیسے گننا نہیں آتا تھا، اس لیے اُن سے پیسے گنواتی تھیں اور وہ آدھی ریزگاری اُڑا لیا کرتی تھیں، اور اُنہیں خبر بھی نہیں ہوتی تھی ___

ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا، جب میں شادی کے بعد یہاں آئی تھی اُس وقت تمہارے باپ تمہارے دادا ہی کے محل میں رہتے تھے، اور جب کبھی شام کو تمہارے دادا اپنے مرے ہوئے بیٹوں کے غم میں اُن کا نام لے لے کر روتے اور چیخیں مارتے تھے تو اُن کی بھاری آواز سے محل کی چھت گونجنے لگتی، میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپتی اور میری مغلانیاں کانوں میں انگلیاں دے کر کہتیں، نواب صاحب نے آپ کو کن ڈاکوؤں کے گھر بیاہ دیا ہے،، بی بی، بڑے خان صاحب کی آوازوں سے تو ہمارا کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔ جب تمہارے دادا کو میرے ڈرنے کی خبر پہنچی تو انہوں نے مجھ کو تمہارے چچا کے گھر منتقل کر دیا، لیکن وہاں میں چین سے نہیں رہی، جب تمہارے چچا، ماماؤں، اصیلوں پر گرجتے تھے تو ڈر کے مارے میرا بُرا حال ہو جاتا تھا۔ اور اسی لیے، تمہارے باپ نے یہ گھر بنوا لیا ___

ابھی ایک ہفتہ ہوا، میں ورزش کر رہا تھا کہ میری بیوی نے پکار کر کہا، ارے کب تک اُچھل کود کرتے رہو گے، تمہارا دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے، میں نے دودھ کا پیالہ ہات میں لیا، ہات کانپنے لگا اور یاد آ گئی یہ بات کہ میری ماں روز صبح کو شہد ملا کر مجھے دودھ کا ایک پیالہ پلایا کرتی تھیں میری ہچکیاں بندھ گئیں، اور دودھ کا پیالہ ہات سے چھوٹ گیا۔

اس کون و فساد کا یہ کیا نظام ہے کہ ہر دل پر ماں باپ کے مرنے کا چرکا لگایا جاتا ہے ___ لوگ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے لیکن یہ کیسا مرہم ہے کہ میرے دل میں آج تک ماں باپ کے مرنے کا گھاؤ موجود ہے، اور جب اُن کی یاد آتی ہے تو ہر بن مو سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے، اور اس پیرانہ سالی کے باوجود، میں بچوں کی طرح، بلک بلک کر، رونے لگتا ہوں۔

❁

میرے بڑے بھائی

نام تھا شفیع احمد خاں اور تخلص تھا وؔلی۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں، اور مجھ ناچیز پر نامہرباں تھے ___ باپ کی زندگی میں وہ کوشش کرتے رہے کہ وہ اُن کو اپنا تنہا جانشین مقرر فرما کر، تمام جائے داد اُن کو دے دیں، اور ہم دونوں بھائیوں کو فقط گزارہ دار بنادیں۔ اور باپ کے بعد، انہوں نے میری سعادت مندی سے فائدہ اُٹھا کر، مجھے بہت نقصان پہنچایا، اور ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ لیکن اس میں اُن بیچارے کا کوئی قصور نہیں تھا، یہ تعلقہ داری اور جاگیرداری کی لعنت تھی کہ ہمارے خاندان کا ہر خلفِ اکبر یہ چاہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اُس کے سوا اور کسی بھائی کو کچھ نہ ملے، اور تمام بھائی اُس کے گزارہ دار ہو کر رہ جائیں۔
اس کے باوجود، جب اُن پر محبت کا دورہ پڑتا تھا تو وہ، ہمارے ساتھ اپنے بُرے برتاؤ پر آنسو بہایا کرتے تھے۔
اور جب میں حیدرآباد دکن چلا گیا تو انہوں نے، بڑے دردِ دل کے ساتھ، مجھے خط لکھا تھا، اور اُس خط کے ساتھ، میری اُس جائے داد کی ایک فہرست بھی بھیجی تھی، جس پر وہ قابض ہو چکے تھے، اور میرے اُس زرِ امانت کی تعداد بھی درج کی تھی، جو انہوں نے مجھے واپس نہیں کیا تھا ___ اور آخر میں مجھے ہدایت کی تھی کہ میں ملیح آباد آ کر اپنی جائے داد اور اپنا روپیہ اُن سے لے لوں ___ لیکن اُس محبت کے دورے کے ختم ہوتے ہی انہوں نے مجھے دوسرا خط لکھا کہ برائے خدا و رسول میرا خط مجھ کو واپس کر دو ___ اور میں نے اُن کا خط واپس کر دیا۔
افسوس کہ ایک امرِ ناگفتنی کی بناء پر اُن کی آخری زندگی انتہائی کشمکش اور بڑی دردمندی میں گزری، اور جائے داد بھی اُن کے ہات سے نکل گئی، اور اسی بیکسی کے عالم میں، اُن کا انتقال ہو گیا۔
ہائے اے میرے بھائی آپ محلوں میں رہے، اور، عمر کے دورِ آخر میں، آپ لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں اس دنیا سے، ایک دل شکستہ انسان کے مانند رحلت کر گئے، آپ کا خیال آتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

۞

☆ ___ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے بھی یہ لکھا ہے کہ جوش صاحب اور ان کے بھائی رئیس احمد، جائیداد کے معاملات میں اپنے بڑے بھائی شفیع احمد خاں سے مطمئن نہیں تھے (کتاب جوش، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۹۱ء، ص:۵۱)

میرا چھوٹا بھائی

نام ہے رئیس احمد خاں اور تخلص ہے "رئیس"۔ اُس کے پیدا ہونے سے پیش تر ہی مجھے اُس سے محبت پیدا ہو گئی تھی، اور میں کہا کرتا تھا کہ میرا بھائی پیدا ہونے والا ہے، اس کا نام "للّو" ہوگا، اور وہ میرے ساتھ کھیلا کرے گا۔☆ رئیس، بچپن میں بے حد کنجوس تھا، اور اپنے جیب خرچ کو بچا بچا کر، اشرفیوں میں تبدیل

☆___ جوش صاحب نے یادوں کی برات میں، اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد کا یہ تذکرہ جو قلمی نسخے میں موجود ہے شامل نہیں کیا۔ ممکن ہے اُن کے ذہن میں یہ ہو کہ چھوٹے بھائی کا تذکرہ شامل کریں تو پھر لازماً بڑے بھائی کا بھی ذکر کیا جائے۔ تقسیم جائے داد کے تعلق سے اُن کے بڑے بھائی کا رویّہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے اچھا نہیں تھا۔ انہوں نے بڑے بھائی پر لکھا تھا مگر پھر یہ صفحات روک لیے شاید وہ بڑے بھائی کے رویّے اور جائے داد کی طرف اُن کی رغبت کا چرچا نہیں چاہتے تھے جوش صاحب کی مختلف تحریروں سے یہ بات جھلکتی ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بہت چاہتے تھے۔ جوش صاحب کے ابتدائی شعری مجموعوں میں اُن کی بعض کتابوں کے اعلان واشتہار رئیس احمد ہی کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ لیکن ایک الگ عنوان قائم کر کے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد کا تذکرہ یادوں کی برات میں شامل نہیں کیا۔ رئیس احمد کا تذکرہ خودنوشت میں ایک دو مقامات پر آیا ہے۔ اپنی زندگی کی روداد اور بچپن کے قصے بیان کرتے ہوئے انہوں نے یادوں برات ہی میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"___ جب میرا چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا، تو اس کو دیکھتے ہی، میرے دل میں اس کی بہت محبت پیدا ہو گئی تھی اور میں نے اس کا للّو نام رکھ دیا تھا۔ ایک روز میں بڑے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دیکھا، آب رسانی کی نالی کی کیچڑ میں ایک جوتہ دھنسا پڑا ہے، اُسے اپنے مالی 'براتی' سے دھلوا کر، میں نے اپنے مخملی کوٹ کی جیب میں رکھ لیا، براتی نے کہا 'ارے بھیا یو کیا کرت ہو، جیب کھراب ہو جیہے' (ارے بھیا یہ کر رہے ہو، جیب خراب ہو جائے گی) میں نے کہا میں یہ جوتہ اپنے للّو کو پہناؤں گا___ وہ ہنسنے لگا۔

اور، جب اپنی ماں کے زچہ خانے میں پہنچ کر، میں نے وہ جوتہ جیب سے نکالا اور چاہا کہ اُسے للّو کے پاؤں میں پہنا دوں، تو، میری پھپھی زاد بہن اَمّی نے چیخ مار کر کہا "ارے بھائی، غضب خدا کا، یہ مخمل کا کوٹ اور اس کی جیب میں یہ چمڑ ودھا جوتہ اور پھر اُس کو منجھلا اپنے بھائی کے پاؤں میں پہنانا چاہ رہا ہے، یہ سن کر، میری ماں ہنسنے لگیں، ساری عورتوں نے، مجھ کو گھیر لیا، سب نے مجھ پر قہقہے مارے لیکن کسی نے میرے اس دردِ دل کی داد نہیں دی کہ میں اس جوتے کو للّو کے پاؤں میں پہنا نہ سکا" (ص:۵۱)

کیا کرتا تھا۔ لیکن باپ کے انتقال کے بعد اُس کی کایا پلٹ ہوگئی، وہ عبدالوحید خاں، حلیم خاں، ناصر احمد خاں، اور محمد غنی خاں مرحوم کے ساتھ لکھنؤ کے چوک کے چکّر لگانے لگا ____ اور ایک طوائف، بنّن جان پر فریفتہ ہوگیا۔

اب کیا تھا، روپیہ پانی کی طرح بہنے لگا ____ بنّن جان کی ماں کا نام تھا مہدی خانم، اور عرف تھا ''کیا'' مہدی جان بے حد بخیل نہایت طماع اور بڑھاپے میں بھی جوانی کا دم بھرتی تھیں۔ وہ ہر چند بڑی مال دار اور بڑی صاحب جائے داد تھیں کوئی باورچی اُن کے وہاں، اٹھائیس دن سے زیادہ ٹکنے نہیں پاتا تھا۔ اور وہ مہینے کی آخری تاریخوں میں یہ بہانہ کرکے، اُسے ٹرخا دیا کرتی تھیں کہ ناصاحب ہمارے وہاں تمہارا گزارہ نہیں ہوسکتا، تم نے ہمارے برتن اس بے رحمی سے مانجھے ہیں کہ وہ گھس گھس کر دُبلے ہوچکے ہیں۔
اور جب وہ تنخواہ مانگتا تھا تو وہ منہ پیٹ پیٹ کر کہتی تھی، ہے ہے غضب خدا کا، میرے تمام برتن دبلے کردیے اور اُلٹے تنخواہ مانگ رہے ہو۔
اُن کے بخل کے دو واقعات اور بھی سُن لیجئے ____ وہ ہر سال، عزاداری کے واسطے، اپنے کمرے کو چوناتیں اور چھت کی مرمت کرایا کرتی تھیں، اور جب شام کا وقت ہوجاتا تھا تو، مزدوروں سے مزید کام لینے کی خاطر، وہ زینے کا دروازہ اندر سے بند کرکے وہاں چوکی بچھوا کر اُس پر بیٹھ جایا کرتی تھیں، اور مزدور جب اوپر سے آواز دیتے تھے کہ بیگم صاحب شام ہوگئی ہے، زینے کے دروازے کھولیے اور ہم کو جانے دیجئے تو وہ نیچے سے پکار کر کہتی تھیں کہ ہے ہے، تم نے تو میرا پاکخانہ پیشاب تک بند کردیا ہے، اتنا تو ٹھہرو کہ میں فارغ ہوجاؤں، اور جب تک میں فارغ نہ ہوجاؤں، ہات چلاتے اور کام کرتے رہو۔ اللہ بھلا کرے گا، اور امام حسین اس کا اجر دیں گے۔

اور دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اُن کے کمرے پر ایک طوطا بیچنے والا آیا، اُنہوں نے ایک طوطا پسند کرکے اُس کی قیمت پوچھی، اُس نے کہا بارہ آنے، اُنہوں نے کہا اُفوہ بارہ آنے، بارہ آنے نہیں چار آنے لے لو، اور جب اُس نے انکار کردیا، تو اُنہوں نے کہا بھیا میرا نوکر باہر گیا ہوا ہے ذرا میرے لیے دوڑ کر پان تو لا دو، اور لو یہ دو آنے تمہاری محنت کے ہیں، طوطے والا جب پان لینے چلا گیا تو انہوں نے اپنی پسند کا طوطا نکال کر اُسے چھپا دیا۔
طوطے والے نے آکر پان دے دیے اور پنجرا اُٹھا کر چلا گیا ____ اور اُس کے جاتے ہی انہوں نے طوطے کو بھی پڑھانا شروع کردیا ''نبی جی بھیجو......!

آپ نے دیکھ لیا کہ مہدی جان، عرف ''کیا'' کس مزاج کی عورت تھیں، ؟ ____ اب ایک معجزہ بھی سُن لیجئے، رئیس احمد جب اُن کی بیٹی بنّن جان پر بے دریغ روپیہ صرف کرکے غالباً پچاس ساٹھ ہزار کے مقروض ہوگئے تو، جنابِ والا، آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوجائے گی کہ اس قدر بخل کے باوجود، مہدی جان نے اُن کا تمام قرض ادا کردیا۔

قیامت ہے کہ سُن، لیلیٰ کا آنا دشتِ مجنوں میں
کہا، حیرت سے اُس نے، ''یہ بھی ہوتا ہے زمانے میں''؟

اب، ماں کے انتقال کے بعد، جن جان، ملیح آباد چلی آئی ہیں، اور رئیس ہی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ رئیس بے چارہ پریشان رہتا ہے، تنسیخ زمیں داری نے اُس کی کمر توڑ دی ہے، لے دے کر ایک ''بڑا باغ'' رہ گیا ہے، اور اُس کی فصل کی ہزار، ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ کی قلیل آمدنی پر زندگی بسر کر رہا ہے۔

گھوڑے کی سواری، شیر کے شکار، ورزش اور گانے کا اُسے بے حد شوق تھا، اب وہ تمام شوق مرجھا کر رہ گئے ہیں، اور اُداسی اُس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئی ہے ___ ان آنکھوں کی یہی ہے لیکھ، وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ!☆

☆___ جوش صاحب کے پہلے شعری مجموعے 'روحِ ادب' میں رئیس احمد خاں کے لیے 'برادرِ خورد' کے عنوان سے ایک نظم بھی شامل ہے نظم اگرچہ مختصر ہے لیکن دو بندوں کی اس نظم میں جوش صاحب کی محبتوں کا دامن کس قدر کشادہ ہے اس کا اندازہ لگانا قاری کے لیے مشکل نہیں ہوگا:

برادرِ خورد

اے رئیس با وفا اے جوش کی روحِ رواں — اے ضیائے خانۂ دل اے چراغِ خانداں
اے کہ طینت میں تری پنہاں وفا اندیشیاں — اے کہ فطرت میں تری مضمر محبت کے نشاں
فی الحقیقت جوہرِ اجداد کا حامل ہے تو
اقرباء ہیں جس قدر 'اعضا' ہیں، لیکن 'دل ہے تو'

اے کہ تیرا قلب مرکز ہے خلوص و لطف کا — اے کہ تیری ذات ہے سرچشمۂ صدق و صفا
'بھائیوں' میں تو 'محبت کا نہیں ہوتا پتا — سخت حیراں ہوں یہ جوہر تجھ میں کیونکر آ گیا
'بھائی' ہو کر 'ظلم و بے مہری' کی تجھ میں خو نہیں
'قوتِ دل' ہے مرا تو 'قوتِ بازو' نہیں

(روحِ ادب، ۱۹۲۰ء، میتھوڈیسٹ پریس، لکھنؤ، ص: ۵۳)

میری بہنیں ☆

میری چار بہنیں تھیں۔ افسر جہاں بیگم، انیس جہاں بیگم، حشمت جہاں بیگم اور شوکت جہاں بیگم، میری سب سے بڑی بہن افسر جہاں بیگم، اور چھوٹی بہن حشمت جہاں بیگم کا انتقال ہو چکا ہے، شوکت جہاں اور انیس جہاں بیگم، بفضلہ بقید حیات ہیں۔

شوکت جہاں بیگم تقریباً فرفوع القلم ہو چکی ہے، اُس کو اپنے تن بدن ہی کا ہوش باقی نہیں رہا ہے، انیس جہاں بیگم، ایک مدت سے لکھنؤ میں رہتی، اور باپ کے عطا کردہ آموں کے باغ کی فصل پر، بڑی آسائش کے ساتھ، زندگی بسر کر رہی ہے۔ اُن میں شاعری، غیظ وغضب اور محبت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اُس کا دل اس قدر رقیق ہے کہ غم انگیز اشعار پر، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے، اور میری ذات سے تو اُس کو اس قدر محبت ہے کہ جب میں اُس کے سامنے جاتا ہوں، اُس کی آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب میں اُس کے گھر سے رخصت ہونے لگتا ہوں تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے تک آتی اور کہتی ہے کہ آ کا بھائی، ذرا میری طرف مڑ کر دیکھ لو، اور جب میں اُس کی طرف منہ کر لیتا ہوں تو وہ مجھ کو جس قدر نظر جما کر دیکھتی ہے، گویا وہ اپنی نم ناک آنکھوں کے ذریعے سے، اپنے دل پر میرا چہرہ ثبت کر رہی ہے۔ اور مجھے اپنا یہ لڑکپن کا شعر یاد آ جاتا ہے:

صفحۂ دل پہ جو منظور تھا گہرا نقشہ
دیر تک، شکل تمہاری، دمِ رخصت دیکھی

☆ ـــــ جوش صاحب کے بھائیوں اور بہنوں کو اپنے بھائی (جوش صاحب) سے کتنی اور کس سطح کی محبت تھی اس کا اندازہ تو نہیں لگایا جا سکتا لیکن جوش صاحب کی انتہائی حساس طبیعت کو اپنے بھائی، خصوصاً بہنوں سے جو محبت تھی اس کا بھرپور اظہار اُن دو نظموں سے بھی ہوتا ہے جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۳ء میں کہی گئیں دوسری نظم سب سے بڑی بہن کی وفات پر کہی گئی جوان کے شعری مجموعے "نقش ونگار" (۱۹۳۶ء) میں شائع ہو چکی ہیں۔ متصل صفحات پر یہ نظمیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

(گذشتہ صفحے کے فٹ نوٹ سے متصل)

ماں جائے کی یاد

(۱۹۳۰ء)

میں دیس میں، تم وطن سے باہر اے بھائی! بہن نثار تم پر
انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا ساون کی ہے رُت، ہوا ہے پُروا
سائے میں گرجتی بدلیوں کے استادہ ہیں دو شریر بچے
اک موج رواں ہے، اک چمن ہے اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے
کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں کیا جانیے کیوں جھگڑ رہے ہیں
میں دیکھ رہی ہوں، اور چپ ہوں کس جی سے بھلا فساد کاٹوں
اس جنگ کے آئینے کے اندر بچپن ہے ہمارا جلوہ گستر

کرتے تھے شرارتیں، اُدھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی

بہن کی یاد

(۱۹۳۳ء)

کندہ ہے اس ظرفِ شکستہ پہ یارب! کس کا نام؟
آہ، اب اس نام کا مفہوم ہے زیرِ مزار

دل پھٹا جاتا ہے میرا، آہ اے ظرفِ ملول
آ، کہ رکھ لوں دل میں، اے میری بہن کی یادگار

وہ بہن شاداب تھے جس سے روایاتِ قدیم
وہ بہن، تابندہ تھا جس سے اب وجد کا وقار

اسکے حرفوں پر نظر پڑتے ہی اک مدت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہدِ طفلی کی بہار

دائروں میں اس کے، ماضی کو مچلتا دیکھ کر
ہو گیا کچھ اور بھی دُکھتا ہوا دل بے قرار

خون رو، اے میری قبل از وقت پیری! خون رو
اس کے نغموں سے ہے بچپن کا تلاطم آشکار

گھر کی انگنائی میں گویا کھیلتا پھرتا ہوں میں
دل کو رہ رہ کر یہ دھوکا ہو رہا ہے بار بار

نیم میں جھولا پڑا ہے، پک رہی ہیں پوریاں
پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی مست بھادوں کی پھوار

پینگ لے لے کر مزے سے گا رہے ہیں باغ میں
"نیم کی نمکولی پکی، آئی ساون کی بہار"

"میکے لینے آ گیا، جگ جگ جیئے بیرن مرا"
رکھ دے اس طوفان میں نمواتے ڈولی کہار"

صحن میں پانی بھرا ہے، اور پائیں باغ سے
آ رہی ہے بارہ ماسے کی صدا دیوانہ وار

خود بہ خود، سینے میں رہ رہ کر بھرا آتا ہے دل
گو، سمجھ میں کچھ نہیں آتی پپیہے کی پکار

چھوڑ دو، طفلی کے لمحو! مجھ کو تنہا چھوڑ دو
صبر و تمکیں کا ہوا جاتا ہے دامن تار تار

جیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش کو چھتیس سال
ایک دل، اور اتنے ماہ سال کا پُر ہول بار!

داد دے معبود! اس دردِ نہاں کی داد دے
یہ لطیف احساس، یہ طولِ حیاتِ مستعار

زندگی! اُف زندگی!! سینے میں گھبراتا ہے دم.
خالقِ جاں! توڑ دے اس قید خانے کا حصار

جب ستارہ ٹوٹ جاتا ہے، قسم اُس وقت کی
تیر، مرگِ ناگہاں کا تیر، میں تیرے نثار

رحم فرما، زہرِ ہستی اب پیا جاتا نہیں
اب ترے بندے سے اے مولیٰ! جیا جاتا نہیں

۞

میری بیوی۔ اور اُن کے مزاج کا پس منظر

میری بیوی، میرے دادا کے مختلف البطن چھوٹے بھائی نواب محمد نسیم خاں، تعلقہ دار ' ہلامؤ کے فرزند محمد مقیم خاں کی بیٹی ہیں۔

مقیم چچا بڑے خوب صورت، اور نہایت خوش مزاج انسان تھے۔ ہمارے خاندانی روایات کے خلاف، ان کو تجارت اور رئیس ہونے کے باوجود کھانا پکانے کا بھی شوق تھا۔ اور اس فن میں اُنہوں نے اس قدر کمال حاصل کرلیا تھا کہ بڑے بڑے رکاب دار اُن کا لوہا مانتے تھے۔

میری بیوی کی فرشتہ خصلت ماں محمد حسن خاں رام پوری کی بیٹی ہیں۔ محمد حسن خاں، بڑے زمیں دار، اور بلا کے رند آدمی تھے، ان کے باپ کو، رام پور سے بلا کر، میرے پردادا نے کمیدان کے عہدے پر سرفراز کردیا تھا۔ اور محمد حسن خاں کی بیوی معصومہ بیگم، میرے پردادا کی سب سے زیادہ چہیتی اور بے حد غضب ناک صاحب زادی سالمہ بیگم کی بیٹی تھی، اور ان کے مزاج کی نزاکت کی بناء پر، میرے پردادا نے اُن کو "منجھلا محل" دے دیا تھا تاکہ وہ سب سے علیحدہ رہیں۔ سالمہ بیگم کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ دھوبی اُن کے کپڑوں کو ہات نہیں لگا سکتا تھا، اور اُن کے پہنے ہوئے کپڑے، لونڈیوں باندیوں میں تقسیم کردیے جاتے تھے۔ میرے پردادا کے محل سے ہر صبح کو اُن کا ناشتہ، اور ناشتے کے ساتھ، روپوں اور اشرفیوں بھرا تھال آیا کرتا تھا۔ جس کو وہ "کھچڑی کا تھال" کہا کرتی تھیں۔

اُن کے مزاج کی نازکی کا یہ عالم تھا کہ ایک بار خادمہ، ناشتے کے ساتھ "کھچڑی کا تھال" ساتھ لانا بھول گئی تو اُنہوں نے ناشتہ پھینک دیا، اور منہ ڈھانک کر، لیٹ گئیں۔ باپ کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو وہ دو تھال لے کر آئے اور تھال بھول جانے والی خادمہ کو اُن کے روبرو سزا دی، تب جا کر وہ منیں۔

چوں کہ اُن کے دو بچے، سنور میں جاتے رہے تھے، اس لیے اُن کو یقین ہوگیا تھا کہ محل کی ماماؤں، اصیلوں، اور لونڈیوں باندیوں میں کوئی اُٹھیا[1] ضرور ہے، جو آنکھوں آنکھوں میں اُن کے بچوں کا کلیجہ کھا لیتی ہے۔

چناں چہ جب تیسرا بچہ پیدا ہوا تو محل کے دروں پر بڑے بڑے پردے ڈال دیے گئے، اور چند معتبر و مخصوص

ا: اُٹھیا اس عورت کو کہتے ہیں جو جادو ٹونے کے ذریعے اپنی آنکھوں میں اس قدر مُہلک طاقت پیدا کرلیتی ہے کہ بچوں کو، نگاہ کے زور سے مار ڈالتی ہے۔

ماؤں کے علاوہ، ممانعت کردی گئی کہ کوئی زچہ خانے میں قدم نہ رکھے ــــــ بدقسمتی سے ایک لونڈی کے جی میں یہ بات آئی کہ بیگم صاحب کے بچے کو، ایک نظر، دیکھ لوں۔ وہ بدبخت دوسری منزل پر چڑھ گئی، اور اوپر کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ سالمہ بیگم کی اُس پر نظر پڑ گئی، اور اُن کو یقین آگیا کہ ہو نہ ہو، یہ وہی مُھیا ہے جو میرے دو بچوں کو مار چکی ہے ــــ انھوں نے بچے پر دُلائی ڈال دی۔ ماماؤں کو حکم دیا کہ اُس نابکار لونڈی کو، مُشکیں باندھ کر، نیچے لائیں۔

جب وہ کشاں کشاں نیچے آگئی، اُنھوں نے کہا سپاہیوں سے کہو دو مزدوروں سے انگنائی میں قدِ آدم گڑھا کھدوائیں۔ اور جب گڑھا کھود دیا گیا، تو انھوں نے اُس لونڈی کو اُس میں زندہ دفن کرادیا۔

ایک بار اُن کے شوہر، امام الدین خاں، اُن کے علی الرغم، لکھنؤ چلے گئے، اُن کو شوہر کی سرتابی پر اس قدر غصہ آگیا کہ اُنھوں نے سل منگائی، اور اُس سل کو اس قدر زور سے اپنے سینے پر مارا کہ قفسِ عنصری سے روح پرواز کر گئی[1]۔

یہ واقعات میں نے اس واسطے لکھ دیے ہیں کہ آپ کو میری بیوی کا مزاج سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

اُن کا غیظ و غضب

اُنھوں نے بے کراں غضب اور قیامت کی زود برافروختگی، سالمہ بیگم سے، بطورِ میراث پائی ہے ــــ وہ ہر روز، بلاناغہ ملازموں، بیٹی، بیٹا، پوتوں، پوتیوں، نواسوں نواسیوں، اور اس خاکسار کو ہدفِ طعن و تشنیع بناتی رہتی ہیں۔

نوکروں اور بچوں کو وہ ہر روز ''بدتمیز'' کہا کرتی ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ مکانوں کے در و دیوار سے آوازیں چُن کر سنا دینے والی مشین جب ایجاد ہو جائے گی تو میرے مکان میں، ''بدتمیز'' کی اس قدر بے شمار آوازیں گونج اُٹھیں گی کہ سننے والے بے ہوش ہو کر رہ جائیں گے۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا کا کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی ماہرِ نفسیات، یا ماہرِ نفسیات کا باوا ہی کیوں نہ ہو، اس کا اندازہ بھی لگا ہی نہیں سکتا کہ میری بیوی کس وقت، کس بات پر ہنسنے لگیں گی، اور کس بات پر جامے سے باہر ہو جائیں گی۔

اُن کے مزاج کو، کوئی اللہ کا بندہ پکڑ ہی نہیں سکتا۔ وہ میرے، جن لطیفوں پر بے حد ہنس چکی ہوتی ہیں، جب اُن میں سے کوئی لطیفہ دوبارہ سناتا ہوں، تو فرطِ غضب سے، کانپ کر، وہ کہتی ہیں بھاڑ میں جائے، یہ بھی کوئی لطیفہ ہے۔

ہر چند اُنھیں میری ذات سے جو بے کراں محبت تھی، وہ آج کی تاریخ تک باقی ہے۔ اور محبت بھی اس قدر بے حد و پایاں کہ اگر میں اُس کو لفظِ عشق سے منسوب کروں، تو اُس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں اُن کی محبت کی تخفیف و توہین کر رہا ہوں، لیکن جب کسی چھوٹی سی بات پر بھی وہ مجھ سے بگڑ جاتی ہیں، تو ایسا معلوم ہونے لگتا

---

[1]: جب اُن کے میاں تین چار گھنٹے کے بعد آئے، تو بیوی کی موت سے متاثر ہو کر، انھوں نے اپنے دل پر گولی ماری، اور اسی وقت ٹھنڈے ہو گئے۔

ہے کہ اُن سے بڑا میرا جانی دشمن کوئی ہے ہی نہیں۔ ہر ہفتے میں کم سے کم، جی ہاں، کم سے کم تین راتیں تو ایسی ضرور آتی ہیں کہ عین غروب کے وقت، جبکہ میرے طلوع ہونے کی ساعت آتی ہے، وہ میرے تخت پر آ کر بیٹھ جاتی، اور میرے معاشقوں کا ذکر چھیڑ کر، مجھ پر لعن طعن کے تیر برسانا شروع کر دیتی ہیں۔
میں، دانت نکال کر نکال کر، کہتا ہوں، ارے میں دن بھر کا تھکا ماندہ اس وقت پینے اور جینے بیٹھا ہوں، اشرف جہاں، اس وقت تو گڑے مردے نہ اُکھیڑو۔ لیکن تبرہ بازی کا پوار کورس کیے بغیر وہ مانتی ہی نہیں ___ وہ کورس اس قدر طویل ہوتا ہے کہ میں تلملا اُٹھتا ہوں، اور آخر کار تنگ آ کر، کبھی کبھی تو، جلدی جلدی کھانا زہر مار کر کے، اور کبھی کبھی کھانا کھائے بغیر ہی، خواب گاہ میں جا کر، بستر پر دراز ہو جاتا ہوں، ارے وہ خواب گاہ میں بھی، میرا تعاقب کرنے آ جاتی ہیں، اور، دوسری چارپائی پر بیٹھ کر، پھر لعنت ملامت شروع کر دیتی ہیں۔
اثنائے تبرہ بازی میں جب پان دان کھول کر وہ پان بنانے لگتی ہیں، تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں کہ اب اُن کے سارے کارتوس ختم ہو چکے ہیں، اب میں بدبخت سو سکوں گا، لیکن منہ میں پان رکھتے ہی وہ اپنی ملامت گر بندوق میں نئے کارتوس بھر کر گولیاں برسانے لگتی ہیں۔
اس طرح وہ بار بار پان بناتی اور میں ہر بار اس خیال سے خوش ہو جاتا ہوں کہ ملامت کا کوئی ایک بھی پہلو اب باقی نہیں رہا ہے، وہ ضرور خاموش ہو جائیں گی، لیکن وہ پھر کوئی نیا پہلو نکال کر، یہ ثابت کر دیتی ہیں کہ "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ___"
شاید، کسی اللہ کے بندے نے، میرے ہی واسطے یہ شعر کہا تھا:......

آ کر سرِ مزار ، وہ کیا کیا نہ کہہ گئے
ہم نے نہ کچھ جواب دیا، چپ پڑے رہے

اُن کی بدگمانیاں

وہ اپنی ہر بدگمانی، اپنے ہر وسوسے، اپنے ہر طعن، اور اپنے ہر واہمے کو حقیقتِ کبریٰ اور الہام و وحی سمجھتی ہیں۔
جب کوئی بچہ اُن کو پکارنے پر آواز نہیں دیتا تو اُن کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہو نہ ہو، میری بیٹی یا میری بہو نے اُسے ہدایت کر دی ہے کہ وہ میری آواز پر آواز نہ دے، اور چوں کہ، اُن کا ہر گمان ایک حقیقت ہوتا ہے، وہ بیٹی اور بہو پر برس پڑتی ہیں۔
اُن کے دل میں جب کسی اور کے متعلق یہ واہمہ پیدا ہو جاتا ہے کہ "ایسا ہوا ہوگا" یا "ایسا کہا ہوگا" تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ امر، درحقیقت ویسا ہی ہو چکا ہے۔ اور اس "ایسا ہوا ہوگا" پر ایسے ایسے زبردست ہنگامے ہوا کرتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میں اپنے جوانی کے دور میں جب گھر سے نکلتا اور رات کو پلٹتا تھا تو وہ

یہ خیال کر کے کہ میں کسی معشوقہ سے ہم آغوش ہو کر آیا ہوں، مجھ کو، کھینچ کر، روشنی کے سامنے لے جاتیں اور میری شیروانی کو غور سے دیکھتی تھیں کہ کہیں کسی زلف کا کوئی بال تو اس میں چمٹا ہوا نہیں ہے، اور، اُس کے ساتھ ساتھ، وہ میری شیروانی اور کرتے کو سونگھ کر اس کا پتا چلانا چاہتی تھیں کہ کسی معشوقہ کے جسم، تیل، یا عطر کی خوشبو تو میرے کپڑوں سے نہیں آ رہی ہے۔

اور انتہا یہ ہے کہ آدھی راتوں کو اُٹھ کر، وہ یہ پتا چلانے کے واسطے کہ میں رات کو اُٹھ کر کہیں چلا تو نہیں گیا تھا، وہ میرے تلوے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا کرتی تھیں کہ وہ ٹھنڈے ہیں، یا گرم۔

اور اُس کے دوش بدوش جب صبح کو میں بستر پر بیٹھ کر، کچھ سوچنے لگتا تھا، تو وہ، بڑے تیکھے تیوروں سے پوچھتی تھیں کیوں رات کو خواب میں کسے دیکھا ہے کہ اس قدر گم سُم بنے بیٹھے ہو۔

میں نے دو شعر اُس زمانے میں کہے تھے:۔

میں، کسی بات پہ، دم بھر کے لیے، غور کروں
اتنی دوری بھی نہیں ہوتی گوارا تم کو

....

وہ مجھے سوچنے نہیں دیتیں
کوئی حد بھی ہے بدگمانی کی

اُن کی استقامتِ محبت

میری اندھی اور پاگل جوانی کے معاشقوں نے، میری بے چاری بیوی کے دل پر، برسوں ایسے ایسے گھن چلائے کہ اگر وہ پہاڑوں پر چلتے، تو اُن کے ٹکڑے اُڑ کر رہ جاتے، مگر، اُس اختلاج کی ماری مغلوب الغضب اور نازک مزاج دھان پان اللہ کی بندی نے اُن کا، ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ایسا مقابلہ کہ العظمۃ للہ! جھانسی کی رانی کے قدم موت کے روبرو نہیں ڈگمگائے، میری بیوی کی استقامت نے میرے معاشقوں کے آگے سپر نہیں ڈالی، جھانسی کی رانی شہید ہو گئی، میری بیوی، شہید نہیں ہوئیں، لیکن میدان جیت لیا۔ اور، مجھ کو سب سے چھین کر، نعرہ زن ہو گئیں:

شکر ایزد کہ نہ مُردیم و رسیدیم بدست
آفریں باد، بر ایں ہمتِ مردانۂ ما!

عاشق مزاجوں اور تماش بینوں کی بیویاں بشری تقاضے، یا جذبۂ انتقام کی بناء پر، اکثر بے وفا اور بدراہ ہو جایا کرتی ہیں، مگر اُن کے قدم جادۂ محبت و عصمت پر کبھی نہیں ڈگمگائے، انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ مجھ سے طلاق لے لیں۔

اُن کو مجھ پر بے پناہ غصہ ضرور آیا انہوں نے بار ہا میرا گریبان تو ضرور پھاڑا اور مجھے بار ہا کمروں میں قید تو ضرور کیا۔ مگر مجھ سے نفرت کبھی نہیں کی، نفرت کا تو خیر ذکر ہی کیا، وہ مجھے چاہتی رہیں، اور ان کی شدتِ محبت میں، یک سرِ مو بھی، فرق نہیں آیا۔ اور ہمیشہ اس شعر کی مصداق رہیں:

جوئے خوں، سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے، اُٹھ جائیں کیا؟

اس قدر اختلاجی، شعلہ خو، اور شب نم طبع عورت، اور، مسلسل ایسے شدائد برداشت کرے، یہ ایک بڑی حیرت کی بات ہے۔:۔

من کہ ملول گشتمے، از نفسِ ملائکہ
قال و مقالِ عالمے، می کشم از برائے تو!!

اُن کی تدبیر منزل

اگر میری شادی، اُن سے نہ ہوتی تو میں فاقے کر کے مر جاتا۔ میں دس کروڑ گھوڑوں کی طاقت کا انجن ہوں، اُس سے دوگنی طاقت کا بریک ہیں میری بیوی، اگر ایسا قوی بریک نہ ہوتا تو میری حیات کا انجن ہمالیہ سے ٹکرا کر، اب تک کب کا پاش پاش ہو چکا ہوتا۔

میں، حیدرآباد میں جب نیا نیا ملازم ہوا تھا، اُس وقت میرے اسراف کا عالم یہ تھا کہ میری ساری تنخواہ ہر مہینے کی پندرہویں تاریخ کو ختم ہو جاتی تھی۔ اور رام لال سے ہر ماہ سود پر قرض لے کر، مہینہ پورا کیا کرتا تھا____

ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں تو اس قدر ٹھاٹ رہتا تھا کہ میرے ساتھ، ہر صبح کو، دس پندرہ احباب ناشتہ کرتے تھے، ناشتے میں پراٹھے، کباب انڈے، مٹھائیاں اور پھل اس قدر افراط سے میز پر چنے جاتے تھے کہ پلیٹیں رکھنے کی جگہ باقی نہیں رہتی تھی،____ دوسرے ہفتے میں ہر چیز آدھی سے بھی کم رہ جاتی تھی، اور تیسرے ہفتے میں صرف چائے، اور چوتھے ہفتے میں بے دودھ کی چائے پیا کرتا تھا۔

اور کھانوں کا یہ عالم تھا کہ شہر کی تمام بڑی دکانوں میں میرے کھاتے کھلے ہوئے تھے، جہاں سے، دھڑا دھڑ سامان اس بے دردی کے ساتھ، ضرورت کے بغیر، لایا کرتا تھا کہ جب اُن دکانوں کے بل آتے تھے تو، تو رام لال سے سودی روپیہ لے کر، بل ادا کیا کرتا تھا____

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جب تنخواہ لے کر، گھر آتا تو، اپنے برآمدے میں دیکھتا تھا کہ رام لال اپنی بڑی سی توند لیے، آرام کرسی پر دراز ہیں____ میرے پہنچتے ہی وہ میری تنخواہ میں سے اپنے سود کی رقم کاٹ لیا کرتے تھے۔ اور تنخواہ، تقریباً آدھی رہ جایا کرتی تھی۔ بیوی نے جب میرا یہ رنگ دیکھا تو کہا بس ہو چکے لگے تلگے، اب میں گھر سنبھالوں گی، خبردار اب گھر کے کسی معاملے میں تم دخل نہ دینا۔ اگر تم نے دخل دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اور مجھے یہ دیکھ

کر حیرت ہوگئی کہ تھوڑے ہی زمانے کے اندر، انہوں نے گھر کی کایا پلٹ دی، میرے تمام کھاتے بند کرا دیے، اور رام لال جونک کو، ہمیشہ کے لیے، چھڑا کر پھینک دیا ___ اور گھر کی مشین بڑی خوبی کے ساتھ، چلنے لگی ___
اُن کا معمول ہے کہ کھانے کا تمام سامان، اپنے سامنے تُلوا کر، باورچی کو دیتی ہیں، وہ سودا لینے جاتا ہے تو اُس سے پائی پائی کا حساب لیتی ہیں۔
میں جب باہر جانے لگتا ہوں تو وہ پانچ یا دس روپے سے زیادہ مجھ کو نہیں دیتیں، اور بعض اوقات تو تین تین پیسیوں کے بعد، مجھ کو اُن سے وہ حقیر رقم ملتی ہے۔ اور گھر آتے ہی حساب دینا اور لکھنا پڑتا ہے۔ اور جب تک وہ حساب نہیں لکھا لیتیں، ایک شدید اضطراب میں مبتلا رہتی ہیں ___
جب باورچی کھانا پکانے میں مشغول ہوتا ہے، وہ اُسے ہانڈی پکانے کے گُر سکھانے، اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ چوری تو نہیں کر رہا ہے، بار بار باورچی خانے کے چکّر لگاتی رہتی ہیں۔
سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مجھ کو مشاعروں سے نفرت ہے، مگر وہ مجھے مجبور کر کے، اس لیے بھیجتی ہیں کہ میں ایک ہزار روپیہ لے کر گھر آؤں گا۔ ہائے ایک ہزار کی سی ذلیل رقم کے واسطے مجھ کو اپنا دس ہزار من خون جلا دینا پڑتا ہے ___ اور میں چیخ اُٹھتا ہوں: ___

یہ بندہ ہر حشر، بہ جرمِ تشکیک   دوزخ کا سزاوار ہے، تیرے نزدیک؟
معبود، خطا ایک، سزا ہو سو بار   فدوی تو مشاعروں میں ہوتا تھا شریک

اُن کے سگھڑ پن کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ انہوں نے کراچی میں ایک دو منزلہ مکان بنوالیا ہے۔ جب انہوں نے مکان بنانے کا ارادہ کیا، تو میں نے کہا تھا بیوی مکان تو بڑی چیز ہے، تم میرا مقبرہ بھی نہیں بنوا سکتیں ___ لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے مکان بنوالیا، اور مجھے کرائے کے مکانوں سے نجات دلا دی۔
آج سے کئی برس پیش تر کی بات ہے کہ ایک بار انہوں نے ایک بکس دکھا کر مجھ سے پوچھا بھلا بتاؤ اس میں کیا ہے، میں نے کہا کیا مجھ کو علام العیوب سمجھتی ہو۔ انہوں نے بکس کھول کر کہا دیکھو اس میں کیا ہے، اور یہ دیکھ کر میں خوشی و حیرت سے اچھل پڑا کہ جن کاپیوں پر میں نے اوّل اوّل نظمیں کہی تھیں، اور میں سمجھتا تھا کہ وہ تلف ہو چکی ہیں، وہ تمام کاپیاں اُس بکس میں موجود ہیں، اور صرف کاپیاں ہی نہیں، میرے ہات کے تمام لکھے ہوئے پُرزے بھی اُس بکس کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے ہیں۔
اس کے بعد انہوں نے پوچھا اب ان کا کیا کرو گے؟ میں نے کہا کروں گا کیا، انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا ہوں، بس یہی کافی ہے ___ انہوں نے کہا ارے تم میں عقل کب آئے گی، میں نے کہا اس میں عقل کی کون سی بات ہے۔ انہوں نے کہا ممتاز حسن صاحب اور پیر حسام الدین سے کہو کہ قومی عجائب گھر کے واسطے ان کو خرید لیں۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا، اور ان دونوں حضرات کی مہربانی سے پندرہ ہزار روپے میں وہ کاپیاں خرید لی گئیں۔ اس طرح ۱۹۲۱ء میں، انہوں نے ٹھیل ٹھیل کر، سب سے پہلے مجھ سے، میری پہلی تصنیف ''روح

ادب'' مرتب کروا کر چھپوائی۔ اور، اُسی کے دوش بدوش، انہوں نے، میرے سر پر سوار ہو کر، میری نظموں کے مندرجہ ذیل اکیس مجموعے بھی چھپوا دیے۔

روحِ ادب ۱۹۲۲ء۔ جذباتِ فطرت، مقالاتِ زریں، اوراقِ سحر ۱۹۲۳ء۔ شاعر کی راتیں ۱۹۳۰ء، آوازۂ حق، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، آیات و نغمات، فکر و نشاط، عرش و فرش، جنون و حکمت، سموم و صبا، طلوعِ فکر، افکار و الہام، نجوم (جواہر) ___ ☆ سموم و صبا، سنبل و سلاسل، حرف و حکایت، سرود و خروش ___ اور سیف و سبو۔

ابھی میرے مندرجہ ذیل چھ مجموعے غیر مطبوعہ پڑے ہوئے ہیں، اور وہ غور کر رہی ہیں کہ اُن کے چھپ جانے کی بھی جلد کوئی سبیل نکال دیں۔ موجد و مفکر، آگ، موت، محمد و آلِ محمد کی نگاہ میں، وحدتِ انسانی، جزر و مد، ☆ا، اور حرفِ آخر۔

اور میری یہ کتاب یعنی ''یادوں کی برات'' بھی انہیں کے مساعیِ پیہم کا نتیجہ ہے، اگر وہ مسلسل ٹھیلتی نہ رہتیں تو یہ کتاب قیامت تک نہ لکھی جاتی۔ جب مجھ سے، حسبِ سنتِ جاریہ، بگڑ جاتی تو کہا کرتی ہیں کہ میں نے تم کو جوش بنایا ہے، میں نہ ہوتی تو تمہاری نظموں کے پرچے ہواؤں میں اُڑ اُڑ کر غائب ہو جاتے اور میں سر جھکا کر، اس کی تائید کرتا ہوں۔

اُن کے معمولات و عادات

وہ، بیدار ہونے کے بعد، جب تک غسل نہ کر لیں، کسی سے بات کرنا، یا کسی سے کوئی بات سننا پسند نہیں کرتیں، یہی عالم اُن کا ہوتا ہے، ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے بعد کہ وہ لیٹ جاتیں اور باتیں نہیں کرتی ہیں ___ اگر صبح ناشتے، اور دوپہر کے کھانے کے بعد کوئی زور سے بول دیتا ہے تو انہیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اختلاج کی بناء پر وہ یہ پسند نہیں کرتیں کہ عورتوں سے میل جول بڑھائیں، یا انہیں اپنے گھر بلائیں، یا خود اُن کے گھر جائیں۔

وہ صفائی اور فرنیچر کی ترتیب کو بے حد پسند کرتی ہیں۔ اگر کوئی کرسی ٹیڑھی ہو جاتی ہے، یا بستر پر کوئی شکن پڑ جاتی ہے، یا تکیہ نیچا اونچا ہو جاتا ہے، یا، بے ترتیبی سے جوتے اُتار کر، کوئی تخت پر بیٹھ جاتا ہے، یا نہانے کے بعد کوئی تولیا کو ہوا میں پھیلا نہیں دیتا ہے، یا گلاس، صابون دانی، اور صراحی کا سرپوش ہٹ جاتا ہے اُن کو بے حد تکلیف ہوتی ہے، اور جب تک وہ اُن چیزوں کو درست نہیں کر دیتیں، اُن کو چین نہیں آتا۔

اسی طرح اُن کے بیٹھنے اور لیٹنے کے ہمیشہ دو مخصوص محل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ تخت پر جس جگہ بیٹھتی ہیں، اُس جگہ کو کبھی ترک نہیں کرتیں۔ اور دوپہر کو، خواہ کتنی ہی بے چینی کیوں نہ ہو، وہ تخت پر لیٹتی ہیں، اور جب میں کہتا ہوں کہ خواب گاہ میں آ کر نرم بستر پر لیٹ جاؤ تو وہ کہتی ہیں یہ بات وضع داری کے خلاف ہے، اگر مجھ میں یہ وضع داری نہ ہوتی تو میرا نباہ، تم ایسے اُٹھاؤ چولہے سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

☆ ___ ان دونوں شعری مجموعوں کے نام، الہام و افکار اور نجوم و جواہر ہیں، ☆ا ___ اس مجموعے کی تا حال کوئی اطلاع نہیں۔

میری بیٹی

نام سعیدہ خاتون عرف ہے ''کلوا'' مولد ملیح آباد، سنِ ولادت غالباً ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء۔
اُس کی شادی غالباً ۱۹۳۸ء میں، جب کہ میرا قیام دہلی میں تھا میری چچازاد بہن احمدی بیگم، اور میرے چچی زاد بھائی نبی احمد خاں کے فرزند، التفات احمد خاں شہاب سے ہوئی تھی۔
میں نے، شادی کے دن، یہ وعدہ نبی احمد بھائی سے لے لیا تھا کہ میں لڑکی کو رخصت نہیں کروں گا، جب تک زندہ ہوں، وہ میرے ساتھ ہی رہے گی۔ چناں چہ وہ آج تک میرے ساتھ رہتی ہے۔
میرا داماد، علی گڑھ کا گریجویٹ، نکتہ رس متفکر، اور خوش گفتار شاعر، لیکن جینے اور اُبھرنے کے حوصلے سے افسوس ناک حد تک محروم تھا ـــــــ اُس نے اپنی پوری زندگی لکھنے پڑھنے، مسائل پر غور کرنے، شعر کہنے اور بستر پر دراز رہنے میں صرف کر دی، اور اس تسلسل کے ساتھ، برسوں لیٹا رہا کہ مختلف امراض نے اُس کو گھیر لیا، اور اس کا، عبرت ناک نتیجہ یہ نکلا کہ آخرِ کار وہ اس دنیا سے، قبل از وقت، رخصت ہو گیا۔
چوں کہ اُس کو اس بات کا یقین تھا کہ جب تک میں بقیدِ حیات رہوں گا، اُسے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے پائے گی، یہ ظالم یقین اُس کو لے ڈوبا، اور میری زندگی اُس بے چارے کی موت کا باعث بن گئی۔
سعیدہ اُس کی بے عملی و کاہلی سے بیزار، اُس سے ہمیشہ برسرِ کار، اور، زندگی بھر، اُس پر سب و شتم کرتی رہی، لیکن جب وہ سدھار گیا، تو سر پیٹنے لگی۔
ازدواج کا مآل ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ایک دن ایک سوتا ہے، اور ایک روتا ہے۔ مجھے اپنی لاڈلی بیٹی پر بڑا ترس آتا ہے۔ وہ تو بچوں [1] کی ماں ہے۔ لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے، لڑکے بن بیاہے ہیں۔ ہر چند وہ بلیڈ پریشر کی صیدِ زبوں ہے، پھر بھی، تڑکے سے اُٹھتی ہے، اور رات کے دس گیارہ بجے تک، اپنے اور اپنی لڑکیوں کے بچوں کی، مسلسل خدمت کرتی رہتی ہے۔

---

[1]: انور سعید خاں، عرف 'میاں'، حیدر مسعود خاں عرف 'ٹھا'، پرویز شہاب خاں، عرف 'بابا'، صبوحی خاتون، غزالہ خاتون، خسرو شہاب خاں، عرف 'بلو'، علی معظم خاں، عرف 'مسکین شاہ'، فرخ جمال خاں، عرف 'قلندر' اور سراج انور خاں، عرف 'مسٹر گگی'

ہر چند میں اپنے کو بڑا عقل پرست اور روشن خیال سمجھتا ہوں، مگر اپنے خون اور اپنے آبائی مزاج کو کیا کروں کہ جب سعیدہ، سودا لینے صبح کو مارکٹ جاتی ہے، تو اس کے ہات کا تھیلا، میرے دل پر گھن چلانے لگتا ہے، اور یہ سوچ کر کہ آبائی امارت پر زوال نہ آجاتا تو یہ دن کاہے کو دیکھنا پڑتا میری نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں اور اپنے باپ کی یہ آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے کہ شبیر یہ کیا رکاکت ہے کہ تو اپنے ہات میں تولیا اُٹھا کر غسل خانے جارہا ہے، کیا مامائیں اصیلیں مرچکی ہیں؟۔ ہائے کیا تھا، اور کیا ہوگیا۔

افسوس میں اپنی قدامت گزیدہ جوانی کے باعث، اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم نہیں دلا سکا، لیکن اس کے باوجود، وہ اس قدر ذہین ہے کہ بڑے بڑے اُلجھے مسائل اور بڑے بڑے پیچیدہ اشعار کو، بڑی آسانی کے ساتھ سلجھا دیتی ہے، اور بڑی سے بڑی تعلیم یافتہ خواتین اُس کا منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ اور گلا تو اُس نے ایسا پایا ہے جب، تھکن دور کرنے کے لیے، وہ کبھی کبھی گانے لگتی ہے تو گھر کے درودیوار جھومنے لگتے ہیں۔ بچپن میں وہ مجھ کو اپنی ماں سے کہیں زیادہ چاہتی تھی، لیکن جب وہ خود ماں بن گئی، تو اُس کی محبت کا دھارا اپنے بچوں کی طرف مڑ گیا۔ ہر چند آج بھی اُس کو مجھ سے محبت ہے، لیکن وہ گرم جوشی باقی نہیں رہی ہے۔

میں اُس کی اس فطری تبدیلی سے قطعاً غم گین نہیں ہوں، لیکن میری بیوی کو اس کا بے حد قلق ہے، اور اکثر شکایت کرتی رہتی ہیں کہ سعیدہ کو اب میری پرواہی نہیں رہی ہے۔ اور کبھی کبھی تو وہ مجھ سے بدتمیزی پر بھی اُتر آتی ہے۔

بدتمیزی کی بات پر میں اُن سے کہتا ہوں کہ اُس نے تمہارا اور تمہاری نانی سالمہ بیگم کا غیظ وغضب وراثت میں پایا ہے، اور میں بھی لڑکپن میں بے حد تند خو تھا، اُس کا اثر بھی اُس میں آیا ہے، لیکن اُس کی محبت کے اضمحلال سے رنجیدہ نہ ہو کہ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ لڑکی ہو یا لڑکا، اپنے بچوں کے برابر، اپنے ماں باپ کو نہیں چاہ سکتا۔ اور اس نکتے کو بھی گرہ میں باندھ لو کہ اس کرۂ ارض کے تمام بچے، اپنے ماں باپ کے بچے کم، اور اپنے بچوں کے ماں باپ زیادہ ہوتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو نسلِ انسانی کے پروان چڑھانے کے عمل میں بڑا فساد پیدا ہو جاتا۔

❁

میرا بیٹا

نام ہے سجاد حیدر خاں، عرف ہے "مجھجو" اپنی بہن سے سال سوا سال چھوٹا ہے، لکھنؤ میں پیدا ہوا تھا، اور، جائے ولادت کے اعتبار سے، اُس کو مجھ پر فضیلت حاصل ہے۔

میں نے اُس کی تعلیم کی بے حد سعی کی، لیکن وہ پڑھ نہیں سکا، اور ہمیشہ اسکول سے بھاگتا رہا۔ کیا بتاؤں کیا کیا جتن کیے میں نے اُسے پڑھانے میں، تلوار لے لے کر میں اُس کے پیچھے دوڑا، اور، آنسو بہا بہا کر، اُس کو علم کی جانب مائل کرنا چاہا، لیکن تلوار نے کام کیا، نہ آنسوؤں نے۔

میرا خیال ہے کہ کسی باپ کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے بیٹے اور اُس کی سرشت کے مابین آکر، اُسے اُس کی فطرت سے دور کردے۔ ہر کسے را، بہر کارے ساختند۔

اُس کی بدشوقی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ اُس کی ولادت سے ایک سال قبل اُس کی ماں، اختلاج میں بُری طرح مبتلا ہو گئی تھی، اور، رات رات بھر جاگتی اور انگنائی میں ٹہلا کرتی تھی، اور کسی حکیم صاحب نے، دھوکا کھا کر، یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ اس کے پیٹ میں ورم ہے، اور ورم تحلیل کرنے کی اس قدر دوائیں دی تھیں کہ جب وہ پیدا ہوا تو اُس کی آنکھوں پر ورم تھا۔

اور جب، خدا خدا کر کے، اُس کی آنکھوں کا ورم دور ہوا، تو اُس پر، بڑے تسلسل کے ساتھ، مختلف امراض نے حملہ کر دیا۔

سب سے پہلے اُس کا سینہ جکڑ گیا، اور دمے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اُس کے بعد اُس کو ڈبل نمونیا ہو گیا، پھر چیچک، یرقان، اپنڈی سائٹس، پیچش اور آخر میں طاعون نے حملہ کر دیا اور اُن تمام امراض کے تسلسل کی بناء پر، وہ تعلیم کی جانب مائل نہیں ہو سکا۔

لوگوں کا خیال ہے کہ انسان پر اُس کے نام اور تخلص کا بہت اثر پڑتا ہے، اور چوں کہ اس کا نام سجاد ہے، اور حضرت سید سجاد، کربلا میں بیمار تھے، اور اب تک اُن کو "عابد بیمار" کہا جاتا ہے، اس لیے سجاد بھی بیماریوں میں گھر گیا۔ لیکن میں اس خیال کو واہمے سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں دیتا۔

بیماریوں سے نجات پانے کے بعد وہ موسیقی کی جانب مائل ہو گیا، میں نے اُس کو سمجھایا کہ وہ مدرسہ موسیقی،

دونوں کو دوش بدوش جاری رکھے، مگر اُس نے میری بات نہیں مانی، اور لکھنؤ کی بھاٹ کنڈے میوزک یونی ورسٹی میں داخل ہو گیا۔ اور وہاں سے فرسٹ کلاس فرسٹ کی سند حاصل کر لی ____ اور متعدد فلم کمپنیوں میں اسسٹنٹ میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے دھنیں بنانے لگا۔

وہ وائلن، بانسری، ستار، ہارمونیم، اور طبلہ بڑی مہارت کے ساتھ بجاتا ہے۔ اُس کو شاعری کا بھی ذوق ہے، کبھی کبھی شعر کہتا ہے، اور اُس کے بعض شعروں میں بڑی جان ہوتی ہے۔ وہ ابھی فقط سات سال کا تھا کہ، میری گود میں بیٹھ کر، بڑی مہارت کے ساتھ، موٹر چلانے لگا تھا، اور بارہ تیرہ برس کی عمر میں اُس نے، موٹر مکینک کی حیثیت سے، وہ نظر پیدا کر لی تھی کہ موٹر کی چھوٹی موٹی خرابیاں دور کرنے لگا تھا۔

اب وہ، ماشاءاللہ پانچ بچوں [۱] کا باپ ہے۔ اُس نے، اپنی مرضی سے، اور اپنی ماں کے علی الرغم، فقیہ خاندان کی انور جہاں سے شادی کی ہے، باپ کسی ریاست میں نائب وزیر تھے۔ انور جہاں اچھی خاصی تعلیم یافتہ مگر مراق کی صیدِ زبوں ہے۔

میرے پاس زیل پاک کی سیمنٹ ایجنسی تھی، جس کو وہ چلا رہا تھا، جب میں ایوب خاں کا معتوب ہو گیا تو مجھے ملازمت سے ہٹا دیا گیا، اور میری ایجنسی بھی چھین لی گئی، اور جب میرا کوئی ذریعۂ معاش باقی نہ رہا، تو، سجاد کی پرانی مہارت کام آئی، اور اس نے ایک موٹر کی ورک شاپ قائم کر دی۔ میں جب اُس کو ورک شاپ میں دیکھتا ہوں تو دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہے، اُس کے میلے ہات، اور میلے کپڑے میرے دل پر خنجر چلانے لگتے ہیں۔

میرے باپ نے، جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، یہ بات گوارا نہیں کی تھی کہ میں اپنے ہات میں تولیا اُٹھا کر، غسل خانے جاؤں، اور اب میرا بچہ، میری آنکھوں کے سامنے ہتوڑے چلا رہا ہے۔

سخت است، پس از جاہ، تحکّم بُردن!

میں نے آبائی تلوار کو گلا کر قلم بنایا تھا، میرا فرزند اپنے ستار کو تپا کر، ہتوڑا بنا چکا ہے۔

ایں میر سید کہ بر غالب ناکام چہ رفت؟
ئی تو اں گفت کہ ایں بندہ، خداوند نہ داشت

---

[۱]: ساجد حیدر خاں عرف "تانڑ"۔ ناز خانم، عرف "ا،می"۔ ترنم خاتون عرف چمنی، تاجدار بیگم، تبسم خاتون، عرف "منٹی"، فواد حیدر عرف مسٹر بندر۔

یادوں کی برات کے منتشر اوراق

۱۲ کاپیوں میں موجود یادوں کی برات کے نسخے کے ساتھ (جن میں دوسرے اور تیسرے مسودوں کے متعدد صفحات بھی ہیں) علیحدہ سے بھی بعض ایسے صفحات ان قلمی تحریروں میں موجود ہیں جن پر نہ تو کوئی صفحہ نمبر درج ہے اور نہ وہ اس پورے قلمی نسخے کے مقررہ سائز کے مطابق ہیں۔ یہ صفحات دو شخصیتوں کے تذکرے پر مشتمل ہیں ایک آزاد انصاری دوسرے رابندر ناتھ ٹیگور۔ ان دونوں شخصیات کے بعد آخر میں میرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی پر بھی جوش صاحب کی ایک تحریر شامل ہے۔ ان تینوں تذکروں کے متعلق چند وضاحتیں متعلقہ صفحات کے فٹ نوٹ میں کر دی گئی ہیں۔

حضرت آزاد انصاری مرحوم ☆

حضرت آزاد سے میری پہلی ملاقات حیدر آباد میں ہوئی تھی، یہ غالباً ۱۹۲۶ء کی بات ہے، جب کہ وہ اُس گول بنگلے میں رہتے تھے، جس کی چھت پر میرے مرحوم دوست عارف کے اخبار ''صبح دکن'' کا دفتر تھا۔
جہاں تک یاد پڑتا ہے عارف ہی نے مجھ کو اُن سے ملایا تھا۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ اُن کی پہلی ملاقات میں کوئی دلچسپی مجھ کو محسوس نہیں ہوئی تھی۔
میری ملاقات کے وقت وہ ایک اچھے خاصے بوڑھے انسان تھے۔ منہ پر فرنچ کٹ سفید داڑھی تھی، اور اُن کی ترکی ٹوپی کا پھندنا اُن کے ماتھے کی طرف لٹکا رہتا تھا۔
وہ مولانا حالی کے شاگرد، فنِ شعر کے استاد، عروض کے ماہر اور نثری ترتیب میں بلند شعر کہنے کے بانی تھے، اور، خاتم بھی۔ وہ جن شعری خصوصیات، اور جس متین لہجے کے مالک تھے، عبرت کا مقام ہے کہ اُس کے بقدر اُن کو شہرت نصیب نہیں ہوئی۔
شہرت بھی ایک عجیب معمہ اور طلسم ہے۔ بعض اوقات نااہلوں کے ہات اس طرح آجاتی ہے کہ اہل منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ حافظ نے بھی اس کی طرف ع ''قبولِ خاطر ولطفِ سخن خداداداست'' میں اشارہ کیا ہے۔
میں اس مضمون میں آزاد صاحب کے شعری محاسن پر روشنی نہیں ڈالوں گا، یہ مضمون تو صرف اس لیے قلم بند کر رہا ہوں کہ اُن کے مزاج کے چند خصوصیات اور اُن خصوصیات سے وابستہ چند واقعات و لطائف پیش کر دوں۔
آزاد صاحب اپنے استاد مولانا حالی کا بے حد احترام کرتے تھے، اس بات سے میرے ایک قرابت دار دوست ابرار حسن خاں واقف تھے جو قیامت کے شوخ واقع ہوئے تھے ایک بار ان کے دل میں یہ بات آئی کہ آزاد صاحب کو چھیڑیں، چنانچہ ایک دن جب کہ آزاد صاحب موٹر میں میرے ساتھ تھے، ابرار نے آزاد صاحب سے کہا۔ ''آزاد صاحب آپ نے اپنے استاد کی وہ نظم پڑھی ہے ''اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے''؟

☆ ___ جوش صاحب نے اپنی خود نوشت میں 'میرے چند قابلِ ذکر احباب' کے تحت حکیم آزاد انصاری پر بھی لکھا ہے یہ اسی سلسلے کا ایک مسودہ ہے جس کے آخر میں ۱۶ر نومبر ۱۹۶۳ء کی تاریخ درج ہے۔ جوش صاحب نے اپنی ایک نظم 'پیرزن لیگ' (حرف و حکایت، ۱۹۳۸ء ص: ۲۹) کا آغاز ہی آزاد انصاری کو مخاطب کر کے کیا تھا: ___ 'کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرت آزادؔ

آزاد نے کہا، ہاں پڑھی ہے۔
ابرار نے "فوں فوں فوں کیا" آزاد نے پوچھا یہ "فوں فوں" کیسی، ابرار نے قہقہہ مارا اور کہا قُوآن مجید کی قسم (ابرار کی زبان سے "قرآن" کے بجائے ہمیشہ "قُوان" نکلا کرتا تھا) آزاد نے کہا یہ "قوآن" کی قسم چہ معنی دارد، ابرار نے پھر قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "قوان مجید کی قسم آپ کے استاد کے کلام پر اگر کوئی لیبل لگایا جاسکتا ہے تو وہ ہے "گائے کی فریاد" آزاد صاحب کانپنے لگے، کہا ابرار مجھ کو جس قدر چاہو بُرا کہہ لو، مگر میرے استاد کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ نہ نکالو' ورنہ میں ابھی چلتی موٹر سے کود کر جان دے دوں گا، ابرار نے اُن کی بلائیں لے کر کہا تیرے قربان اے میری گائے کی فریاد کے شاگردِ رشید" یہ سنتے ہی آزاد صاحب نے موٹر کا دروازہ کھٹ سے کھول دیا، کوُد پڑنے کے لیے جھکے، میں نے جلدی سے اُنھیں اپنی طرف کھینچ کر دروازہ بند کرلیا، ابرار کی ساری ظرافت پر پانی پھر گیا، اور دم بخود ہو کر رہ گئے ____ یہ تھا اپنے استاد کا احترام آزاد کی نظر میں۔
ایک روز ایک ادھیڑ مولانا، روتے ہوئے، آزاد صاحب کے پاس آئے، کہنے لگے میری والدۂ محترمہ کا انتقال ہوگیا ہے، اُن کے لوحِ مزار کے واسطے ایک تاریخی قطعہ کہہ دیجئے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، آزاد صاحب نے وعدہ کرلیا، مرحومہ کا نام خدیجہ بی تھا، آزاد صاحب سہ پہر کو قطعہ کہنے بیٹھے، ابرار بھی آگئے، اور جب آزاد صاحب نے ان کو اپنے قطعے کا یہ شعر سنایا کہ:

دل سے سارے عزیز کرتے تھے
عزت و حُرمتِ خدیجہ بی

ابرار نے ہات جوڑ کر کہا قوآن کی قسم آپ نے یہ شعر کہہ کر خدیجہ بی کی ناک کاٹ ڈالی ہے، اگر آپ کے دل میں مرحومہ کی عزت نہیں ہے تو خدارا اُن مولوی صاحب کی داڑھی کا تو احترام کرتے جن کی خدیجہ بی ماں تھیں۔
آزاد حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگے، اپنی فرنچ داڑھی کو کھجایا اور پوچھا آخر اس شعر میں عیب کیا ہے۔ ابرار نے کہا اتنا بڑا عیب اور آپ کو نظر نہیں آرہا ہے، جبھی تو میں کہتا ہوں کہ کچھ روز کے لیے لکھنؤ میں قیام فرمایئے، اگر یہ ممکن نہیں تو لکھنؤ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی دس منٹ کے لیے کھڑے ہوجایئے، اگر آپ نے میری نصیحت پر عمل کیا تو قوآن مجید کی قسم پھر زندگی بھر کبھی ایک بار بھی اس قدر فحش شعر نہیں کہیں گے، اجی آپ نے تو خدیجہ بی پر ایسی تہمت لگادی ہے کہ اُن کے پورے خاندان کی ناک کاٹ کر رکھ دی ہے، ارے غضب کی بات ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ع "دل سے سارے عزیز کرتے تھے" یعنی مرحومہ خدیجہ بی کی تمام اقربا اُن کے ساتھ فعلِ شنیع کا ارتکاب کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر آزاد صاحب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوگئے، ابرار کو گلے سے لگالیا، کہنے لگے تم نے مجھ کو رسوائی سے بچالیا۔ یہ تھی آزاد صاحب کی حق پسندی ____
ایک روز سرِ شام بمبئی کے بینڈ اسٹینڈ پر آزاد صاحب سیر کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک نہایت خوبصورت عورت

نظر آئی جس پر نظر پڑتے ہی آزاد صاحب کے منہ سے ایک خراشگاف چیخ نکل گئی، ہائے مار ڈالا، یہ چیخ سن کر تمام مجمع درہم و برہم ہوگیا، ہر شخص اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا کہ کس نے کس کے چھری ماردی ہے، نگاہیں آزاد صاحب کے چہرے کی طرف آئیں، لیکن یہ اندازہ کر کے کہ اس قدر معصوم صورت مردِ بزرگ کبھی ایسی چیخ نہیں مار سکتا، دوسری طرف مُڑ گئیں۔ یہ تھی حضرتِ آزاد کی حُسن پرستی____

ایک روز مہاراجہ کی دعوت پر میں پٹیالے جا رہا تھا، آزاد صاحب نے فرمایا مجھے بھی ساتھ لیتے چلیے، میں اپنی بھانجی! سے ملنے کے لیے سہارن پور اُتر جاؤں گا، واپسی میں ایک دن کے لیے سہارن پور ٹھہر جایئے گا، وہاں لوگ آپ کے مشتاق ہیں، آپ کا کلام سُن لیں گے، اور دوسرے دن آپ کے ساتھ دہلی روانہ ہو جاؤں گا۔

پٹیالے سے دو چار روز کے بعد، جب میں ریل میں سوار ہوا تو کسی اسٹیشن پر دہلی کے ایک صاحب زادے اقبال بھی میرے ہم سفر ہو گئے۔ اقبال کے پاس ایک سیاہ بُرقع تھا، جو وہ اپنی بہن کے واسطے لے جا رہے تھے۔

مجھے اقبال اور بُرقعے کو دیکھ کر شرارت سوجھی، اقبال کو ایک دن کے واسطے التوائے سفر پر رضامند کر لیا، میں اُس لڑکے کو سہارن پور لے آیا، اور جو شرارت مجھ کو سوجھی تھی، وہ اقبال کو اچھی طرح سمجھا دی۔ اقبال سمجھ گیا کہ اُس کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے۔

اقبال کو، تھوڑی دیر کے لیے ویٹنگ روم میں ٹھہر جانے کی ہدایت دے کر میں آزاد صاحب کی بھانجی کے مکان گیا، اور آزاد صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا، ابھی ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، اور آزاد صاحب اپنی بھانجی کے شوہر کو ہدایت کر رہے تھے کہ فلاں فلاں حضرات کے نام دعوتی رقعے بھیج دو کہ ایک بچہ دوڑا ہوا آزاد صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا نانا ایک عورت آپ سے ملنے آئی ہے، آزاد صاحب نے گھبرا کر کہا مجھ سے، نام کیا ہے اُن کا؟ اچھا ٹھہر جاؤ دروازے پر جا کر پوچھ لیتا ہوں، آزاد صاحب ابھی کرسی سے اُٹھے ہی تھے کہ وہ خاتون مردانہ کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اور آزاد صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگیں۔

آزاد صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا، بڑی مشکل سے اُن خاتون کی بانہوں سے نجات پا کر انہوں نے کہا آپ ہیں کون، میں آپ کو نہیں جانتا، الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔

خاتون نے لپک کر اُن کا دامن پکڑ لیا، ارے اپنی جمیلہ کو بھول گئے، اے میں وہی بدنصیب جمیلہ ہوں۔ جس کی گلی میں روز آپ کی جوانی سو سو چکر کاٹا کرتی تھی۔ ہائے زمانے میں کون کسی کا ہوتا ہے۔ جمیلہ نے یہ کہہ کر اپنا برقع اُلٹ دیا، اور کہا صورت دیکھ کر بھی نہیں پہچانو گے بالم، آزاد صاحب نے جیسے ہی اُن خاتون کا منہ دیکھا، دونوں ہات زانوؤں پر مار کر کہا اُفوہ اقبال تیری شرارت نے تو مجھ کو ادھ موا کر دیا، اگر تو برقع اُٹھائے بغیر چلا جاتا، تو یہ سارے بچے نہ جانے مجھ کو کیا سمجھتے، اس کے بعد آزاد صاحب نے غور سے میرے منہ کی طرف دیکھا، جس پر ہنسی کھیل رہی تھی، اور قہقہہ مار کر کہا اب پوری سازش سمجھ میں آ گئی، جوش صاحب آپ کے کاٹے کا منتر

نہیں ہے۔ آزاد صاحب نے کہا اور دھم سے اپنی کرسی پر یوں گر پڑے جیسے کسی ڈوبتے کو دریا سے نکال کر ساحل پر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ تھا آزاد صاحب کا شرمیلا پن۔

ایک روز میرے دہلی کے دریا گنج والے مکان میں فانی، مانی، اور جگر آئے، آزاد صاحب تو میرے یہاں رہتے ہی تھے، وہ بھی موجود تھے۔ غزل پر بات چھڑی، میں نے غزل کو فطری صنفِ سخن کہا، دلائل پیش کیے، لیکن ان لوگوں نے میری کوئی دلیل تسلیم نہیں کی، میں نے دل میں یہ ٹھان کر کہ کل اُن کو شرمندہ کروں گا، ان دوستوں سے کہا کل شام کو کارونیشن ہوٹل آجایئے گا، وہاں چائے ہو جائے گی، اور ہر شخص اپنا اپنا بلاغت نظام بھی سنائے گا۔

دوسرے روز جب وقتِ موعود پر میں ہوٹل پہنچا، یہ تمام حضرات میرا انتظار کر رہے تھے، فانی نے بگڑ کر کہا اب بھی آئے تو مہربانی کی، میں نے بڑا معصوم چہرہ بنا کر کہا "بھائی جوتے نے کاٹ لیا ہے، چلا نہیں جاتا۔ آج کل تو سنتروں کا کال پڑ گیا ہے۔ جھانسی کی رانی کس قدر بہادر عورت تھی، تاج محل کا تو دنیا میں کوئی جواب نہیں" اور مبارک شاہ کا نور نامہ" "واقعی نور نامہ ہے" فانی نے کہا کیا بھنگ پی کر آرہے ہو، کسی بات کا نہ سر ہے نہ پاؤں، یہ اُڑا کیا رہے ہو، میں نے ہات جوڑ کر کہا "پنچو معاف کرنا غزل کہہ رہا ہوں" یہ سنتے ہی سب کے سب ہنسی کے مارے لوٹنے لگے، لیکن منہ ذرا ذرا سے نکل آئے، اور چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ یہ تھی میری آخری دلیل غزل کے خلاف!

١٦/١١/٦٣

کراچی

رابندر ناتھ ٹیگور☆

کانگریس کے سفر سے جب پلٹ کر لکھنؤ آیا تو غلغلہ سنا کہ ٹیگور لکھنؤ آئے ہوئے ہیں، اور قیصر باغ کے قریب کسی بنگالی بیرسٹر کے وہاں مہمان ہیں ___ بڑے اشتیاق کے ساتھ وہاں پہنچا، دروازے کی گھنٹی بجائی اندر سے، انگریزی میں آواز آئی اندر آجایئے، کمرے میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ ٹیگور غسلخانے سے نکل کر، زلفوں میں کنگھی کر رہے ہیں، اور بالوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں ___

اس سے پیشتر کہ میں انہیں اپنے نام سے آگاہ کروں انہوں نے، سیدھے ہات کی انگلی بلند کی، مسکرائے، اور بڑی سادگی و بے تکلفی سے انگریزی میں کہا "کیا میں ایک نوجوان شاعر کے چہرے کو نہیں دیکھ رہا ہوں"، "میں نے سر جھکا کر، انگریزی ہی میں جواب دیا "شاید"۔ انہوں نے پوچھا "شاید" سے کیا مراد ہے آپ کی۔" "میں نے کہا کوشش کر رہا ہوں شاعر بن جانے کی۔"

ٹیگور، مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کر کے، صوفے پر بیٹھ گئے، اور قہقہہ لگا کر کہا شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں ہے کہ اُس کے حصول کی کوشش کی جائے، آپ کا نام کیا ہے، میں نے کہا میرا شاعرانہ نام جوشؔ ملیح آبادی ___ ٹیگور نے میرا، نام زیرِ لب دُہرایا، کہنے لگے آپ کا نام مجھ تک پہنچ چکا ہے، اور میں آپ کی نظم "طلوعِ صبح" کا ترجمہ بھی سروجنی نائیڈو سے کل ہی سن چکا ہوں، اس موضوع پر اس سے بہتر نظم میں نے آج تک نہیں سُنی ہے، آپ کچھ روز تک شانتی نکیتن میں میرے ساتھ رہیں، کہیے کیسی تجویز ہے، آپ، آسانی کے ساتھ وہاں رہنے کا

☆ ___ جوشؔ صاحب نے یادوں کی برات میں 'آل انڈیا خلافت کمیٹی کے اجلاس' کے بعد اجمیر سے اپنی واپسی اور لکھنؤ پہنچنے کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں شانتی نکیتن میں رابندر ناتھ ٹیگور سے اپنی ملاقات کو بیان کیا ہے لیکن اس قلمی نسخے میں ٹیگور سے متعلق دو اور مسودے بھی ہیں جو یادوں کی برات میں شامل نہیں ہیں، ایک مسودہ تو وہ ہے جو جوشؔ صاحب نے نسیم درانی کے ادبی جریدے سیپ، کراچی میں اشاعت کے لیے دیا تھا۔ دوسرا وہ جسے ہم ان کے عکسِ تحریر میں شائع کر رہے ہیں یہ وہ مسودہ ہے جس کی، جوشؔ صاحب نے یادوں کی برات کے لیے کتابت بھی کرائی تھی جس کا اندازہ اُن نشانات سے ہوتا ہے جو کاتب کے قلم سے بنے ہوئے ہیں لیکن پھر اُسے خودنوشت میں شامل نہیں کیا۔

موقع نکال سکیں گے۔ میں بڑی خوشی کے ساتھ آمادہ ہوگیا، اور لکھنؤ سے اس کے چلے جانے کے پندرہ بیس روز بعد شانتی نکیتن پہنچ گیا۔

ٹیگور نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ اُن کے ایک محبوب شاگرد تھے، برنی صاحب، مجھے ان کے ساتھ ٹھہرا دیا ___ وہاں کی زندگی بے حد سادہ تھی، گوشت ممنوع تھا، صرف ترکاریاں کھائی جاتی تھیں۔ چارپائیوں کے عوض فرش پر سویا جاتا تھا، صبح کی مشی ہر شخص کے فرائض میں داخل تھی، عمارتیں تھیں، مگر حتی الوسع کھلے میدانوں اور گھنے درختوں کے سائے میں درس دیا جاتا تھا، صبح و شام کی موسیقی وہاں زندگی کا جزو لاینفک تھی۔ موسیقی کے ساتھ ساتھ ناچ بھی ہوا کرتا تھا۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی ___

لڑکیوں اور لڑکوں کے میل جول کے معاملے میں ٹیگور کس قدر فیاض تھے اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز جبکہ وہ حافظ کا دیوان دکھا کر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ دیوان ہمیشہ میرے باپ کے سرہانے رہا کرتا تھا، اور ہر صبح کو وہ اسے گنگنا گنگنا کر پڑھا کرتے تھے کہ اسی اثناء میں ایک بوڑھے مُعلم نے آ کر ایک لڑکی اور لڑکے کے مابین، رسمی حدود سے متجاوز ہو جانے کی رپورٹ کی ___ ٹیگور نے پوچھا "یہ صورت جبر سے پیدا ہوئی کہ تراضی طرفین سے" مُعلم نے کہا "تراضی طرفین سے"، یہ سنا تو انہوں نے کہا "پھر اس میں قباحت کیا ہوئی، قدرت کے دھاروں پر بند باندھنا، انسانی فطرت کے ساتھ ناانصافی ہے، آپ شاید بھول گئے ہیں، لیکن مجھ کو یہ بات ابھی تک یاد ہے کہ میں بھی کبھی جوان تھا" ___

انسانی دماغ کی تمام معجز نمائیوں، السنۂ عالم کی تمام وسعتوں اور حلقہ امکاں کی تمام پہنائیوں کو نگاہ میں رکھنے کے باوجود، میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسی انوکھی اور دوراز دست چیز ہے کہ اس کا ترجمہ قطعی طور پر ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ گھن ہے، اور شاعری آبگینہ، ترجمہ سنداں ہے، اور شاعری سبو، ترجمہ تند ہوا کا تھپیڑا ہے اور شاعری، دریائے تخیل کا حباب، اور میرے اس دعوے کے ثبوت میں طلب فرمالیجئے شاعری کے ان تمام ترجموں کو، جو اس دنیا میں آج تک ہو چکے ہیں، اور مجھ کو یقین ہے کہ جب وہ خانۂ شہادت میں آئیں گے تو میری ہی موافقت میں گواہی دیں گے، اور اس سلسلے میں اگر آپ عمیق نظر سے ان کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ وہ تراجم سونے کی ڈھیریاں نہیں، مٹی کے ڈھیلے اور کانچ کے لالہ و گل نہیں، کاغذ یا پلاسٹک کے پھول ہیں۔

میں یہ مان لینے پر اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ شاعری کے ناقابلِ شمار دھاروں میں سے فقط ایک دھارے کو، کسی حد تک ترجمے کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے، جس کو فکری شاعری کہتے ہیں، یعنی جہاں تک کہ شاعر کے مرکزی پیام اور اُس کے ٹھوس خیالات، فرمودات، نظریات، اور کلیات کا تعلق ہے، اُن کا تقریباً کامیاب ترجمہ ہو سکتا ہے۔

لیکن شاعری کی وہ طلسمی و ناقابلِ فہم فضائے بلند، جہاں الفاظ، لغات سے بغاوت کر کے آزادی حاصل کرتے اور اپنے سروں پر جدید معانی کے عمامے باندھ لیتے ہیں، جہاں لہجوں کی ایک ایک کروٹ سے نو بہ نو مطالب کے صدہا لشکر نکل پڑتے ہیں۔ جہاں دو مختلف النسل لفظوں کے امتزاج سے تازہ بہ تازہ مفاہیم کی ایک نئی نسل

کومعرضِ وجود میں لایا جاتا ہے جہاں طوافِ حرم کو رقص اور رقص کو طوافِ حرم کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، جہاں اکائی کے دائرے میں اعداد کے میلے ہوا کرتے ہیں۔ جہاں دو دو کا مجموعہ چار نہیں بلکہ ایک ہوتا ہے، جہاں نفی کے دوش پر اثبات کا قلم لہرایا جاتا ہے۔ جہاں تلوار سے ڈھال، اور ڈھال سے تلوار کا کام لیا جاتا ہے، جہاں نشتروں کی نوک سے، زخموں میں ٹانکے دیئے جاتے ہیں، جہاں سُبو کے بلوریں دستے سے دروازے پر دستک دی جاتی ہے، جہاں، کانٹے گنگناتے اور کلیاں کراہتیں ہیں۔ جہاں موتیوں سے آنسو، اور آنسوؤں سے موتی برسا کرتے ہیں، جہاں ایوانوں کے کٹاؤ میں کٹاریاں مچلتی ہیں۔ اور اولوں کے مسامات سے چنگاریاں اُڑتی ہیں۔ جہاں، ڈوب جانے کے بعد ناخدا کا منصب ملتا ہے، جہاں درک کرشمے جڑ جاتے ہیں۔ جہاں تانوں کے تیشوں سے مجسمے تراشے جاتے ہیں۔ جہاں نوحوں کی گود میں راگنیاں پلتی اور راگنیوں کی چھاؤں میں نوحے پروان چڑھتے ہیں۔ جہاں پلکوں کی نوک پر آسمان تولے جاتے ہیں، جہاں پاؤں کی لکیروں سے زمین ناپی جاتی ہے۔ جہاں ذہن کے سوپ میں اجرام پھٹکے جاتے ہیں۔ جہاں شعور کی چھلنی میں کائنات چھانی جاتی ہے، جہاں، ذرّوں کے شہروں میں تارے بسائے اور تاروں کی انگنائیوں میں ذرّوں کے خیام نصب کیے جاتے ہیں۔ جہاں اوس میں الاؤ جلتے ہیں۔ الاؤ کی گھومتی گاتی آنچ میں زہرا کی کمر بل کھاتی ہے۔ اور کمر کی لچک سے دو دھاری تلواریں نکل پڑتی ہیں۔ جہاں بوئے گل، گیت بن جاتی، اور گیت مہ جبینوں کا پیکر اختیار کر کے، صحنِ چمن میں بھاؤ بتانے لگتا ہے۔ جہاں صداؤں اور ہواؤں کو دیکھا اور چکھا جاتا ہے، جہاں آوازوں کی لہریں، فولاد کے جگر میں تیرائی جاتی ہیں۔ جہاں تجلّی کے پروں کی دھاریاں، چٹانوں میں شگاف ڈال دیتی ہیں۔ جہاں خود شناس مجذوبیت، اپنے ماتھے پر کلیت کا تاج کج کر کے، پورے کو اپنے جوڑ میں لپیٹ لیتی ہے! جہاں سانولے جھٹپٹے کی کوکھ سے بے شمار سُہانے دھندلکے پیدا ہوتے رہتے ہیں، جہاں نفس کی مضراب سے نظامِ شمسی کو بجایا جاتا ہے۔ جہاں میدانِ جنگ کی گھن گرج توپوں کی آوازیں، آدھی رات کا سناٹا بن جاتیں، اور آدھی رات کا سناٹا، کوٹھے سے گری ہوئی تھالی کی جھنکار میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور جس آفاق بدوش یادگار میں، رقصاں و گریزاں دقیقوں کی ہتھیلیوں پر، کروڑوں اور اربوں صدیاں تھرکتی نظر آتی ہیں ___ وہاں پہنچ کر جب مترجم نگاہ اُٹھاتا ہے، تو اس کی ٹوپی گر جاتی ہے۔ اُس کے الفاظ کی پنڈلیاں کانپنے اور چرچرانے لگتی ہیں۔ اُس کا قلم خشک ہو جاتا ہے۔ معنی و بیان کی ہڈیاں بولنے لگتی ہیں، زبان، منہ سے باہر نکل پڑتی ہے، نبضیں ڈوب جاتی ہیں اور سانس کا ڈورا چٹ سے ٹوٹ جاتا ہے [1]

---

[1] ___ کاش، نوبل پرائز کے اربابِ حل و عقد سے کوئی جا کر یہ کہہ دے کہ اے لکیر کے فقیر قدامت پرستو شاعری کی نزاکت ترجمے نہیں اُٹھا سکتی۔ اگر تم ادب کے واقعی قدر دان ہو تو شاعر کے کلام کو اُسی کی زبان میں پڑھو، اگر تم اُس کی زبان سے ناواقف ہو تو کلام اس کے ہم زبان داعیانِ فن و اقطابِ نقد و نظر کی کمیٹی کے سپرد کر دو، اور اس کی رائے پر عمل کرو۔ تمھیں آخر کوندو سا دماغی مرض ہو گیا ہے کہ تم شاعری کے پیچھے جا گئے جسم کو نا قابلِ اعتنا سمجھتے ہو اور جب ترجمہ اس جسم کو ٹھنڈی لاش میں تبدیل کر دیتا ہے تو اس لاش کو تم کلیجے سے لگا لیتے ہو ___ اے جسم بیزار و لاش نواز لوگو، ادب کی روح تمہاری بے سوادی پر ماتم کر رہی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں بنگالی زبان سے قطعاً بے بہرہ ہوں، میں نے اردو، اور انگریزی میں ٹیگور کا کلام پڑھا ہے، اس صورتِ حال میں یہ حق مجھ کو نہیں پہنچتا کہ میں اُن کے کلام پر نقد و نظر کر سکوں۔

البتہ اُن کے ایوانِ شاعری کے دروازے پر کھڑے ہو کر اور ترجموں کے الفاظ کے پٹ کھول کر، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی شاعری میں بلا کی روانی و قیامت کی مٹھاس اور غضب کی موسیقی بھری ہوئی ہے۔

میں جوانی میں جب ان کے دریائے شاعری میں غوطہ لگاتا تھا۔ تو ایک ایسے جادو کے جزیرے میں پہنچ جاتا تھا۔ جہاں نہریں تھیں، آبشار تھے، سَرو تھے، چنار تھے، ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ سنہری دھوپ تھی۔ جہاں شادابی تھی، شباب تھا، جمال تھا، حال و قال تھا، راگنی تھی، ناچ تھا، جہاں پریوں کی کہانیاں ہوتی اور دیو مالا کی رانیاں تھیں ـــــ

جہاں ایک نیلم کی ترشی ہوئی پک ڈنڈی تھی اور اُس پک ڈنڈی پر، ان کا محبوب، سونے کی رتھ میں بیٹھا ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان سے، زمین کی طرف آ رہا ہے۔ حافظ کی طرح ٹیگور کا بھی احسان مند ہوں اور میری شاعری اُن کی جناب میں کہہ رہی ہے:

خندۂ گُل کی خبر ، تیری زبانی آئی
تیرے باغوں کی ہوا کھا کے ، جوانی آئی

اب رہی ان کی شخصیت، سو ان کی شاعری کی طرح میں ان کی شخصیت کے باب میں پورے وثوق کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔

شخصیت بڑی جان لیوا چیز ہوتی ہے، اور سالہا سال کی مسلسل ہم نشینی کے بعد اس کا شرمیلا پن کم ہوتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اپنے گھونگٹ کے پٹ کھولتی ہے۔ میں بیچارہ تو ان کے ساتھ چھ سات مہینے رہا ہوں، اور پھر اُس عالم میں جب کہ میں ایک بچھڑا تھا۔ اس لئے اُن کی شخصیت کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بلا کے مخلص اور وسیع النظر انسان تھے، اور ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ جس شے نے مجھے اُن سے متاثر کیا تھا وہ اُن کا دمکتا ہوا چہرہ تھا، اور ان کی، دل میں ڈوب جانے والی، تہ در تہ غلافی آنکھیں تھیں ـــــ اُن کی جوانی کا رنگ، روپ، بڑھاپے میں اور نور بن کر اُن کے چہرے پر دوڑ رہا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ وہ لڑکپن اور جوانی میں کس بلا کے حسین ہوں گے، کبھی کبھی میں اُن کے چہرے سے جب ماہ و سال کے غلاف ہٹا دیتا تھا تو اُن سے عشق کرنے کو جی چاہنے لگتا تھا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے مزاج میں لڑکپن تھا۔ بات بات پر وہ قہقہے مارتے۔ اور اکثر بڑی دلچسپ داستانیں بھی سنایا کرتے تھے، اور سناتے وقت تو کبھی کبھی ایکٹنگ سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ وہ بلا کے حسن پرست بھی تھے۔ آنکھوں آنکھوں میں حسین لڑکیوں کے مکھڑوں کی شادابیاں پیا کرتے تھے۔ عاشق مزاج کیوں نہ ہوتے، آخر شاعر تھے نا۔ داغ نے سچ کہا ہے:

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے، وہ دل نہیں ہوتا

بس ایک چیز تھی ان کی سیرت میں جو ہمیشہ میرے دل میں کھٹکا کرتی تھی، اور وہ تھی اُن کی نمود و نمائش کی عادت ___ یوں تو وہ بے حد سادہ، بے حد بے تکلف اور بے حد کھلنڈرے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب کبھی اُن کا سکریٹری آ کر یہ اطلاع دیتا کہ فلاں اخبار کے نمائندے یا ملک کے کسی ڈیپوٹیشن کی ملاقات کے وقت میں اب صرف پندرہ بیس منٹ باقی رہ گئے ہیں تو وہ ایک دم چوکنا ہو کر کھڑے ہو جاتے۔ سکریٹری کو حکم دیتے کہ فلاں فلاں لڑکیوں کو (جو ہمیشہ حسین ہوتی تھیں) مطلع کردو کہ جلد کپڑے پہن کر آ جائیں، اور کمرے میں بخور جلا دیں۔ یہ حکم دے کر وہ غسل خانہ میں داخل ہو جاتے، اور تھوڑی دیر میں وہاں سے آراستہ ہو کر، ایک بڑا سا چوغا پہنے برآمد ہوتے، اور ایک اونچی جگہ بیٹھ کر، پاؤں پر ایک خوبصورت سی چادر ڈال کر لڑکیوں کو اپنے گردو پیش کھڑے ہو جانے کا اشارہ کر دیا کرتے تھے۔

اور اس تمام سُوانگ بھرنے کا مُدعا فقط یہ ہوتا تھا کہ انٹرویو لینے والا مرعوب ہو جائے، اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگے گویا وہ کسی مافوق البشر انسان یا کسی پُراسرار دیوتا کے مندر میں باریاب ہو گیا ہے۔

❁

میرزا محمد ہادی صاحب رسوؔا لکھنوی ☆

یہ غالباً ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کی بات ہے میرے استاد میرزا محمد ہادی صاحب عزیؔز نے، میرزا محمد ہادی صاحب رسوؔا سے، آغائی صاحب کے دولت کدے پر میرا تعارف کرایا اور میرا کلام اُن کو سنوایا تھا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت رسوا نے میری دو تین غزلیں سننے کے بعد میرے استاد سے کہا تھا کہ اس لڑکے کے تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ کے ہات سے نکل جائے گا۔ جس پر میرے استاد نے ارشاد فرمایا تھا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں ____ تو رسوا صاحب نے جواب دیا تھا کہ ہات سے نکل جانے کا مفہوم یہ ہے کہ آگے چل کر یہ

☆ ____ جوش صاحب کی دسویں برسی (۱۹۹۲ء) کے موقعے پر راقم السطور کی کتاب 'جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں' کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ راغب مرادآبادی، خورشید علی خاں، شان الحق حقی، ڈاکٹر یاور عباس اور نصیر ترابی سے جوش صاحب کی جو نادر تحریریں مجھے ملی تھیں وہ اس کتاب کا حصہ ہیں۔ حقی صاحب نے جوش صاحب کی جو ایک نایاب بیاض مجھے دے دی تھی اُس میں میرزا محمد ہادی صاحب رسوا لکھنوی پر جوش صاحب کا لکھا ہوا یہ تذکرہ بھی شامل تھا۔ کتاب شائع ہونے کے بعد اس مضمون کو دیکھ کر راغب صاحب نے مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ جوش صاحب نے اُن سے اس بیاض کے کھو جانے کا ایک دو بار ذکر کیا تھا۔ وہ اس مضمون کو نظر ثانی کے بعد یادوں کی برات میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ جوش صاحب کی ادبی زندگی میں رسوا لکھنوی کی ادب پروری کی، اپنی ایک اہمیت تھی۔ جس کا ذکر خود جوش صاحب نے یادوں کی برات میں ان لفظوں میں ہے

> ''میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ [عثمانیہ یونیورسٹی، دکن] کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا، اور، خصوصیت کے ساتھ، علامہ عمادی، علامہ [نظم] طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا کے فیضانِ صحبت نے، مجھ بے سواد آدمی کو، میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوقِ مطالعہ پر مامور کر دیا، اور، صحتِ الفاظ و نجابتِ لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے، میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی، میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔ میرزا محمد ہادی صاحب، میرے پڑوسی تھے۔ میں دکن آ کر، پھر اُن سے پڑھنے لگا۔ اور اس بار فارسی کے ساتھ، اُن سے انگریزی ادب اور فلسفے کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا'' (ص، ۲۳۶، ۲۳۷)

غزل گوئی ترک کردے گا ____ چنانچہ رسوا صاحب کی پیشین گوئی صحیح نکلی اور سن شعور کو پہنچ کر میں نے غزل گوئی ترک کردی اس زمانے میں حضرت رسوا کا چہرہ بڑھاپے کی طرف مُڑنے ہی والا تھا، لیکن اُن کی آنکھوں کی ذہانت کی وہ چمک اور اُن کے لہجے میں ظرافت کا ایسا کھٹکا تھا کہ میرا دل اُن کی طرف کھنچنے لگا۔

تھوڑے زمانے کے بعد اس قلبی کشش نے مجھے اُن کے قریب کردیا اور میں اُن سے فارسی وعربی پڑھنے لگا۔

رسوا صاحب کے پڑھانے کا انداز نرالا تھا، پڑھاتے وقت، وہ ایسے مزے کے ساتھ مطالب بیان کرتے تھے کہ کتاب کا ایک ایک حرف دل میں اُتر جاتا تھا اس زمانے میں وہ ریڈ کرچین کالج لکھنؤ میں غالباً فلسفے کے پروفیسر تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کالج کا کوئی پروفیسر رخصت پر جاتا تھا، اس کے فرائض ان کے سپرد کردیے جاتے تھے، جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی نگاہ تمام علوم پر حاوی تھی ____ منطق، فلسفہ، فقہ، ہیئت، نفسیات، ادب اور سائنس، زبانوں میں فارسی، عربی اور انگریزی، کون سا علم تھا جس پر ان کو دست گاہ حاصل نہیں تھی۔ آخری عمر میں ان کو موسیقی کا شوق ہوگیا تھا، اور موسیقی کو ضبطِ تحریر میں لانے کے انہوں نے علامات بھی ایجاد کیے تھے۔ جو غالباً ہزار دو ہزار کارڈوں پر مشتمل تھے افسوس کہ ان کے انتقال کے بعد وہ تمام کارڈ تلف ہوگئے۔

میرزا صاحب عالم ہونے کے ساتھ رند بھی تھے۔ شاہد وشراب اُن کی محبوب اور روزمرہ زندگی کا مشغلہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ ارباب لکھنؤ تک ان کی شاہد پرستی اور بادہ خواری کی خبر نہ جانے پائے اس لیے جب کوئی میرزا صاحب سے اُن کے مکان کا پتہ پوچھتا تھا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ حضرت میرا مکان اس قدر پیچ در پیچ گلیوں میں ہے کہ آپ کو مل ہی نہیں سکتا، کسی روز میں ضرور حاضر ہوکر اپنا مکان آپ کو دکھاؤں گا ____ ہرچند وہ میرے استاد تھے لیکن رعب دکھانے والے استاد نہیں تھے، وہ مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی جوانی کے رنگین واقعات کی داستانیں بیان کیا کرتے تھے۔

میں نے ایک روز جب امراؤ جان ادا کے باب میں دریافت کیا تھا تو میرزا صاحب نے بڑے تاسف کے ساتھ یہ فرمایا تھا کہ وہ ایک غریب لیکن شریف گھرانے کی لڑکی تھی جس کو نامساعد حالات نے کوٹھے پر لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کی داستان بڑی دلچسپ بھی ہے اور بڑی دردناک بھی۔

ایک روز عالم سرخوشی میں انہوں نے ایک فرانسیسی لڑکی سے اپنے معاشقے کا حال بیان کیا تھا، اور یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ بھی ان پر مرمٹی تھی، لیکن اس کے باپ کی موت نے اسے مجھ سے جدا کرکے میرے سر پر پہاڑ توڑ دیا تھا، جب وہ فرانس جانے لگی تو اس نے اپنی کوٹھی جو غالباً لوہے کے پل کے سامنے واقع تھی، میرے سپرد کردی تھی، اور میں اس کوٹھی میں منتقل ہوگیا اور ہر شام کو ایک مولسری کے درخت کے نیچے بیٹھ کر پیتا اور اس کی یاد میں آنسو بہایا کرتا تھا ____ اس سلسلے میں انہوں نے ایک عجیب وغریب واقعہ بھی بیان کیا تھا ____ میں ایک روز سرِ شام مولسری کے نیچے پی پی کر رو رہا تھا کہ ایک سواری آکر عین میرے سامنے رک گئی۔ اس سواری سے ایک

نہایت پری جمال وکم سن عورت نکلی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی اور چھوٹتے ہی کہنے لگی میرزا صاحب کسی جا کر نہ آنے والے کے انتظار میں اس طرح عمر برباد نہ کرنا چاہیے آپ کیوں زندگی برباد کر رہے ہیں۔ اس کی یہ بات سن کر میں ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ ابھی میں کچھ بول بھی نہیں سکا تھا کہ اس پری جمال نے بڑی شوخی کے ساتھ مجھ سے کہا، میرزا صاحب میری سواری کا کرایہ تو دے دیجئے، میں حیران ہو کر اُٹھا اور اندر جا کر کرایہ لے کر آؤں۔ میرے اُٹھتے ہی اس نے کہا، دیکھیے، آپ کے جس پیلے بکس میں چھ سو روپے رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں سے میری سواری کا کرایہ نہ نکالئے گا۔ یہ سنتے ہی اس کے حسن و جمال نے جو کچھ میرے دل میں پیدا کر دیا تھا، اس پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، آپ کون ہیں، اس نے قہقہہ مار کر کہا، آپ کرایہ دینا نہیں چاہتے، یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، ایک طرارہ بھر کر اپنی سواری میں بیٹھ گئی۔ کوچ بان نے تڑ سے گھوڑے کی پشت پر کوڑا مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سواری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں پسینے میں نہا گیا۔ موسری کے نیچے سے اُٹھا۔ کمرے میں گیا، اندر سے چٹخنی لگائی اور منہ ڈھانک کر لیٹ گیا۔ لہو بہت دیر تک کانپتا رہا اور آج تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا کہ وہ عورت کون تھی اور اس کو مرے پیلے بکس اور اس میں رکھے ہوئے روپے کی پوری تعداد کیوں کر معلوم ہو گئی تھی۔

ایک روز میں اُن کے گول گنج والے مکان میں گیا۔ اوپر جا کر دیکھا کہ وہ فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے گرد کتابوں کا ایک انبار ہے اور وہ اس قدر اونچا ہے کہ صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ استاد یہ کتابیں کیسی ہیں جو آپ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ احادیث و تفاسیر کی کتابیں ہیں......

لکھنؤ میں ایک سیاہ فام، بے ٹھنڈی کے شاعر تھے کلیم، جن کو اہلِ لکھنؤ کجری بن کا ہاتھ کہا کرتے تھے۔ کلیم صاحب نہایت بد دماغ اور لڑاکو آدمی تھے۔ ذرا ذرسی بات پر آستینیں چڑھا لیا کرتے تھے۔ جب ''کلام کلیم'' کے نام سے ان کا دیوان شائع ہوا تو میرزا صاحب نے کسی کو بھیج کر ان کے دس بارہ دیوان خرید لیے۔ محلے کے ایک کبڑیے کو بلایا۔ کلامِ کلیم کو پھاڑ کر اس کے حوالے کیا۔ اور تمام باتیں سمجھا کر اس کو حکم دیا کہ سہ پہر کو چوک جانا اور حیدر حسین خاں کے پھاٹک کے نیچے، میں نے جس طرح بتایا ہے، اسی طرح نعرے لگانا شروع کر دینا۔

میرزا صاحب، میں، اور دس پندرہ دیگر واقفانِ راز وقتِ مقررہ سے کچھ پیش تر ہی خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کی دکان میں جو حیدر حسین خان صاحب کے پھاٹک کے تقریباً سامنے تھی جا کر بیٹھ رہے۔

کلیم صاحب چوک ہی کی گلی میں رہتے، اور بڑی پابندی کے ساتھ، ٹھیک چار بجے حیدر حسین خاں کے پھاٹک سے نکل کر چوک میں اِدھر اُدھر ٹہلتے اور نگارانِ سرِ بام پر نگاہیں دوڑایا کرتے تھے ____ جب گھڑی نے بتایا چار بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے ہیں تو ہم سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت نے کہا آج تو میرزا صاحب آپ لوگ ایسے نظر آ رہے گویا کسی جلوس کا انتظار ہو رہا ہے۔ میری ہنسی نکل گئی۔ میرزا صاحب نے آنکھ مار کر مجھے روک دیا ____ لیجئے چار بج گئے ____ سیاہ فام کلیم صاحب، حیدر حسین خاں کے

پھاٹک پر نظر آئے۔ کبڑیے نے انہیں دیکھتے ہی نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ گوبھی ۶ پیسے سیر، آلو ۸ پیسے سیر، کلام کلیم ۲ پیسے سیر، کلیم صاحب نے گھبرا کر دیکھا۔ اور کہا ابے کیا بک رہا ہے؟ کبڑیے نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ گویا کلیم صاحب کے وجود کی خبر ہی نہیں تھی۔ اور دوبارہ نعرہ لگایا۔ گوبھی ۶ پیسے سیر، آلو ۸ پیسے سیر، کلام کلیم ۲ پیسے سیر، کبڑیا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ اب کلیم صاحب کیا کرتے، چیخ چیخ کر کہنے لگے یہ اس دو کوڑی کے کبڑیے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کن مردودوں کی حرکت ہے۔ ایک ایک سے سمجھ لوں گا سالے ہمارے لکھنؤ کی تہذیب کو بدنام کرنے والے مجھ سے بچ کر کہاں جائیں گے۔

ایک مرتبہ حیدرآباد سے رخصت لے کر وہ لکھنؤ گئے۔ وہاں سے آئے تو کپڑے بدلے بغیر دفتر چلے گئے۔ میں نے کہا میرزا صاحب میلے کپڑے پہنے چلے آئے۔ آپ دفتر میں، انہوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا:

اب تک رختِ سفر نہ بدلا

دامن پہ غبارِ لکھنؤ ہے

میرزا صاحب کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اگر اتنے بہت سے علوم کی جانب راغب نہ ہو کر وہ صرف کسی ایک علم کو اپنا لیتے تو میرا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کے عظیم انسانوں میں سے ایک ہوتے اور تاریخ اُن کے ماتھے پر شہرتِ دوام کا تاج رکھ دیتی۔ افسوس کہ انہوں نے اپنے قوائے ذہنی کو اس قدر علوم کے میدان میں پھیلا دیا کہ وہ جس مرتبے کے مستحق تھے وہ اُن کو حاصل نہ ہو سکا۔ میرا ایک بہت پرانا مطلع اُن پر صادق آتا ہے:

اے جوشؔ فراقِ جاناں میں، فریاد و فغاں سے کام نہ لے

گھٹ جائے گا اس سے دل کا اثر اجزائے تپش تقسیم نہ کر

اب آخر میں میرزا صاحب کے دو چار شعر سنا کر اس گھبراہٹ کے لکھے ہوئے سرسری مضمون کو ختم کرتا ہوں:

کل اُن کو آتے آتے جو کچھ دیر ہو گئی

دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

دل میں چھپی تھی گو کہ بہت خواہش گناہ

......☆

میری تباہیوں کی تمہیں اب خبر ہوئی

کیا پوچھتے ہو ☆۱

لکھنؤ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا، طرح تھی:

کوئی پُرساں ہی نہیں ہے عاشقِ دلگیر کا

☆___ ، ☆۱___ یہ مصرعے واضح نہیں ہیں۔

میرزا صاحب کا طرح میں ایک شعر سنئے اور دیکھئے کہ مصرع ثانی پر کس ذہنی نظر سے مصرعۂ اوّل لگایا ہے، فرماتے ہیں:

وضع کے پابند ہم اور عاشقی جدت پسند
پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

آپ نے ملاحظہ فرمایا "وضع کی پابندی اور جدت پسندی میں کیسا اثر پیدا کردیا ہے، ایک "معیار" کے مشاعرے میں میرزا غالب کی طرح دی گئی تھی۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ذرا ہمارے میرزا صاحب کا بھی اس طرح میں شعر سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

وہ جو کچھ باتیں کہ ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سُنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

اب نہ وہ مرزا صاحب ہیں، نہ وہ لکھنؤ ہے، نہ وہ لوگ۔ رہے نام اللہ کا۔

اشاریہ☆

(افراد و اشخاص)

(الف مقصورہ)

☆ ___ تحقیق و تدوین کتب میں اشاریہ سازی کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن یہ شاید عجلت و سہل پسندی ہی کا نتیجہ ہے کہ اب اردو زبان و ادب کے اہم موضوعات پر بھی جو کتب شائع ہو رہی ہیں اُن میں اس پر توجہ نہیں کی جاتی ___ اشاریہ سازی کے یقیناً اپنے کچھ اصول و ضوابط ہیں جن میں اب مغرب کی تحقیقی روایات کو مقدم رکھا جاتا ہے لیکن پیشِ نظر کتاب میں اردو کی روایتی اشاریہ سازی کے معیار اور طریقوں ہی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

(س)

(ترتیب و تدوین اشاریہ، بشکریہ تعاون، ڈاکٹر مہر النساء عزیز)

جوش ملیح آبادی سے مخصوص علمی وادبی جریدہ

جوش شناسی

ساتواں شمارہ

یادوں کی برات نمبر

❁❁

❁❁

رابطہ

الفاظ فاؤنڈیشن کراچی

021-34430588 - 0346-2731947

عکسِ تحریر جوش ملیح آبادی

(۱۹۷۸ء)

میاں ہلال نقوی

9/1092 - دستگیر کالونی

فیڈرل بی ایریا

کراچی (۳۸)

ایک یادگار تصویر

(۱۹۷۰ء)

جوش ملیح آبادی اور ہلال نقوی